۸۳

رجسٹر شدہ ٹپہ سرکار عالی نمبر ۴۷
شہریور ۱۳۳۹ ف م جولائی ۱۹۳۰ء

جلد (۵) شمارہ (۱)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

دائرہ ادارت:-

سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسئول
سید فخر الحسن ملا بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) مدیر
محمد عبدالغفور صدیقی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) شریک مدیر

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتمی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو پیدا کرنا۔

(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اصول

(۱) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسۂ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائج)

صرف اردو حصہ (عہ) فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲ار) صرف اردو (۸ر)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔

(س) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہیے۔

(ص) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـــہ	صہ ۸ر	ـــے
نصف صفحہ	صہ	عال ۱۲ار	عـــہ۸ر
ربع صفحہ	عال ۸ر	عہ ۶ر	۱۵ار
فی سطر	۱۰ر	۸ر	۶ر

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ شہریور ۱۳۳۹ف م جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

فہرست مضامین

مولوی عبدالسلام صاحب مرحوم

ہمیں یہ معلوم کر کے جان کاہ صدمہ ہوا کہ ــــــ مولوی عبدالسّلام صاحب ذہنی فاضل، ناظر تعلیمات ضلع بیدر نے چند روز ہیضہ میں مبتلا رہکر بتاریخ ۲۴ مہر ۱۳۳۹ف انتقال فرمایا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم سررشتہ تعلیمات کے ایک سرگرم ملازم تھے، ابتدا ہی سے آپ کو تعلیم و تعلّم سے خاص شغف رہا اور پبلک کے کاموں میں ہمیشہ غیر معمولی دلچسپی لی۔ اپنے نظارت گلبرگہ شریف کے زمانہ میں مرحوم کئی سال تک انجمن اساتذہ صوبہ گلبرگہ کی معتمدی کے فرائض انتہائی دلچسپی و انہماک سے انجام دیتے رہے۔ انجمن اساتذہ بلدہ کے بھی آپ سرگرم رُکن تھے اور انجمن کے سالانہ جلسوں میں دلآویز تقاریر اور مفید تنقیدوں سے اراکین کو مستفید اور محظوظ فرماتے رہے۔ اور ہمیشہ رسالۂ ہذا کی قلمی امداد فرماتے رہے۔

مولوی مرتضےٰ صاحب کے انتقال کے بعد مرحوم کا وجود مغتنمات سے تھا۔ کاش کہ ملک و مالک کی خدمت کے لئے مرحوم اور جیتے۔ اس ناقابل تلافی صدمہ پر ہم مرحوم کے پسماندگان بالخصوص اُن کے ضعیف والد سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور دست بدعا ہیں کہ خداوند کریم ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ حیدرآباد دکن

کی چوتھی کانفرنس منعقدہ پنجشنبہ و جمعہ ۲۸ و ۲۹ امرداد ۱۳۳۹ف

کی روئیداد

الحمد اللہ کہ انجمن کی چوتھی سالانہ کانفرنس حسب پروگرام شائع شدہ سٹی کالج کے ہال میں منعقد ہوئی۔

پہلا اجلاس

صدر کانفرنس عالیجناب نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد سرکار عالی نے پہلے نمائش تعلیمی کا افتتاح فرمایا۔ اشیاء نمائش جناب مولوی نظیر حسین شریف صاحب معتمد نمائش کمیٹی و مسٹر وسیر صاحب و عبدالمجید خاں صاحب و دیگر حضرات کی سلیقہ شعاری سے دو کمروں میں عمدگی سے سجائی گئی تھیں۔ عالی جناب صدر نشین صاحب کانفرنس بمعیت جناب ناظم صاحب تعلیمات و دیگر معزز حضرات اشیاء نمائش کا ملاحظہ فرمانے کے بعد کانفرنس ہال میں تشریف فرما ہوئے۔

قرأت اور یہ آرکھتا کے بعد جناب مولوی سید ظہور علی صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ دار العلوم و صدر استقبالیہ کمیٹی نے انگریزی میں اپنا نہایت دلچسپ و معنی خیز خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ ازاں بعد کمترین نے بحیثیت معتمد عمومی گذشتہ سال تمام کی رپورٹ پڑھی اور اس کے بعد عالی جناب صدر نشین صاحب کانفرنس نے جناب کے۔ جی شاستری صاحب بی۔ اے۔ یل۔ ٹی۔ صدر مدرس مدرسہ مفید الانام و جناب مولوی احمد الدین صاحب یم۔ اے۔ بی ٹی یل یل۔ بی۔ صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ کاچی گوڑہ کے بے وقت انتقال پر اظہار افسوس کی تحریک پیش کی اور حاضرین نے خاموش کھڑے ہو کر اس کو منظور کیا۔ اس تحریک کی منظوری کے بعد جب سب حاضرین اپنی اپنی جگہ پر متمکن ہو گئے تو عالی جناب صدر کانفرنس نے اپنا پُر مغز خطبہ صدارت اردو میں پڑھا۔ خطبہ صدارت کے بعد جناب ڈاکٹر محمد عبد اللطیف سعید صاحب یم۔ بی۔

سی۔ ایچ۔ پی۔ (اڈنبرا) نے انگریزی میں "شخصی حفظان صحت" پر ایک عمدہ اور سبق آموز تقریر فرمائی جس میں وقتاً فوقتاً اظہار پسندیدگی کے لئے حاضرین نے خوب زور زور سے تالیاں بجائیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے بعد جناب ہیوزڈن صاحب مدرس گرامر اسکول نے بطور تمہید انگریزی میں فوایدِ سائنس پر مختصر سی تقریر کرنے کے بعد حسب ذیل تحریک پیش کی:۔

"کانفرنس ہذا سفارش کرتی ہے کہ سائنس کو بشمول حفظان صحت طبقۂ وسطانیہ کی تعلیم کے لئے لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ اور ہر مدرسہ وسطانیہ میں ایک مستند سائنس ٹیچر کے تقرر کے علاوہ ایک مکمل معمل مہیا کرنے کا فوری انتظام فرمایا جائے۔"

اس تحریک کی تائید جناب مولوی سردار خاں صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی مددگار مدرسہ فوقانیہ دار العلوم نے اردو میں فرمائی۔ اس کے بعد ہماری انجمن کے پرجوش رکن جناب مولوی عبد السلام صاحب ناظر مدارس ضلع بیدر شریف کھڑے ہوئے اور انہوں نے تحریک میں الفاظ "لازمی مضمون قرار دیا جائے" کے عوض "کسی دوسرے مضمون کے بجائے لازمی قرار دیا جائے" رکھنے کی ترمیم پیش فرمائی۔ مگر اس ترمیم کی کسی نے تائید نہ کی۔ اس لئے ترمیم نامنظور ہوئی۔

اس کے بعد مولوی شیخ ابو الحسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی مہتمم تعلیمات ضلع نلگنڈہ نے فرمایا کہ باوجود آلات سائنس و معلم سائنس کی فراہمی کے سائنس سیکھنے والے طلباء کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ طبقۂ وسطانیہ میں سائنس لازمی نہیں ہے۔ مزید براں عوام کو بھی دلچسپی نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ عوام الناس کو سائنس کے فوائد سے بذریعہ اشاعت کنندگان آگاہ کیا جائے۔ ورنہ سائنس کی تعلیم سے بھی جو فائدہ متصور ہے وہ حاصل نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کی تقریر کے بعد اصل تحریک بجنسہٖ بلا کسی اختلاف کے منظور ہو گئی۔

اجلاس دوم

اس اجلاس میں سب سے پہلے تعلیم جغرافیہ کے متعلق سب کمیٹی کی رپورٹ انگریزی میں جناب ریورنڈ۔ ایف۔ سی فلپ صاحب۔ ایم۔ اے۔ وارڈن گرامر اسکول و نائب میر مجلس انجمن ہذا نے پڑھی جو بلا کسی رد و قدح کے منظور کی گئی۔ رپورٹ مذکور کا

خلاصہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں پہلے سے تقسیم کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد میم ہنمنت راؤ صاحب ایم۔ اے۔ پروفیسر تاریخ نظام کالج نے جو سب کمیٹی متعلقہ تعلیم تاریخ کے صدر تھے کمیٹی مذکور کی رپورٹ انگریزی میں پڑھی۔ اس رپورٹ کا خلاصہ بھی دونوں زبانوں میں قبل از وقت حاضرین میں تقسیم ہو چکا تھا۔ بالآخر یہ رپورٹ بھی بلا کسی اختلاف کے منظور کی گئی۔

دونوں رپورٹوں کے ختم ہونے پر جناب مولوی سید فخرالحسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی نے حسب ذیل تحریک پیش کی:۔

"کانفرنس ہذا سفارش کرتی ہے کہ السنہ مشرقیہ کی تعلیم کو بہتر اور مفید بنانے کے لئے علوم مشرقیہ کے اسناد رکھنے والے ان مدرسین کی تعلیم کے لئے جو اس وقت سررشتہ میں ملازم ہیں۔ عثمانیہ ٹریننگ کالج میں تعلیم کا انتظام فرمایا جائے۔"

اس تحریک پیش کرنے سے پہلے بطور تمہید سید صاحب موصوف نے عام طور پر علوم مشرقیہ کے اسناد رکھنے والے مدرسین کی نسبت لوگوں کے جو خیالات ہیں ظاہر فرمایا جو علوم مشرقیہ کے مدرسین کے ناگوار خاطر ہوا۔ چنانچہ جب جناب مولوی عبدالمجید صاحب مددگار دارالعلوم اس تحریک کی تائید فرما چکے تو جناب مولوی حسام الدین صاحب فاضل نے اپنے خاص طرز میں محرک صاحب کی تقریر پر اعتراض کیا اور یہ بتایا کہ علوم مشرقیہ کے اسناد رکھنے والے حضرات اکثر و بیشتر ان عیوب سے بری ہیں جو بعض حضرات ان سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کے بعد جناب صدر نشین صاحب کانفرنس کی ہدایت کے مطابق مولوی سید فخرالحسن صاحب جواب دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور کہا مجھے افسوس ہے کہ مولوی صاحبان کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں نے بڑی کد و کاوش سے یہ تحریک یہاں تک پہونچائی ہے اور باوجودیکہ میں معترض نہیں ہوں میں نے اس کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کی۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ علوم مشرقیہ والے مدرسین کو فائدہ پہونچے۔ اگر آپ حضرات کو میرے الفاظ سے رنج پہونچا ہے تو میں بڑی خوشی سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔"

اس کے بعد اصل تحریک منظور ہو گئی اور دوسرا اجلاس ختم ہو گیا۔

اجلاس سوم

اس اجلاس کی کارروائی حسب پروگرام دوسرے روز سوا نو بجے شروع ہوئی۔ اس اجلاس میں حاضرین کی تعداد قریباً دوسرے اجلاس کے مساوی تھی۔ سب سے پہلے جناب وی۔ ڈی ہارڈیکر صاحب صدر مدرس دیویک وردھنی پاٹھ شالا نے انگریزی میں ناقص القویٰ اطفال کی ضرورت کا اظہار کیا اور مختصراً اس کے طریقہ کا ذکر کرتے ہوئے حسب ذیل تحریک پیش کی :-

"اس کانفرنس کی رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ ناقص القویٰ اطفال کی تعلیم کے لئے مستقرِ بلدہ میں ایک مدرسہ معہ دارالاقامہ قائم کیا جائے۔" اس تحریک کی تائید اردو میں جناب مولوی غلام دستگیر صاحب بی۔ اے مددگار مدرسہ وسطانیہ چنچلگوڑہ نے فرمائی اور مختلف ممالک کے اعداد شمار اور ان ناقص القویٰ کی تعلیم کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ اور کس نے کی اور دوسرے جن ممالک نے یکے بعد دیگرے اس تعلیم کو اپنے ہاں رائج کیا ان کا اور ان افراد کا جنہوں نے اس کام میں اپنے اپنے ملکوں میں خاص طور سے دلچسپی لی۔ شرح و بسط کے ساتھ تذکرہ فرمایا۔ چنانچہ تحریک بالاتفاق آرا منظور ہوگئی۔ اور اس کے بعد جناب مولوی فخرالحسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ چنچلگوڑہ نے اردو میں ایک پُرمغز اور سبق آموز تقریر "مدرسہ کی جماعت میں حکومت خود اختیاری" کے عنوان پر پڑھی جو نہایت دلچسپی سے سنی گئی یہ تقریر مقرر صاحب کے ذاتی تجربوں پر مبنی تھی۔ اس تقریر کے بعد جناب مولوی سید ظہور علی صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم نے انگریزی میں ایک جامع تقریر کے بعد جس میں بذریعہ اعداد و شمار تعلیم بالغان کی ضرورت کو ثابت کیا۔ حسب ذیل تحریک پیش کی :-

"ملک سرکار عالی میں ناخواندہ اشخاص کی کثیر تعداد کے لحاظ سے کانفرنس ہذا تحریک کرتی ہے کہ مستقر بلدہ اور اضلاع میں بھی تعلیم بالغان کی ترویج و توسیع کے لئے پر زور تدابیر اختیار کی جائیں۔" اس کی تائید جناب مولوی سید معین الدین صاحب قریشی ایم۔ اے صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ آصفیہ امدادی سرکار عالی موقوعہ ملک پیٹ نے کی۔

جب یہ تحریک بالاتفاق آرا منظور ہوگئی تو جناب ریورنڈ ایل سنن صاحب پرنسپل ویسلین مشن ہائی اسکول سکندرآباد نے بحیثیت صدر مجلس سب کمیٹی متعلقہ تعلیم علمی ریاضی اپنی کمیٹی کی رپورٹ پڑھی جس کا خلاصہ اردو انگریزی دونوں زبانوں میں پہلے سے حاضرین میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ بالاتفاق رپورٹ مذکور قبول کرلی گئی۔

اس کے بعد جناب مولوی باقر محی الدین صاحب لکچرار تجارت سٹی کالج نے انگریزی میں تعلیم تجارت کی ضرورت پر تحریک پیش کی دوران تقریر میں صاحب موصوف نے سیاسیات قومی میں تجارت کی اہمیت ظاہر کرنے کی غرض سے لارڈ راتھ میر کی ایک حالیہ تقریر کا اقتباس پڑھنا شروع کیا جناب ناظم صاحب تعلیمات نے مقرر صاحب کو توجہ دلائی کہ یہ اقتباس سیاسی امور سے متعلق ہے۔ اپنی تقریر کے ختم پر مولوی باقر محی الدین صاحب نے حسب ذیل تحریک پیش کی:۔

"یہ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ تعلیم تجارت (کامرس) کو امتحان ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کی طرح عثمانیہ میٹرک کے امتحان میں بھی بطور اختیاری مضمون شریک فرمایا جائے"

اس تحریک کی تائید اردو میں ایک مختصر سی تقریر کے ساتھ جناب مولوی سید غلام محمود صاحب نے فرمائی۔

چوتھا اجلاس

چوتھا اجلاس بعد دوپہر ٹھیک ڈھائی بجے حسب پروگرام شروع ہوا۔ حاضرین کی تعداد دوسرے اور تیسرے اجلاس کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی۔ اس اجلاس میں سب سے پہلے مولوی سید مجتبیٰ حسین صاحب نقوی بی۔اے بی۔ٹی۔ صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ نامپلی نے حسب ذیل تحریک پیش کی:۔

"جملہ مدارس میں پیشوں کی تعلیم جاری کرنے کے خیال سے یہ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ تاوقتیکہ پیشوں کی تعلیم دینے والے مدرسین کی تعلیم کا انتظام اندرون ممالک محروسہ نہ ہو۔ ان مدرسین کے لئے جو اس مضمون سے خاص دلچسپی رکھتے ہوں برٹش انڈیا میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظائف کی کافی تعداد منظور فرمائی جائے"۔ صاحب موصوف نے اس تحریک کے پیش کرنے سے پہلے انگریزی میں ایک بسیط تقریر فرمائی جس کی تائید مولوی نظیر حسین شریف صاحب ناظم مدارس بلدہ نے کی۔

• حسب پروگرام عالی جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔اے کنٹب۔ میر مجلس انجمن نے سابقہ کانفرنسوں کی منظورہ تحریکات پر جو کارروائی ہوئی۔ اس کو بغرض تصدیق پیش کیا۔ تحریک کے متعلق جو کارروائی ہوئی ہے اس کا تذکرہ بالتفصیل اردو و انگریزی دونوں زبانوں میں ساتھ فرمایا۔ اس کے بعد جناب میر مجلس صاحب انجمن نے اعلان کیا کہ آئندہ کانفرنس میں رپورٹ پیش کرنے کے لئے تعلیم سائنس اخلاقی تربیت اور ڈرائنگ کے لئے تین سب کمیٹیاں مقرر کرنے کا تصفیہ مرکزی انتظامی کمیٹی نے کیا ہے۔ کانفرنس نے اس کی توثیق کرتے ہوئے کمیٹیوں کے اراکین کا انتخاب کرنے کا مرکزی انتظامی

کمیٹی کو مجاز گردانا

حسب پروگرام جناب ڈبلیو ٹرنر صاحب ایم ۔ اے پرنسپل نظام کالج نے انگریزی میں تعلیم اور شہریت پر ایک عمدہ اور سبق آموز تقریر فرمائی ۔ تقریر مذکور کے اختتام پر جناب صدر نشین صاحب نے انعامات نمائش تقسیم فرمائے جس کے بعد عالی جناب نواب اکبر یار جنگ بہادر صدر نشین کانفرنس نے اپنی آخری تقریر میں مذہبی نقطۂ نظر سے تعلیم کا مقصد بیان فرمانے کے بعد ڈاکٹر لطیف سعید صاحب اور سید فخر الحسن صاحب اور ٹرنر صاحب کی تقریروں کی تعریف فرمائی اور تحریکات کے متعلق فرمایا کہ ان میں سے اکثر امور سرکار عالی کے زیر غور ہیں ۔

اس کے بعد جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم ۔ اے (کینٹب) میر مجلس انجمن نے عالی جناب صدر نشین صاحب اور دیگر معزز مہمانوں کے علاوہ جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم ۔ اے ۔ پرنسپل سٹی کالج اور دوسرے حضرات کا جنہوں نے کانفرنس کو کامیاب بنانے میں خاص دلچسپی کا اظہار فرمایا ۔ نام بنام شکریہ ادا کیا ۔

اس کے بعد شام تک لوگ نمائش دیکھتے رہے ۔ قبل برخاست عالی جناب ناظم صاحب تعلیمات کی طرف سے عالی جناب صدر نشین صاحب نے دوسرے دن کی تعطیل کا اعلان فرمایا تاکہ مدارس کے طلبہ نمائش دیکھ سکیں ۔ چنانچہ دوسرے روز سارا دن طلباء مدارس نمائش دیکھتے رہے ۔
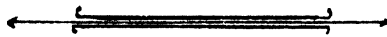
انجمن اساتذہ حیدرآباد کی

چوتھی سالانہ کانفرنس کا استقبالیہ خطبہ

از جناب مولوی سید ظہور علی صاحب بی۔اے۔بی ٹی صدر مدرسہ دارالعلوم و صدر استقبالیہ کمیٹی

جناب صدر و معزز خواتین و مکرم حاضرین۔

انجمن اساتذہ حیدرآباد نے مجھے مجلس استقبالیہ کا صدر منتخب کرکے میری نمایاں عزت افزائی کی ہے۔ بدیں حیثیت یہ میرا خوش آیند فریضہ ہے کہ انجمن اساتذہ کی طرف سے عالی جناب نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد محکمۂ تعلیمات و امور عامہ کی ذات ستودہ صفات اور معزز مہمانوں اور محترم اساتذہ کی خدمت میں اس چوتھی سالانہ کانفرنس کی تقریب پر ہدیۂ خوش آمدید پیش کروں۔

پچھلی تین کانفرنسوں کے مواقع پر نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر اور جناب خان فضل محمد خاں صاحب جیسی ممتاز ہستیوں نے جو کہ حیدرآباد کے طبقۂ عہدہ داراں میں قابل فخر و مباہات ہیں کرسئی صدارت کو مزین کیا ہے۔ اور اس روایت کو قایم و برقرار رکھتے ہوئے اس وقت ہم میں علم قانون کے زبردست ماہر و سابق رکن عدالت العالیہ اور معتمد عدالت جیسی ہستی رونق افروز ہے منجملہ ان اوصاف کے موصوف کے ہاتھ میں تعلیم کا قلمدان بھی ہے ہم اراکین انجمن اساتذہ نہ صرف ایک بلکہ متعدد وجوہ کی بنا پر خاص طور سے خوش قسمت ہیں کہ اس سال نواب اکبر یار جنگ بہادر جیسی ذی مرتبت و ذی اقتدار ہستی ہماری صدر ہے۔ سب سے پہلے ہماری ادبی ضیافت ایک عالمانہ دانش آموز خطبے کی صورت میں کی جائے گی اور پھر ہم ایک ایسے قابل ماہر قانون کے خیالات سے مستفید ہوں گے جو کہ کامل علمیت پختہ تجربہ عملی قابلیت و لیاقت اور مسلمہ فراست کا مالک ہے۔ آخر میں ہم کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ وہ تمام تحریکات جو اس سال ہم منظور کرنے والے ہیں اور نیز سال گزشتہ کی وہ قراردادیں جو توثیق کے لئے پیش ہو چکی ہیں۔ یہ سب کی سب جناب صدر کے وجود باجود کی بدولت ہر ضروری و دفتری توجہ سے متمتع ہوتی رہینگی۔ اگرچہ انجمن اساتذہ حیدرآباد جس کے

طفیل میں اس وقت ہم ایک دوسرے سے ملے ہیں ابھی اپنے عہد طفولیت کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ لیکن خاموشی اور استقلال کے ساتھ گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں نتیجہ خیز اور مفید کام انجام دئے ہیں جو لائق تحسین ہیں۔ آپ مجھ سے یقیناً سوال کریں گے کہ جب اس انجمن کو وجود میں آئے ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں تو آج ہم چوتھی سالانہ کانفرنس کا جشن کیوں منا رہے ہیں جواباً میں یہ عرض کروں گا کہ ایک سال وبائے طاعون کی وجہ سے کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔ آپ ابھی معتمد عمومی کی رپورٹ سے انجمن کی مصروفیتوں کا اندازہ کر سکیں گے۔ اس انجمن نے بلدے کے مختلف معلمین مدارس کے باہمی ارتباط اور برادرانہ تعلقات کے بڑھانے اور تعلیمی ضروریات اور اُن کی مختلف مشکلات کے مطالبہ کرنے اور عوام کو اپنے سرکاری آرگن یعنی حیدرآباد ٹیچر کے ذریعہ سے تعلیم دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ اس انجمن نے ایک اعتبار سے حیدرآباد کے اساتذہ میں اپنے پیشہ کی ذمہ داریوں کا صحیح احساس پیدا کر دیا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ وہ دن دُور نہیں جبکہ یہ انجمن ریاست کے اُن خیالات کو جو تعلیم سے متعلق ہیں عملی جامہ پہنائے گی۔ اور تعلیم کے اُن پیچیدہ مسائل کو سُلجھا دے گی جو ابھی تک اُلجھے ہوئے ہیں۔ میں اپنے فریضہ کو کما حقہ ادا کرنے سے قاصر رہوں گا اگر میں اپنے ہر دل عزیز ناظم تعلیمات جناب خان فضل محمد خاں صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں۔ جنہوں نے نہ صرف انجمن کو بلکہ اس کے آرگن حیدرآباد ٹیچر کو بھی اپنی سرپرستی اور ادارہ نمائی سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیا ہے۔ اور جن گرم جوشیوں سے ہماری جملہ کارروائیوں میں دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار فرمایا ہے اُس کے ہم بدل ممنون ہیں۔ انہیں کے مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ترقی کی اس اعلیٰ منزل پر گام زن ہیں۔ ہم اراکین انجمن اساتذہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہیں کہ جناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات مدارس بلدہ جیسی ذی شان اور جامع کمالات ذات ہماری صدر ہے۔ ممدوح انجمن مذکور کی روح رواں ہیں اُن کی مستقل مستعدی غیر محدود سرگرمی اور مسلسل محنت نے انجمن اور اُس کے سہ ماہی آرگن کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔ انجمن اساتذۂ حیدرآباد چونکہ آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس اسوسی ایشن سے متعلق ہے اس لئے ہماری ریاست کے باہر بھی تسلیم کی جا چکی ہے۔ ہر سال انجمن کی طرف سے دو نمایندے

فیڈریشن کے اجلاس میں حصہ لینے کے لئے بھیجے جاتے ہیں یہ فیڈریشن ہر سال اپنا مقام بدلتی رہتی ہے اور اس کا اجلاس کسی مشہور شہر یا قصبہ میں بڑے دن کی تعطیلات میں ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ سال گزشتہ مسٹر جیدا اور کر صدر مدرس رزیڈنسی مڈل اسکول اور خاکسار نے اس فیڈریشن میں اس انجمن کی نمایندگی کی تھی۔ میں یہاں ایک مفید مشورہ دینے کی جرأت بھی کرتا ہوں کہ یہ انجمن اپنی سرگرمیوں کے دائرہ کو تمام ممالک محروسہ میں وسیع کیوں نہیں کرتی۔ وہ کون سا امر ہے جو اس کو ممالک محروسہ کی مرکزی انجمن بنانے میں مانع ہے۔ اضلاع و تعلقات کی دوسری انجمنیں اس میں ضم کیوں نہ کر دی جائیں۔ اگر جناب ناظم صاحب تعلیمات اس کی طرف توجہ فرمائیں تو تحتانیہ وسطانیہ اور فوقانیہ مدارس میں جہاں اب تک کوئی انجمن نہیں ہے۔ ایسی انجمنوں کے قیام کے لئے گشتی جاری فرما سکتے ہیں۔ اور ہمارے جناب صدران انجمنوں کے انضمام اور دیگر امور میں دلچسپی لے سکتے ہیں۔

دی حیدر آباد ٹیچر جو انجمن کا آرگن ہے تمام ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ محکمۂ تعلیمات پنجاب صوبہ جات متحدہ و بہار و اوڑیسہ اور صوبہ جات متوسط و برار اور ریاست ہائے بڑودہ و میسور نے اس کو اور اس کے مضامین کو مستحسن قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس کے مضامین نگار ممالک غیر کے اہل قلم اور انشا پرداز بھی ہیں۔

یہاں میرا ایک اور خیال بھی ہے یعنی اس میگزین کے اردو حصہ کو اور مستحکم بنانے کی خاطر کیوں نہ "المعلم" ماہانہ رسالے کو "حیدر آباد ٹیچر" میں اس طرح ضم کر دیا جائے کہ "حیدر آباد ٹیچر" کے اردو حصہ کی زمام ادارت جناب مولوی سجاد مرزا صاحب کے ہاتھوں میں ہو۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ گورنمنٹ ٹریننگ کالج کا اسٹاف بھی ایک اپنا ماہانہ رسالہ اجرا کرنے کے مسئلہ پر غور کر رہا ہے۔ لیکن میری رائے میں بجائے اس کے کہ اپنی محنت اور وقت کو تین مختلف رسائل کے کامیاب بنانے میں صرف کیا جائے اور وہ بھی ایسے رسائل جن کے حجم میں بھی وقتاً فوقتاً کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اکثر تو دو دو ماہ کے نمبر اکٹھے نکالے جاتے ہیں۔ اور وقت معینہ سے ایک عرصہ کے بعد ان کا اجرا ہوتا ہے یہ نقائص ہمارے ہندوستانی رسائل کی نمایاں خصوصیات سے ہیں۔ ایسی صورت میں ایسا کیوں نہ کیا جائے

کہ اپنی قوتوں کو ایک ہی جگہ مرتکز کر کے ایک علمی ممتاز رسالہ جاری کریں۔ جس کا حلقۂ ادارت لائق افراد پر مشتمل ہو اور جس کے بیش بہا مضامین ایک مستقل اور غیر متبدل علمی معیار کے حامل ہوں۔ اس بات کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ اُس کا ہر نمبر اپنے ماسبق نمبر سے بہر حیثیت زیادہ ممتاز و شان دار ہو۔ بالفعل ہماری موجودہ تعلیمی رفتار اتنی تیز نہیں ہے کہ بہ یک وقت تین تین علمی رسائل کے اِجرا کی ضرورت محسوس ہو۔

اب میں اپنے محترم مہمانوں کی طرف مخاطب ہوتا ہوں اور اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ہماری انجمن کے مسائل کے غور و پرداخت میں حِصّہ لیا ہے لیکن میں یہ ضرور درخواست کروں گا کہ وہ تعلیمی معاملات میں اور زیادہ دِل چسپی لے کر ہمارے مشکل اور اہم کام کو آسان اور خوش گوار بنانے میں ہمارے اساتذہ صاحبان کی اعانت فرمائیں۔ اس قسم کی دِل چسپی کے اظہار کا بہترین موقع یہ ہو سکتا ہے کہ آپ حضرات ہمارا ہاتھ بٹانے کے لئے اپنے بچّوں کے خانگی اوقات میں اُن کے تعلیمی مشاغل کی نگہہ داشت کریں اور اُن کے چال چلن کو اخلاق کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش فرمائیں۔ اور اُن میں ورزش جسمانی کا شوق اور گیمس کا صحیح ذوق پیدا کریں اس طرح ہم نونہالاں ملک کی سہ گونہ نشو و نما کر سکتے ہیں جس سے اُن کی علمی جسمانی اور اخلاقی تربیت مقصود ہے۔ ذرا آپ لوگ اپنے اپنے گریبانوں میں منہہ ڈال کر دیکھیں کہ آیا ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو فی الحقیقت اپنے بچّوں کو علمی ترقی اور ذہنی نشو و نما میں عملی دل چسپی لیتے ہیں۔ ہم لوگ اپنے ملاقاتیوں کے ساتھ سلوک کرنے اور اُن کو اپنا قیمتی وقت دینے میں دریغ نہیں کرتے۔ ہم اپنا بہت سا وقت تفریحی مشاغل میں صرف کرتے ہیں ہماری زندگی کا ایک بڑا حصہ تمباکو نوشی میں صرف ہوتا ہے خاص کر وہ لوگ تو جو حُقّے کے شوقین ہیں تمباکو نوشی کا پورا پورا حظ اُٹھانے کے لئے کم و بیش ایک گھنٹہ اس غیر مفید بلکہ بے جا شغل میں ضایع کر دیتے ہیں۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ ہم اپنے ننّھے ننّھے معصوم بچّوں کے لئے تھوڑا سا وقت وقف کرنے سے جی چُراتے ہیں۔ ہم کبھی بھولے سے بھی نہیں پوچھتے کہ اُن کی حالت جماعت میں کیسی ہے۔ اور اُن کی رفتارِ ترقی تعلیم کی رپورٹ مدرسہ کی جانب سے بھیجی بھی جاتی ہے۔ آیا وہ اپنا

ہوم ورک باقاعدہ کرتے ہیں یا نہیں۔ آیا وہ کس مضمون میں کمزور ہیں۔ اور اگر کمزور ہیں تو اس کمزوری کے دفع کرنے کے لئے کیا کوشش کی جارہی ہے۔ آیا اُنہوں نے ایسے مضامین کا انتخاب تو نہیں کیا ہے جو اُن کے فطری مذاق کے خلاف ہیں۔ آیا وہ بالطبع غبی واقع ہوئے ہیں یا انہوں نے ایسی عادتیں اختیار کرلی ہیں جو اُن کی سُستی اور کاہلی کا موجب ہیں آیا اُن کے ہم نشیں اور رفقا پسندیدہ اوضاع و اطوار کے ہیں اور اگر اُن کی صحبتیں بُری ہیں تو اُن کو۔ ان صحبتوں سے دور کرنے کی کیا کیا تدبیریں اختیار کی گئی ہیں آیا وہ اپنے شام کے اوقات کھیل کے میدان میں صرف کرتے ہیں یا گھر پر گزارتے ہیں یا اپنے خانگی معلم کے ساتھ۔ آیا خانگی معلم اپنے فرائض کو کماحقہ ادا کرتا ہے یا مقررہ وقت کو یوں ہی گزار دیتا ہے اس طرح ہم سب کو بے وقوف بنا کر مہینہ ختم ہوتے ہی اپنی محنت کے (جو دراصل عدم محنت ہے) دام کھرے کر لیتا ہے آیا ہمارے بچے اپنے جمعوں اتواروں قلیل المدۃ تعطیلات اور طویل تعطیل کو کیوں کر گزارتے ہیں۔

عمداً طویل کے ساتھ تعطیل بصیغۂ واحد استعمال کیا گیا ہے کیونکہ موسم سرما کی تعطیل بڑھ گھٹ گھٹا کر ہفتہ سے بھی کم رہ گئی ہے طویل کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

— آیا ہم نے کبھی اپنے بچوں کے ایام تعطیلات کے گزارنے کا کوئی لائحۂ عمل بھی تیار کیا ہے یا نہیں۔ میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنے بچوں کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی تدریجی ارتقا کی نمو کو اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ اُن کی مرضیات اور غیر مرضیات کیا ہیں کن چیزوں سے ان کو فطری لگاؤ اور کن چیزوں سے طبعی تنفر ہے اور پھر ان سب امور کے مدنظر ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو ان کے لئے ان کی موجودہ اور مستقبل کی زندگی کا ایک نظام اکمل مرتب کرتے ہیں بہت سے مدور بچے مربع سوراخوں میں ٹھونس دئے جاتے ہیں اور اسی طرح بہتیرے مربع نما بچے گول سوراخوں میں ڈالے جاتے ہیں اس ناموافق فضا سے نکل کر وہ زندگی کے میدان میں بے سروسامانی کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ انسانی زندگی کے بدنما اور بھدے نمونے کے سوا اور کیا پیش کرسکتے ہیں بچوں کی طرف سے اس مجرمانہ غفلت کے

ذمہ دار ہم والدین ہی ٹھیرائے جائیں گے اپنے بچوں کے لئے ہمارے سامنے نہ تو کوئی مقررہ مطمح نظر ہے نہ کوئی معین نظام العمل ہے اور نہ ان کے لئے ہمارے دلوں میں اُمنگیں موجود ہیں ہم نے ان کو تن بہ تقدیر چھوڑ رکھا ہے۔ اگر ہم اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس کر لیتے تو یہ ممکن نہ تھا کہ یہ موجودہ بے توجہی بے حسی اور بے دردی جاری رہ سکتی۔ ہرگز میرا یہ مقصد نہیں کہ اپنی نکتہ چینیوں سے کسی کی دل آزاری کروں بلکہ اس تمام سمع خراشی سے صرف یہ مُدعا ہے کہ حالات کی موجودہ ابتری کو آپ کی نگاہیں بے نقاب دیکھ لیں اس بے مقصد راہ روی کی روک تھام ہو اور ہم بچوں کے ماں باپ اور سرپرست کی حیثیت سے ان کی بالیدگی نشو و نما اور ان کی تکمیل تربیت کی جانب گہری اور استوار دلچسپی لیں اگر ایسا نہ ہوا تو ہم سخت ترین خیانت مجرمانہ کے مرتکب متصور ہوں گے۔

اب میں برادران اساتذہ یعنی میدان تعلیم کے متحد العمل کارکنوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یہ لوگ ایک ایسے پیشہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کو دنیا عزت سے کم اور حقارت سے بہت زیادہ دیکھتی ہے میں آپ حضرات کو خوش آمدید کہتے ہوئے چند ضروری امور بیان کروں گا اور کچھ نصیحت بھی:۔

آپ کا تعلق ایک ایسے پیشہ سے ہے جس کو دنیا کا اگر شریف ترین پیشہ نہ کہا جائے تو کم از کم یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ معلمی بھی اعلیٰ پیشوں میں سے ایک پیشہ ضرور ہے بمصداق "جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے"۔ آپ کے سر چند اہم ذمہ داریاں ہیں یعنی آج کے بچے جو کل بڑے ہونے والے ہیں ان کی نگہداشت آپ کے ذمہ ہے مدرسہ میں ان کی تعلیم کے اور بازی گاہوں میں ان کے کھیلوں کے آپ نگران ہیں اس خصوص میں آپ کے فرایض روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ آپ نہ صرف ان کی تعلیمی ترقی ہی کے جواب دہ ٹھیریں گے بلکہ ان کے کیریکٹر کو صحیح سانچے میں ڈھالنے کا اہم کام بھی آپ ہی کے ذمہ ہے مدرسہ کے اندر اور باہر ان کی تمام سرگرمیوں پر آپ کو نظر رکھنی ہوگی اور ان کو زندگی کے لئے تیار کرنے میں نہ صرف خالی خولی ہدایت بلکہ زیادہ تر اپنے عملی نمونہ سے ان کی رہنمائی کرنی پڑے گی کہا یہ جاتا ہے کہ بمصداق الولد سر لابیہ یعنی قانون وراثت کے مطابق بچے ماں باپ کے قدم بہ قدم ہوتے ہیں۔ لیکن

بچوں کی تربیت میں ان کے ماحول یعنی گرد و نواح کے اثرات کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے اور چونکہ بچّے اپنے اوقات کا ایک بڑا حصہ آپ اساتذہ کے زیر اثر گزارتے ہیں اس لئے ماحول اثر کے قانون کے تحت وہ ہو بہو آپ ہی کی تمثال ہوتے ہیں آپ اچھے ہیں تو وہ بھی اچھے ہوں گے آپ بُرے ہیں تو وہ بھی بُرے ہوں گے اس لئے آپ جماعت میں ہوں یا جماعت کے باہر کھیل کے میدان میں ہوں یا کسی تفریحی سیاحت میں کسی محفل میں ہوں یا گھر پر جہاں آپ کے شاگرد آپ سے ملنے آئیں ان سب حالتوں میں موقع و محل کے مُطابق اپنے طرز عمل میں نہایت حزم و احتیاط برتیں تاکہ آپ کے شاگرد آپ کی مثال سے اچھا سبق حاصل کریں۔ آپ کا ہر فعل ان کے دلوں پر اپنا نقش بٹھائے بغیر نہ رہے گا۔ فطرتاً بچے بڑے نقّال ہوتے ہیں آپ کی آواز چال ڈھال حرکات و سکنات کا چربہ اُتارنا ان کا فطری خاصہ ہے میں نے جب کبھی چھپ کر کسی لڑکے کو اپنے ہم رنگ ساتھیوں کے سامنے کسی ایسے اُستاد کی نقل اُتارتے دیکھا ہے جو ہو اسے لڑتا اور ذرا سی بات پر غیظ و غضب میں آجاتا ہو یا جماعت میں بیٹھ کر اونگھنے کا کہنہ مشق ہو یا بار بار ناس لینے کا عادی ہو تو میں ہمیشہ اس نقالی کے نظاروں سے غیر معمولی طور پر محظوظ ہوا ہوں۔ میری رائے میں اساتذہ صاحبان تین طبقوں میں منقسم ہو سکتے ہیں۔

اولاً وہ جنہیں کاہل بلکہ احدی کہنا چاہیئے ان لوگوں سے کام لینے کے لئے ہمیشہ سختی اور دباؤ کی ضرورت پڑتی ہے یہ خُدا کے بندے جماعت کے اندر اکثر عزیزوں اور دوستوں کو خط لکھا کرتے ہیں اور اگر موقع ہاتھ آئے تو دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اخبار بینی یا افسانہ خوانی کرنا تو ان کے نزدیک مُباح مُباح اور جائز فعل ہے فی الحقیقت ہمارے محکمہ کے "بدنام کنندہ نکو نامے چند" یہی بزرگ وار ہیں۔

ثانیاً۔ فرض شناس اساتذہ جو اپنا کام چپ چاپ صدر مدرس کی جانب سے کسی حاکمانہ تحریک کے بغیر انجام دیتے ہیں۔ اور نصاب مقررہ کو ہمیشہ وقت معینہ کے قبل ہی ختم کرتے ہیں۔ اسکاؤٹس کی اصلاح میں یہ لوگ سدا تیار رہتے ہیں۔ اور اچانک معائنوں کے وقت کبھی غافل نہیں پائے جاتے۔

ثالثاً! سررشتہ کے وہ مایۂ ناز اساتذہ جو نہ صرف اُن فرائض کو جو مدرسہ کے اوقات میں ان پر عائد ہوتے ہیں باحسن وجوہ انجام دیتے ہیں بلکہ اپنے نجی اوقات میں بھی طلبار کی امداد سے دریغ نہیں کرتے۔ طلبا کے شکوک رفع کرنا کاپیوں کی اصلاح خاص خاص طلبا کو انفرادی طور پر مسائل کے حل کرنے میں مدد دینا بلکہ تکمیل نصاب کے لئے اگر ضرورت ہو تو اوقات مدرسہ کے پہلے یا بعد پرائیوٹ کلاسنر میں تعلیم دینا ان کی دلی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ وہ تعطیل کے دن اور کام کے روز میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ اُن کی ذات وہ بحرِ فیض ہے جس سے تشنگانِ علم بلا تفریق و امتیاز سیراب ہوتے رہتے ہیں بڑی سے بڑی تعداد کو بڑے سے بڑا فائدہ پہونچانا اِن کا نصب العین ہے۔ وہ اپنی ترقی کے لئے کبھی دوڑ دھوپ نہیں کرتے۔ دفتروں میں جاکر اپنے کسی معاملہ کی پیروی کرنا اُن کو نہیں آتا۔

کُلُّ اَمْرٍ مَرْهُونٌ بِاَوْقَاتِهَا کے اصول پر کاربند ہیں اُن کے جملہ کام وقت کی مساعدت پر موقوف ہیں۔ ان کا یہ ایمان ہے کہ وہ کام جو خلوص نیت اور دیانت داری سے کیا جائے اس کا صلہ یا انعام ممکن نہیں کہ بہت دنوں تک معرض التوا میں پڑا رہے اس قسم کے بے نفس مدرسین کا وجود ہمارے سررشتہ کی زیب و زینت کا باعث ہے یہی وہ لوگ ہیں جن کے ناموں کے پاکیزہ نقوش دلوں سے عرصہ دراز تک محو نہیں ہو سکتے ہیں اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے ایسے ہی آدمی درکار ہیں۔ اب میں ممالک محروسہ کے مدرسین کی حالت پر تبصرہ کروں گا۔

ہماری ریاست حیدرآباد دو لحاظ سے برٹش انڈیا پر سبقت رکھتی ہے۔ اولاً ہمارے یہاں کے معلمین کو معقول مشاہرہ دیا جاتا ہے اور ان کے لئے ترقی کے بہتر مواقع موجود ہیں، ثانیاً یہ کہ ہم نے اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا ہے جس کے فوائد پر بحث کرنا محض تحصیل حاصل ہے۔ دولت آصفیہ سرکار عالی کی فیاضی کی بدولت ہمارے ہاں مشاہرات اور گریڈس کی ایسی عمدہ تنظیم ہے جو برٹش انڈیا کے امدادی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے متعلقہ مدارس کے لئے باعث رشک ہے اگرچہ ٹائم اسکیل کے نفاذ سے اُن معلمین پر جو سند یافتہ

نہ تھے یا معمولی اسناد رکھتے تھے بُرا اثر پڑا ہے کیونکہ جنگ عظیم سے قبل ایسے لوگوں کا اپنی محنت شاقہ اور عمدہ نتائج کی بدولت سررشتہ تعلیمات کے اعلیٰ مدارج پر بھی پہونچ جانا ناممکن نہ تھا تاہم بحیثیت مجموعی ٹائم اسکیل اُن مدرسوں کے لئے باعث رحمت ہے جو حصول ملازمت اور ترقی کے لئے پیروی کے فن لطیفہ سے بے بہرہ ہیں۔ بجز اُن چند افراد کے جو حال حال میں دائرہ ملازمت میں آئے ہوں ٹائم اسکیل کے قواعد کی رُو سے ہر شخص اپنا اپنا گریڈ پا رہا ہے ذرا نواب عماد الملک مرحوم کے زمانہ کو لیجئے اور المالطیفی کے دور پر بھی نظر ڈالتے جن میں بہت سے نئے انتظامات کی داغ بیل ڈالی گئی تھی آپ دیکھیں گے کہ آج کل کے مدرسین اپنے پیش رؤں سے کہیں بالاتر ہیں پھر برٹش انڈیا کے ہم عصر ہمسروں کے مقابلہ میں ان کے لئے کہیں زیادہ تعداد میں ترقی کے ذرایع کھلے ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ اساتذہ کی ایک بڑی جماعت غیر مطمئن نظر آتی ہے فی زمانہ ہمارے محکمہ میں بے چینی اور پریشانی کی تلاطم خیز لہر جاری و ساری ہے جس کی زد سے ایسے اساتذہ بھی محفوظ نہ رہ سکے جو اب تک اپنی حالت پر قانع تھے اس میں شک نہیں کہ ہر گریڈ کے تدریجی اضافے مقرر ہیں اور گزٹیڈ گریڈ تک بھی درجہ بدرجہ پہونچنے کی امیدیں موجود ہیں پھر بھی ہم میں سے ہر ایک فوری ترقی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا نظر آتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک دم بلند تر گریڈ حاصل کرلے ٹائم اسکیل کی وجہ سے بالعموم ہر شخص بجائے اس کے کہ اپنے منصبی فرائض بطریق احسن ادا کرنے کی فکر کرے اعلیٰ تر امتحانات کامیاب کرنے کی دُھن میں لگا ہوا ہے تاکہ اپنے آپ کو بہ لحاظ اسناد اعلیٰ گریڈ کا مستحق بنالے جب سے جامعہ عثمانیہ کے گراجویٹ اور انڈر گراجویٹ محکمۂ ہذا میں داخل ہو رہے ہیں تب سے ٹائم اسکیل کے قواعد کا پورا پورا نفاذ ذرا مشکل سا ہو گیا ہے معاشیات کے مشہور اصول طلب و رسد کے مُطابق اسناد اور ڈپلوموں کی قیمت اب وہ باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ نئے تقررات میں اصولی اختلافات اور پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ بعض اُمیدوار کمتر گریڈ پر کام کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض تقررات معیار قابلیت کے مساوی گریڈ پر بھی کئے جاتے ہیں اور یہ امر ان لوگوں کے لئے جو پہلے سے اپنی قابلیت کے

اعتبار سے کمتر گریڈ پر کارگزار ہیں یا ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کمتر گریڈ کو قبول کر لیا ہے ناگوار خاطر ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ بعض اوقات گوٹیڈ لائن میں راست تقررات عمل میں آتے ہیں یہ طرز عمل سابق الخدمات بی ٹی کامیاب اصحاب کی دل شکنی اور تکدر کا باعث ہوتا ہے۔ ہمارے تدریجی اضافوں کی سست رفتاری بے حد صبر آزما اور ہمت شکن ہے جس سے سررشتہ میں بد دلی اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ غیر سند دار ندہ مدرسین ٹائم اسکیل کو کوس رہے ہیں جس کے نفاذ نے ان کی ترقی کی راہ میں سد سکندر حایل کر دی ہے۔ وہ معلمین جن کے پاس کمتر درجہ کی اسناد ہیں اعلیٰ امتحانات کی کامیابی کی اُدھیڑ بن میں منہمک ہیں ان کا یہ انہماک بصورت اعشاریہ متوالی لامحدود و لامتناہی ہے تاآنکہ یہ سلسلہ گرجیڈ گریڈ کی حد و ذتک نہ پہونچ جارہے۔ شکریہ ٹایم اسکیل کا جس کی بدولت کتنے میٹرک کامیاب آج ٹرینڈ گریجویٹ بن چکے ہیں ان کا مستقبل روشن اور کامیاب بن گیا ہے۔ پھر بھی اطمینان خاطر ان کو نصیب نہیں اب گزیٹڈ گریڈ کا دلفریب تصور ورغلاتا ہے اور انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اس باب خاص میں میرا یہ خیال ہے کہ جہاں ایک طرف ٹایم اسکیل کے نفاذ نے ہمارے مدرس صاحبین کے معیار لیاقت کو بڑھایا ہے اور مدارس کو گریجویٹس اور ٹرینڈ گریجویٹس سے پر کر دیا ہے جہاں پیشتر ان کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا تھا وہاں اضطراب و پریشانی میں بھی کافی اضافہ کر دیا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ٹایم اسکیل کا وجود ہمارے سررشتہ کے لئے سبب رحمت ضرور ہوا لیکن یہ رحمت زحمت سے خالی بھی نہیں کیونکہ وہ تمام بے چینیاں اور پریشانیاں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اسی کی بدولت ہیں جن کا اثر ہمارے مدارس کے نظم ونسق اور ضبط پر بہت برا پڑ رہا ہے کیا ہم ذمہ دار افسران متعلقہ سے یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ اس گتھی کو سلجھانے اور موجودہ پریشانی کو رفع کرنے میں سعی فرمائیں گے ؟

آپ سے رخصت ہونے سے پیشتر چند کلمات نصیحت اور گوش گزار کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ اس دور ترقی میں چونکہ مدارس بھی دن بدن وسیع اور عسیر الانتظام ہوتے جا رہے ہیں میری دلی تمنا ہے کہ آپ لوگ باہمی ہمدردی اور اشتراک عمل کو اپنا نصب العمل

بنائیں۔ اپنی ہستیاں ذہنی انہماک کے لئے وقف کردیں اور اپنے انہماک سے اپنی درس گاہوں کو موقر و مفتخر بنائیں۔ نیز چونکہ ابھی تک ہمارے یہاں ریفرشیر کورسز کا انتظام عمل میں نہیں آیا اس لئے معلمین کو لازم ہے کہ اپنے اپنے متعلقہ مضامین کی تیاری میں انتہائی سعی کریں اور پوری پوری دلچسپی لیں اس سے بھی زیادہ اہم نصیحت یہ ہے کہ تمام عمر ایک سچے طالب علم کی طرح علم کے خواہاں اور جویاں رہیں فقط

رپورٹ انجمن اساتذہ مستقر بلدہ

صدر محترم معزز حاضرین و خواتین ۔

خدا کا شکر ہے کہ انجمن نے اپنی عمر کے ساڑھے پانچ سال پورے کرلئے اور اب ہم اس انجمن کی چوتھی سالانہ کانفرنس میں بعض اہم تعلیمی امور پر بحث کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں

حضرات ۔ اس مرتبہ بھی کانفرنس کی کارروائی اُس طریقہ پر انجام دی جارہی ہے جو سال گزشتہ اختیار کیا گیا تھا یعنی مضامین زیر بحث میں سے تین اہم مضامین اوائل اسفندار ۳۹ ف سے ہی ایک ایک سب کمیٹی کے تفویض کئے گئے ہیں ہر ایک سب کمیٹی کے اراکین اکثر و بیشتر وہی حضرات ہیں جو مضمون متعلقہ میں خاص مہارت اور دلچسپی رکھتے ہیں اور اس طرح ہر سہ مضامین میں سے ہر ایک پر سب کمیٹی متعلقہ کو کافی غور و خوض اور بحث کرکے عمدہ اور کارآمد نتائج اخذ کرنے کا سال گزشتہ سے بھی زیادہ موقع ملا ہے ہر ایک سب کمیٹی کی رپورٹ آپ کے سامنے حسب پروگرام اس کانفرنس میں پیش ہوگی۔

حضرات ۔ سال گزشتہ کی کانفرنس میں آپ نے جو تعلیم ریاضی۔ تعلیم ورزش جسمانی پیشوں کی تعلیم تعلیم اُردو اور تعلیم انگریزی کی سب کمیٹیوں کی رپورٹیں منظور کی تھیں۔ بتوسط عالی جناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات مستقر بلدہ ان کو محکمہ صدر دفتر نظامت تعلیمات میں مناسب و ضروری کارروائی کے لئے ارسال کیا گیا تھا اور دفتر مذکور میں ان پر غور کے بعد گزشتہ ماہ اسفندار میں رپورٹ سب کمیٹی ریاضی کی اشاعت جملہ مدارس میں کرنے کے لئے احکام

صادر فرمائے گئے۔ اور حال ہی میں مطلع فرمایا گیا ہے کہ تعلیم ورزش جسمانی کی سب کمیٹی
کی رپورٹ اور جناب صدر مہتمم صاحب ورزش جسمانی کی تجاویز کی بنا پر ممالک محروسہ
سرکار عالی کے مدارس کے لئے تعلیم ورزش جسمانی کا ایک اسکیم تیار کرنے کے لئے جناب
مولوی سید علی اکبر صاحب۔ جناب مولوی سید محمد ہادی صاحب۔ جناب مولوی سجاد مرزا
صاحب۔ ایف ۔ دیبر صاحب۔ جناب ڈبلیو ٹرنر صاحب کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے
جس کے صدر جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب ہیں۔ چنانچہ جناب مولوی سید محمد ہادی صاحب
جو کمیٹی کے معتمد ہیں ان کی مرسلہ ایک جلسہ کی روئداد سے ظاہر ہے کہ کمیٹی مذکور نے جلسہ
مذکور میں اپنا لائحہ عمل تیار کر لیا ہے جس میں تعلیم ورزش جسمانی کے موجودہ نظام اور معلمین
ورزش ان کے معیار لیاقت تنخواہوں۔ ان کی تعلیم کے انتظام کے علاوہ۔ کھیلوں آلات
ورزش میدان ہائے ورزش اور تعلیم ورزش وغیرہ اہم امور کو شریک کیا ہے۔ نیز پیشوں
کی تعلیم کے متعلق بھی منجانب سرکار عالی کافی توجہ فرمائی جا رہی ہے۔

بہرحال خوشی کی بات ہے کہ انجمن ہذا کی پیش کردہ پانچ رپورٹوں میں سے دو پر سررشتہ
نے خاص طور سے توجہ فرمائی ہے اور امید ہے کہ پیشوں کی تعلیم انگریزی اور تعلیم اردو کی
رپورٹوں پر بھی آیندہ مناسب کارروائی ہوگی۔

شاخ ہائے انجمن | سال زیر رپورٹ میں انجمن کی شاخیں حسب سابق (۱۴) ہی رہیں۔

اراکین انجمن | انجمن ہذا کی رکنیت چونکہ حسب قواعد منظورہ سرکار دفعہ (۴) ضمن الف
جملہ مدرسین مدارس تحت دفتر صدر مہتمی تعلیمات مستقر بلدہ پر لازمی ہے اس لئے تعداد اراکین
میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی مگر ساتھ ہی حسب دفعہ (۴) ضمن (ب) دوسرے اراکین کی تعداد
سال زیر رپورٹ میں (۴۳) کی بجائے (۳۰) ہوگئی ہے۔

مرکزی انتظامی کمیٹی کے جلسے | سال زیر رپورٹ میں مرکزی انتظامی کمیٹی کے جلسے حسب
ضرورت (۲) ہوئے جس میں حسب قواعد انجمن ہر سہ ماہی کے لئے قبل از وقت ماہانہ جلسوں کا
پروگرام مرتب کرنے کے علاوہ ترتیب موازنہ و انتخاب عہدہ داران سنہ رواں و تقرر تنقیح
کنندگان حسابات انجمن و تقرر کمیٹی ہائے متعلقہ انتظام کانفرنس ہذا انجام دئے گئے۔ مرکزی

انتظامی کمیٹی کی مقرر کردہ کانفرنس کمیٹی نے اس سال بھی پروگرام کمیٹی نمایش سب کمیٹی اور استقبالیہ کمیٹی مقرر کی جس کی وجہ سے اس کانفرنس کا کام باقاعدہ طور سے چل رہا ہے۔

معمولی ماہانہ جلسے | سال زیر رپورٹ میں ہر مرکز میں (۷) ماہانہ جلسے منعقد ہوئے اور ہر ایک مرکز میں حسب ذیل مسائل پر بحث ہوئی۔

(۱) مدرس کی کارگزاری خارج از اوقات مدرسہ۔

(۲) موجودہ نصاب کو کیسے کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔

(۳) تعلیم جغرافیہ مع سبق نمونہ۔

(۴) تعلیم تاریخ مع سبق نمونہ۔

(۵) تعلیم جغرافیہ انسانی نقطۂ نظر سے۔

(۶) تمدنی حالات کا مطالعہ تعلیم تاریخ کا جزو۔

(۷) تاریخ اور جغرافیہ کا باہمی تعلق۔

یہ سب مسائل سوائے پہلے ایک کے ان تینوں مضامین سے تعلق رکھتے ہیں جن کے لئے سب کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں یعنی تاریخ جغرافیہ اور علم ریاضی۔ ان ماہانہ جلسوں کی کارروائی کی روئداد متعلقہ سب کمیٹیوں کو دے دی گئی ہے۔ اس طرح گویا ابتدائے سال سے ہی اس کانفرنس کا کام ہو رہا ہے۔

عام جلسہ | سال زیر رپورٹ میں ماہ بہمن میں ایک عام جلسہ کرنے کا تصفیہ مرکزی انتظامی کمیٹی نے کیا تھا مگر مرض طاعون کی پریشانی کی وجہ سے وہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

انجمن اتحادی | حضرات:- انجمن ہذا کی تحریک سال ماسبق کی بنا پر دفتر صدر مہتمم تعلیمات بلدہ میں انجمن اتحادی قائم ہو گئی ہے۔ اور اس میں اب تک (۴۲) اراکین شریک ہو چکے ہیں۔

دیگر | اس سال جناب مولوی سید ظہور علی صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔ پرنسپل صاحب دارالعلوم اور جناب چند اوارکر صاحب ایم۔اے صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ رزیڈنسی بزمانہ کرسمس بمقام مدراس آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشن کی پانچویں سالانہ کانفرنس میں انجمن ہذا کی جانب سے شریک ہوئے۔ اور کانفرنس مذکور کے متعلق جو ضروری رپورٹ

ہر دو حضرات نے تیار کی تھی وہ رسالہ حیدرآباد ٹیچر میں شائع ہو چکی ہے۔

حضرات :۔ انجمن کی لائبریری جس کے قیام کا ذکر گزشتہ رپورٹ میں کیا گیا تھا اراکین انجمن کے لئے کھول دی گئی ہے۔ فہرست کتب حیدرآباد ٹیچر میں شائع ہوئی ہے اور اراکین کتب خانہ سے استفادہ کر رہے ہیں نیز سرکار عالی سے اس کی امداد کے لئے درخواست بھی کی گئی ہے جس کی منظوری کے بعد اُمید ہے کہ اس میں مزید تازہ ترین کتب مہیا کرنے کا انتظام ہو سکے گا کیوں کہ ابھی تعداد کتب اس قدر قلیل ہے کہ جیسا کہ سال گزشتہ سب کمیٹیوں کو ضروری کتب موجود نہ ہونے سے اس سال بھی بہت مشکل ہوئی اس لئے اس لائبریری کی ضرورت امداد سرکاری سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔

(۳) ممالک محروسہ سرکار عالی کے لئے ایک صدر انجمن اساتذہ کے قیام کی تحریک پر صدر دفتر نظامت تعلیمات سے جو مسودہ قواعد طلب کیا گیا تھا۔ عالی جناب صدر المہام صاحب تعلیمات مستقر بلدہ روانہ فرما چکے ہیں۔ امید کہ اس صدر انجمن کے قیام کے بعد کُل ممالک محروسہ سرکار عالی کے مدرسین کی سالانہ کانفرنس ہوا کرے گی اور اس میں مدرسین کو باہم تبادلہ خیالات کا زرین موقع مل سکے گا۔

(۴) انجمن ہذا کی امداد کے لئے جو درخواست سرکار سے کی گئی ہے وہ ابھی بارآور نہیں ہوئی

(۵) انجمن ہذا کی گزشتہ کانفرنسوں میں جو تحریکات منظور ہوئی تھیں ان پر ارباب سررشتہ جات متعلقہ کافی توجہ کے ساتھ غور فرما رہے ہیں۔ اور اب تک جو کچھ کارروائی ہو چکی ہے اس کا مفصل تذکرہ تجدید تحریکات مذکورہ کے ضمن میں پیش کیا جائے گا۔

<u>انجمن کی مالی حالت</u> سال رواں میں بھی انجمن کے حسابات کی تنقیح مولوی محمد یوسف صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔ مددگار مدرسہ دارالعلوم اور مولوی سید غلام محمود صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج نے فرمائی ہے چنانچہ جملہ آمدنی بابتہ ۱۳۳۸ف میں سے امداد رسالہ بابتہ ۱۳۳۸ف پر (سما) کے علاوہ الونس وصادر پر (ما طعہ) مصارف کانفرنس و نمایش پر (ما للعہ ۱۲/۶) صرف کرنے کے بعد ختم آبان ۱۳۳۸ف پر مبلغ (الـ ماعہ) خزانہ انجمن میں موجود تھے۔

حضرات:۔ رسالہ انجمن چار سال سے جس عمدہ معیار پر چل رہا ہے وہ درحقیقت مدیران رسالہ جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔اے صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ و جناب۔ ایف سی۔ فلپ صاحب ایم۔اے وارڈن گرامر اسکول و جناب مولوی احمد حسین خان صاحب بی۔اے مدیران شاخ انگریزی و جناب مولوی فخرالحسن صاحب ملا۔بی۔اے۔بی۔ٹی۔ و جناب مولوی عبدالنور صاحب صدیقی بی۔اے۔بی۔ٹی۔ مدیران شاخ اردو کی سرگرم قابل قدر اور عدیم النظیر محنت اور مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ یہ محترم حضرات باوجود کثرت مشاغل اور اہم ذمہ داریوں کے اس فرض کو بلامعاوضہ۔ بے غرضانہ طور پر نہایت دل چسپی اور ایثار و دلسوزی سے انجام دے رہے ہیں۔ جناب مولوی احمد حسین خان صاحب بی۔اے کے تبادلہ کی وجہ سے جو کمی اور دشواری محسوس ہو رہی تھی الحمدللہ اس کو ہمارے قابل قدر اور محترم رکن جناب بی سیاشین صاحب مددگار سٹی کالج کی ذات نے پورا کر دیا صاحب موصوف بھی نہایت دل چسپی اور توجہ سے اس کام کو انجام دے رہے ہیں

حضرات:۔ جیسا کہ سال گذشتہ عرض کیا گیا تھا اس رسالہ کی مالی حالت ابھی تک ایسی نہیں جو انجمن کی سالانہ امداد سے مستغنی ہو سکے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اراکین انجمن ذاتی طور سے خود اس رسالہ کی خریداری کی طرف توجہ فرمائیں اور تعلیم سے دل چسپی رکھنے والے دوسرے حضرات کو بھی اس مفید رسالے کی خریداری کے لئے آمادہ کریں صوبہ اورنگ آباد و گلبرگہ شریف اور دوسرے چند اضلاع کے مدارس تحتانیہ کے لئے جو خریداری فرمائی گئی ہے اگرچہ اس کی وجہ سے رسالہ کی مالی حالت کچھ سنبھل گئی ہے مگر پھر بھی اب تک رسالہ نقصان سے محض مدرسین کے مفاد کے لئے جاری ہے ہاں اگر دوسرے اضلاع کے مقتدر عہدہ دار پھر اس طرف توجہ فرمائیں اور جو حضرات ایک مرتبہ خریداری سے سرفراز فرما چکے ہیں آئندہ بھی خریدار رہیں تو اس مفید تعلیمی رسالہ کی بہت کچھ مدد ہو سکتی ہے۔

حضرات:۔ میں اس امر کا افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہماری انجمن کے نہایت پرجوش رکن کے۔ پی شاستری صاحب بی۔اے۔ال۔ٹی صدر مدرس مدرسہ مفیدالانام جو ابتدائے قیام انجمن سے مرکزی انتظامی کمیٹی کے سرگرم رکن رہے اور سال حال کی

کانفرنس کے لئے جغرافیہ کی تعلیم کی سب کمیٹی کے معتمد بھی تھے۔ چند روزہ علالت کے بعد ہمیشہ کے لئے ہم سے جُدا ہوگئے نیز مولوی احمد الدین صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ کاچی گوڑہ جیسے لایق رکن کا صرف مختصر سی علالت کے بعد فوت ہوجانا نہ صرف مدرسہ مذکور کے لئے بلکہ سررشتہ تعلیمات کے لئے ایک سخت نقصان ہے۔

حضرات:۔ جناب مولوی احمد حسین خاں صاحب بی۔اے۔ بہ حیثیت شریک مُدیر رسالہ اور نائب میر مجلس انجمن ہذا کی قابل قدر امداد فرماتے رہے۔ اور جناب کے۔آر چاری صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔ نے قیام لائبریری کا کام نہایت عمدگی سے انجام دیا۔ اور مجوزہ انجمن اتحادی کی معتمدی کے متعلق ابتدائی کام بھی نہایت مستعدی سے ادا کیا تھا۔ گو ان ہر دو حضرات کا تبادلہ بلدہ سے ہوگیا ہے مگر ان ہر دو حضرات نے اپنا تعلق انجمن ہذا سے بہ حیثیت رکن انجمن دفعہ (۴) ضمن (ب) قائم رکھا ہے جس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

معزز حضرات:۔ اب میں آخر میں عالی جناب نواب اکبر یار جنگ بہادر کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جناب والا نے صدارت کانفرنس قبول فرما کر مدرسین بلدہ کی عزت افزائی فرمائی اور اس دعائے دلی کے ساتھ اس رپورٹ کو ختم کرتا ہوں کہ ''یہ انجمن اساتذہ ہمیشہ ملک کی مفید تعلیمی خدمات انجام دیتی رہے۔ اور جوش عمل کے ساتھ اہل ملک میں علم و ہنر کی روح پھونک کر ملک کو علمی ترقی کے اوج کمال تک پہنچانے کا ذریعہ بنے اور خدائے قادر و برتر ہمارے آقائے ولی نعمت تاجدار دکن حضرت سلطان العلوم حضور پر نور بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی کا سایہ عاطفت ہمارے سر پر مدت مدید تک قائم رکھے۔ آمین۔

سید محمد شریف مشہدی
معتمد عمومی انجمن اساتذہ بلدہ

خطبۂ صدارت

از عالیجناب نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد تعلیمات و عدالت و امور عامہ

خواتین و حضرات ۔

تمہید و شکریہ | انجمن اساتذہ کا یہ چوتھا سالانہ جلسہ ہے جس کی صدارت کی عزت مجھے عطا کی گئی ہے۔ ایک ایسے قابل عزت گروہ کے جلسہ کی صدارت جیسا کہ اساتذہ کی جماعت ہے ایک حقیقی عزت ہے جس کی میں تہ دل سے قدر کرتا ہوں۔ اگرچہ اظہار تشکر کے ساتھ ہی ساتھ اپنی درماندگی کا اعتراف ایک محض رسم کی حیثیت رکھتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرا اعتراف ایک اظہار حقیقت ہے اس لئے اس عزت کے لئے اظہار تشکر جس کا مجھ جیسا افتادہ شخص کسی طرح مستحق نہیں ہے ایک حقیقت اور ایک واقعی جذباتی کیفیت اپنے ساتھ رکھتا ہے!

اساتذہ کا مقام اور حیثیت | دنیا میں ہر چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی واقعی ضرورت اور ان فواید سے لگایا جا سکتا ہے جو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ فوائد جس قدر اہم۔ وورس اعلیٰ اور مستقل ہوں گے اسی قدر اس چیز کی قیمت یا عزت بڑھ جائے گی۔ اگر یہ اصول کسی چیز کی قیمت لگانے کے لئے صحیح ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس اصول کی صحت سے قبول کرنے میں کوی تامل نہ ہوگا تو اے حضرات مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ اس ترازو میں تولنے۔ اس پیمانے سے ناپنے کے بعد دنیا کا کوی وجود استاد سے زیادہ قیمتی زیادہ باعزت اور زیادہ قابل قدر نظر نہیں آسکتا ہے۔ اور بالآخر یہ کہنا پڑتا ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔

استاد کی عظمت کی تمثیل | جس طرح ایک چھوٹا سا بیج جو زمین میں رل مل جاتا ہے ہنرمندانہ محنت اور واقف کارانہ تردد سے ایک بہترین میوہ دار درخت بن جا سکتا ہے بعینہٖ اُسی طرح وہ قوتیں جو فطرت کی جانب سے انسان کے دل میں ودیعت کی گئی ہیں عالمانہ ترتیب اور تعلیمی فیوض سے نشو نما پاکر انسان ایسی عظیم الشان ہستی بنا سکتی ہیں جو اس کائنات عالم میں خدا کے بعد دوسرا درجہ رکھنے اور حقیقی معنوں میں خلیفۃ اللہ علی الارض کی مصداق ہوں جس طرح ایک تجربہ کار فلاح ضروری اوزار۔ مناسب آلات۔ اور تقویت بخش کھاد کے برمحل

استعمال سے عمدہ فصل حاصل کر سکتا ہے اُسی طرح ایک فریس اُستاد جو اصول نفسیات سے واقفیت رکھتا ہو مناسب ترین طریقہ تعلیم سے کام لے کر انسانی عقل و جذبات کی پرورش کر کے فائدہ رساں اور کار آمد انسان بنا سکتا ہے۔

سلسلہ بیان میں موجودہ نظام تعلیم پر ایک نظر

ایک صحیح الدماغ انسان کے افعال کی صحیح اور فطری ترتیب یہ ہے کہ کسی فعل سے پہلے اس کے دل میں ارادہ پیدا ہوتا ہے اور ارادہ سے پہلے کوئی خاص مقصد پیش نظر ہوتا ہے جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے بعد وہ اعمال و افعال ظہور میں آتے ہیں جو اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے عقل و تجربہ کی رو سے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ اس ترتیب کو مد نظر رکھ کر تعلیم حاصل کرنے سے پہلے کوئی مقصد ہمارے پیش نظر اور کوئی منزل یا مطمح نظر معین ہونا چاہیئے اور جب تک یہ نتیجہ نہ کر لیا جائے کہ ہم دنیا میں کیا بننا چاہتے ہیں اس وقت تک نہ تو صحیح طریقہ تعلیم اختیار کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ اصلی فواید تعلیم سے حاصل ہو سکتے ہیں جو حاصل ہونا چاہئیں۔ پروگرام اس شخص کے لئے ضروری ہے جو فی الواقع سفر پر آمادہ ہو اور منزل مقصود میں ہو ورنہ ایک کولہو کے بیل کے لئے پروگرام مرتب کرنا مضحکہ خیز ہوگا۔ ہمارا مطمح نظر یا منزل مقصود کیا ہونا چاہیئے اور آیا ہمارا موجودہ نظام تعلیم ہم کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے کافی ہے یا نہیں ایسے سوالات ہیں جن پر بڑی سرگرم بحث کی ضرورت ہے لیکن میرا ارادہ نہیں ہے کہ میں اس موقعہ پر ان مسائل پر کوئی بحث چھیڑ دوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بے وقت کی راگنی ہوگی اس لئے میں صرف اپنے بیان کے نتیجہ پر پہونچنے کے لئے موجودہ نظام تعلیم کی جانب اشارہ کر کے گزر جاؤں گا۔ اگر میں پورے نظام تعلیم پر بحث ضروری سمجھتا تو میں اس سے زیادہ عورتوں کی مناسب و معقول تعلیم اور ورزش جسمانی کی تعلیم پر شاید زیادہ زور دیتا اس کے ساتھ میں بالغان کی تعلیم کی بھی موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ ضرورت سمجھتا ہوں مگر یہ مناسب موقعہ نہیں کہ میں آپ کو ان مسائل میں الجھادوں میں نے جس بیان کو شروع کیا ہے صرف اس کو ختم کرنا کافی سمجھتا ہوں اور بقدر ضرورت نظام تعلیم موجودہ کے عام اثرات کی جانب حسب موقعہ اشارہ کرتا جاؤں گا۔

اگر درخت اپنے پھلوں سے شناخت کیا جا سکتا ہے تو موجودہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی پیداوار پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم اپنے نظام ونصاب تعلیم کے حسن وقبح کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ہماری تعلیم نے ملک میں دو قسم کے اشخاص پیدا کر دئے ہیں ایک وہ جن کی ہمتیں صرف ادنیٰ یا اعلیٰ ملازمتوں کے حصول تک محدود و قاصر ہیں دوسرے وہ جو اچھے مفکر اور فلسفی تو بن گئے ہیں لیکن عملی قوتوں کے صحیح استعمال سے محروم ہیں یعنی ان کے عقل کو تو تعلیم نے جلا دے دی ہے لیکن جذبات یا تو فنا ہی ہو گئے ہیں یا اس درجہ مضمحل کہ ان سے کسی عمل کی امید ہی نہیں کی جا سکتی ہے ظاہر ہے کہ کوئی ارادہ یا کوئی عمل جذبات کے بغیر ظہور میں آ ہی نہیں سکتا ہے عقل صرف روشنی کا تو کام دے سکتی ہے لیکن خود بذاتہا کوئی عمل نہیں کر سکتی ہے پس ایک ایسے مکان میں جس میں ذی حیاۃ و ذی ارادہ مخلوق موجود نہ ہو روشنی محض بے کار ہوگی ایک روشنی میں نیکی اور بھلائی کے بہترین کام بھی انجام پا سکتے ہیں اور سنگین تر جرائم اور نفرت انگیز ذمایم بھی عقل اگر ایک قابل ترین پولیس مین اور زیرک سراغ رساں کو مخلوق کی حفاظت اور خدمت کے جذبات کے ساتھ ساحل مراد تک پہونچاتی ہے تو ایک کامیاب ٹھگ۔ مشہور ڈاکو۔ غارت گر سارق بدترین جعل ساز بھی اس کی روشنی سے فایدہ اُٹھاتا ہے۔ پس محض عقل کی روشنی کوئی خوبی اور فلاح نہیں ہے جب تک کہ جذبات پر قابو اور ان کے صحیح استعمال پر قدرت حاصل نہ ہو ایسے مفکرین کی مثال جن کی عقل کو تعلیم نے جلا دے کر جذبات کو فنا کر دیا ہے اس لیمپ کی سی ہے جو ویرانہ میں روشن کر دیا گیا ہو جس سے کوئی فایدہ نہ اٹھا سکے۔ پس ایک طرف تو ہماری تعلیم نے غلاموں کا ایک گروہ پیدا کر دیا ہے جو ملازمت ہی کو منشاء حیات اور سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے اور جو کسی طرح آزادی اور حریت کی فضاء میں سانس نہیں لے سکتا ہے۔ اور یہی گروہ سب سے زیادہ ہے۔ دوسری طرف گو کم تعداد ہی میں سہی لیکن ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں جو عقل وفکر کے لحاظ سے تو آسمان میں تھگلی لگاتے ہیں لیکن عمل کے لحاظ سے محض اپاہج ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں باوجود اس بعد وفرق کے ایک خصوصیت مشترکہ یہ ہے کہ کسی ایک گروہ کو بھی حقیقی معنوں میں قوم اور قومیت کا کوئی احساس ہے

نہ اس سے تعلق۔ ہر ایک شخص بحیثیت ایک فرد اپنی ذاتی اور علیحدہ رونق بازار کا خواہاں ہے یہ دوسرا گروہ انسانیت کی تکمیل کے قریب ضرور ہو گیا ہے گویا وہ انسانیت کا ایک کچا مواد ہے جس سے اچھے انسان پیدا کئے جا سکتے ہیں اس گروہ کی مثال ایک ہیولیٰ کی سی ہے جس میں روح پھونکنا باقی ہے گویا وہ اذا سویتہ کا مصداق تو ہو گیا ہے لیکن ابھی نفخ روح کا منتظر ہے تاکہ حیات کے آثار ظاہر ہو جائیں اگر آپ کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ پیداوار یہی ہے تو سمجھنا چاہئے کہ آپ کا موجودہ نظام تعلیم ایسی مریض ماں کی حیثیت رکھتا ہے جو حرکت کرتے ہوئے زندہ بچے پیدا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتی ہے۔ نظام تعلیمی کے اس نقص کی ذمہ داری بڑی حد تک میری رائے میں ملک کی اس ذہنیت پر بھی عاید ہوتی ہے جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارا پورا ماحول کچھ اس طرح تبدیل ہو گیا ہے کہ اس نے ہمارے ذوق اور وجدان کو کچھ سے کچھ کر دیا ہے اور زندگی کے کسی شعبہ میں ہمارے سامنے کوئی اعلیٰ مطمح نظر باقی نہیں رہا ہے تعلیم کے معاملہ میں ہمارا قبلہ مقصود صرف یہ ہے کہ ہمارا بچہ تعلیم پا کر ملک کی اعلیٰ سے اعلیٰ خدمت حاصل کر سکے اور بس۔ تعلیم سے ہمارا منشاء فی نفسہ تعلیم نہیں ہے۔ یعنے ہم علم کو علم کی غرض سے حاصل نہیں کرتے ہیں بلکہ بادل ناخواستہ صرف ان شرائط کو پورا کر دینا چاہتے ہیں جو گورنمنٹ نے حصول ملازمت کے لئے عاید کر دی ہیں تاکہ ہم جلد سے جلد کوئی اعلیٰ عہدہ گورنمنٹ میں حاصل کر سکیں۔ جب تک ہماری یہ ذہنیت تبدیل نہ ہو گی ہمارا تعلیمی مطمح نظر پست رہے گا اور ظاہر ہے کہ ہمارا تعلیمی پروگرام کلیتہً ہماری خواہشات وضروریات اور ہماری مطمح نظر کے مطابق ہی ہو گا۔ اس ذہنیت اور اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں ایک بہت بڑا گروہ ایسے غیر مطمئن اشخاص کا پیدا ہو گیا ہے جو معاش کی تنگی سے مضطر و مضطرب ہو کر عقل کو بجا نہیں رکھ سکتا ہے یہی وہ گروہ ہے جو ملک میں آئے دن کی شورشوں کا موجب ہوتا رہتا ہے اس لئے سب سے پہلے اس پیٹ کی آگ کا علاج ضروری ہے جس میں عقل و ایمان دونوں بھسم ہو رہے ہیں۔ یہ اطلاع غالباً آپ کے لئے قابل اطمینان ہو گی کہ سرکار عالی اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے اس غرض کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس نے اس مسئلہ پر غور کر کے اپنی تجاویز سرکار میں پیش کر دی ہیں مشورہ یہ ہے کہ مدارس

و کالجوں میں صنعت و حرفت اور پیشوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے۔ ممکن ہے کہ اس انجمن کے آیندہ سالانہ اجلاس تک اس کے متعلق کوئی احکام صادر ہو جائیں۔ مگر باوجود اس کے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ جب تک وہ اصل ذہنیت تبدیل نہ ہو گی جس کی بدولت ایک تعلیم یافتہ سرکاری ملازمت کے سوا کسی دوسری طرف رُخ نہیں کرتا ہے اس وقت تک صنعت و حرفت اور پیشوں کی تعلیم سے بھی شاید کوئی معتدبہ فایدہ کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے اب بھی وکالت ڈاکٹری اور انجنیری کے اسناد رکھنے والے سوائے ملازمت کے اپنے پیر پر کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پہلے یہ ذہنیت تبدیل کی جائے ملک کے عام حالات کے لحاظ سے میری رائے میں شاید اس غرض کے لئے زراعت و تجارت کی جانب رغبت پیدا کرنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے دوسرے پیشے زراعت و تجارت کے ساتھ خود بخود چلنے لگتے ہیں۔

تعلیم اور حیات قومی | اگر کسی طرح یہ موجودہ ذہنیت تبدیل اور مطمح نظر بلند ہو جائے اور علم محض علم کی خاطر سے حاصل کئے جانے کی رغبت پیدا ہو جائے تو ہم کو ضرورت ہو گی کہ ہم ایک مرتبہ پھر اپنے پورے نظام تعلیم خصوصاً نصاب کی نظرثانی کریں۔ مطمح نظر کے بلند و متعین ہو جانے کے بعد خود بخود آپ کو ایک مکمل تعلیمی پروگرام از سرنو مرتب کرنا پڑے گا آپ کے موجودہ نظام تعلیمی یا نصاب میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں قومیت کے خیالات کو پیدا یا پرورش کرنے کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

قومیت کا خواہ کوئی مفہوم لیا جائے یعنے خواہ بلحاظ ملک کے انسانی گروہ کو قوم کہا جائے یا بلحاظ کسی نسل و مذہب کے ہر حال میں کچھ قومی خصوصیات ہوا کرتی ہیں جن کا قائم رکھنا ہر مناسب حال تعلیم کا فرض ہے اگر دنیا میں بہ حیثیت قوم کے زندگی منظور ہے تو ضروری ہے کہ ان خصوصیات کو قائم رکھا جائے جو دوسری قوموں سے وجہ امتیاز قائم کرتی ہیں۔ قوموں کے خصائل و شمایل ان کے حیات کا اصلی راز ہوتے ہیں جن کی وجہ سے دنیا میں ان کو اعتماد و اعتبار اور ایک خاص درجہ حاصل ہوتا ہے اگر وہ جز آن سے الگ کر لیا جائے تو ان کی موت و حیات میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ بلاشبہ یہ خیال کہ قومیت کو مٹا کر انسانوں سے صرف انسانیت کے

ذریعہ سے تعلق اور واسطہ رکھا جائے ایک نہایت ہی خوشنما اور اعلیٰ درجہ کا خیالی فلسفہ ہے مگر جس قدر اس سے اعلیٰ خیالی کا اظہار ہوتا ہے اسی قدر وہ موجودہ زمانہ کے انسانی گروہوں کے افتاد طبیعت کے خلاف اور ناقابل عمل ہے اور اگر دنیا میں اس فلسفہ نے عملی حیثیت سے کہیں غلبہ پالیا تو وہ انسانی ترتیب و اصلاح کا آخری زینہ ہوگا اور اگر سچ مچ ایسا وقت دنیا میں آجائے تو وہ دنیا کے لئے انتہائی امن و آسایش کا زمانہ ہوگا لیکن محض اس خیال سے دل کو خوش و مطئن رکھنے سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا ہے۔ جب تک واقعی طور پر دنیا اس خیال پر عمل نہ کرنے لگے اس وقت تک خصوصیات قومی کو مٹا دینے کے معنے خود قوم کے فنا کر دینے کے ہیں اور یہ عمل کون و فساد اس عالم میں قوموں کے درمیان بڑے زور و شور سے جاری ہے۔ تعجب ہوگا اگر آپ کی آنکھیں اس نکتہ سے غافل رہیں۔

جب آپ اپنی قومی ضروریات اور خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر خود اپنا تعلیمی پروگرام اور نصاب تعلیمی مقرر کریں گے تب آپ کو حقیقی طور پر جامعہ عثمانیہ کی عظمت کا اندازہ ہو سکے گا اور اس وقت آپ کی جامعہ میں وہ روح اعظم جلوہ گر ہوگی جو اکسفورڈ کیمبرج لیپزگ ولیڈن و ٹوکیو کی یونیورسٹیوں میں کار فرما اور زندہ ہستیاں پیدا کرنے میں مصروف ہے جب تک آپ میں یہ حس پیدا نہ ہوگی کہ قوم کیا ہوتی ہے اور قومی خصوصیات و ضروریات کیا ہوا کرتی ہیں اس وقت تک آپ کی جامعہ عثمانیہ ایک مشین یا فیکٹری رہے گی جس سے زندہ اور جاندار مخلوق کے بجائے غیر ذی حس و غیر ذی ارادہ ڈھلے ہوئے مادی پتلے پیدا ہو سکیں گے اور ممکن ہے کہ وہ ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے بہ نسبت زیادہ سڈول اور زیادہ خوبصورت بھی ہوں لیکن بہر حال وہ بجائے اس کے کہ خود ملک کو آباد کریں ملک کے آباد کرنے والوں کے آفس ڈرائنگ رومس بچنس کی ضروریات و سجاوٹ کا کام دیں گے کیا آپ اپنے اس انتہا اور اس انجام پر قانع ہیں۔

تمدن و تعلیم کا تعلق | اقوام عالم کی تمدن کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے والا اس امر کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے کہ تمدن اور تعلیم اور تمدن و زبان کا باہمی تعلق کتنا قریبی ہے اگر ہم ایک کو استر سے مثال دیں تو دوسرے کو بلا تامل ابرا کہنا پڑے جس تمدن کو

آپ اپنی معاشرت کے لئے قبول کریں تعلیم اس کے دیا اثر رہے گی وہی تمدن اس تعلیمی دائرہ کا مرکز رہے گا جو آپ پر حاوی ہے اس طرح جس نظام تعلیم یا زبان کو آپ اپنی علمی زبان کے طور پر قبول کریں گے اس کے متعلقہ تمدن سے اثر لئے بغیر آپ اس علمی آسمان کے روشن ستارے نہیں بن سکتے جس کے زیر سایہ آپ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یہ وہ نکتے ہیں جو ان اقوام کی تاریخ سے اخذ کئے جا سکتے ہیں جو دنیا میں بن بن کر بگڑیں یا بگاڑی گئیں۔

تلقین درس اہل نظر یک اشارتیست
کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

مختصر یہ ہے کہ اگر ہم میں علم کو علم کی خاطر حاصل کرنے کا مذاق پیدا ہو جائے اور ہمارا مطمح نظر بلند و معین ہو جائے تو ہم کو اپنا نصاب تعلیمی اس طرح مرتب کرنا پڑے گا جو انفرادی اصلاح و تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ قومیت کی تعمیر کر سکے۔

منشاء و نتیجہ بیان لیکن جس طرح محض کھاد اور عمدہ اوزار بغیر تجربہ کار اور محنتی کاشتکار کے بے کار ہوتے ہیں اسی طرح ایک بہتر سے بہتر نظام تعلیمی بھی بغیر استاد کامل کے متوقع نتائج پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے بس انسان کو انسان بنانے اور قوم کی تعمیر کے لئے ایک کامل الفن استاد کی ضرورت مکمل نظام تعلیم اور بہترین نصاب سے مقدم اور اہم ہے اور یہی تقدم و اہمیت استادوں کی عظمت و رفعت شان کی دلیل ہے۔ اس طویل تقریر سے صرف یہ واضح کرنا منظور تھا کہ استاد کا مرتبہ اس دنیا میں کس قدر اعلیٰ و ارفع ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ استادوں کے اوصاف کی نسبت کس خاص بیان کی ضرورت نہیں ہے جب استاد کو میں اتنی بڑی عظمت و عزت کا مستحق سمجھتا ہوں تو اس کے اوصاف اور فرائض کی نسبت میرا کیا خیال ہوگا جو شخصیت جس قدر اعلیٰ و ارفع ہوتی ہے اسی قدر اس کی ذمہ داریاں اہم اور نازک ہوتی ہیں تعلیم ایک سانچہ ہے جس میں انسانی خصائل ڈھالے جا سکتے ہیں وہ ایک بھٹی ہے جس کے ذریعہ رذائل فنا کئے جا سکتے ہیں اور اس طرح ایک بہترین شمائل کا انسان تیار کیا جا سکتا ہے جس کے ہاتھ میں یہ سانچہ اور بھٹی دی جاتی ہے اس کی ذمہ داری کی اہمیت کے لئے کسی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح ایک بچہ اپنے ماں باپ کے اوصاف کا وارث

ہوتا ہے اس طرح ایک شاگرد اپنے اُستاد کے فضائل سے بھی حصہ پاتا ہے پس استاد کے انتخاب میں نہ صرف علمی ڈگری کو بلکہ استاد کے ذاتی فضائل اور اضافی اوصاف کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

اچھے استادوں کے انتخاب میں جو مشکل سدراہ ہے وہ یہ ہے کہ مدرسی و معلمی ایک پیشہ اور ذریعہ معاش بن گیا ہے اور ایک شخص جو یونیورسٹی کی ڈگری رکھتا ہے اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہے کہ اگر کسی اور طرف اس کو ملازمت نہ مل سکے تو وہ مدرس بنا دیا جائے حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ:-

ہزار نکتہ باریک تر زمُو ایں جا است
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

معاش کی تنگی کی وجہ سے ایک عام اضطراری کیفیت ایسی طاری کوئی شخص ملازمت کے معاملہ میں اس پر توجہ ہی نہیں کرتا ہے کہ آیا امیدوار اس خدمت کو کماحقہٗ انجام بھی دے سکے گا یا نہیں ہماری ضروریات زندگی حد سے بڑھ گئی ہیں معیار معاشرہ بلند و گران تر ہو گیا ہے اور ذرایع آمدنی تنگ و محدود ہیں اس لئے ایک اضطراری کیفیت کا پیدا ہونا لازمی ہے اور ظاہر ہے کہ اضطرار میں جائز و ناجائز و نیک و بد کا امتیاز باقی نہیں رہتا ہے اس لئے نتیجہ یہ ہے کہ صرف ڈگری مدرس کے لئے کافی سمجھی جانے لگی۔ ان حالات میں یہ توقع کرنا کہ ہر ایک شخص جو اُستاد کا پیشہ کرتا ہے حقیقی اور اصلی معنوں میں اُستاد ہوگا ایک خیال خام ہے۔

انجمن اساتذہ کا کام اور اثر ان خرابیوں کی اصلاح اور ایک استاد کو استاد بنانے کے لئے جو بہترین کوششیں ہو سکتی ہیں ان میں سے ایک ٹریننگ اسکول و کالج کا قیام ہے اور دوسرے خود اس انجمن کا وجود۔ اس انجمن نے استادوں کو فی الواقع اُستاد بنانے کے لئے جو جد و جہد کی ہے اس کا اندازہ ان مختلف کمیٹیوں کی رودادوں سے ہو سکتا ہے جو گزشتہ سنین میں تعلیم کے مختلف مضامین کے طریقہ تعلیم اور اس کے نقایص کی اصلاح کے لئے قائم ہوئی تھیں یہ رودادیں نہایت قیمتی مشوروں سے پُر ہیں جو طریقہ تعلیمی کے بہترین تجربوں کا نچوڑ ہیں۔ اگر

اِن مشورون پر استاد اپنی جگہ پر اور سر رشتہ تعلیم اپنی جگہ پر عمل کرنے کی کوشش کرے تو مجھے یقین ہے کہ ہمارا نظام تعلیم نہایت بارآور اور نتیجہ خیز ہو جائے گا۔

انجمن کی کارگزاری کی سالانہ رپورٹ آپ نے سماعت فرمائی ہے یہ امر قابل اطمینان ہے کہ انجمن اس سرگرمی اور جوش سے اپنا کام انجام دے رہی ہے جو انجمن کی بنیاد ڈالتے وقت ظاہر کی گئی تھی اگر چند سال تک سعی و کوشش میں یہی سرگرمی اور ترقی کی یہی رفتار رہی تو مجھے وہ دن دور نہیں معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ انجمن بجائے خود ایک ایسا علمی ادارہ بن جائے گی جس کے فیض سے ملک میں بہترین و کامل العیار استاد پیدا ہو سکیں گے ۔

دعا و خاتمہ | آخر میں میں معتمد صاحب انجمن کی ہم نوائی کرتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ یہ انجمن اساتذہ ہمیشہ ملک کی مفید تعلیمی خدمات انجام دیتی رہے اور جوش عمل کے ساتھ اہل ملک میں علم و ہنر کی روح پھونک کر ملک کو علمی ترقی کے اوج کمال تک پہنچانے کا ذریعہ بنے اور خدائے قادر و برتر ہمارے آقائے ولی نعمت تاجدار دکن حضرت سلطان العلوم حضور پر نور بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی کا سایہ عاطفت ہمارے سروں پر مدت مدید تک قائم رکھے آمین ۔

رپورٹ ذیلی کمیٹی متعلق تعلیم تاریخ در مدارس

مترجمہ جناب گنیش چند صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی مددگار مدرسہ فوقانیہ دار العلوم

یہ بات عام طور پر محسوس کی جارہی ہے کہ ہمارے مدارس میں تاریخ کی تعلیم کچھ تشفی بخش نہیں ہوتی۔ ہمارے طریقۂ تعلیم میں سب سے بڑا نقص پایا جاتا ہے کہ اس مضمون کی تعلیم دیتے وقت کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا۔ ہم سیاسی اور فوجی واقعات پر زور دے کر سماجی و معاشرتی پہلو کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ بادشاہ اور شاہنشاہوں کے نام لڑائیوں کی تفصیل، ممالک کے الحاق، اور صلح کے شرائط بلا غور و خوص رٹا دیے جاتے ہیں۔ زیادہ توجہ صرف الفاظ ہی پر دی جاتی ہے اور ان میں جو مضمر تصورات ہیں ان کے بیان کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ نصابی کتب ہمارے ماحول کے موزوں نہیں ہیں۔ دوسرے مضامین کے ساتھ اس مضمون کو متعلق کرنے کا بہت کم خیال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر تاریخ کے مدرس اس مضمون کے طریقۂ تعلیم سے واقف نہیں ہوتے اور جیسے چاہئے ویسے قابل نہیں ہوتے۔ اس رپورٹ میں چند اہم مشورے دے کر متذکرہ بالا خرابیوں کے انسداد کی کوشش کی گئی ہے۔

تعلیم تاریخ کا مقصد | تعلیم تاریخ کا یہ ابتدائی مقصد ہونا چاہیے کہ طلبہ کو مدنیت کی تعلیم دی جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدنیت کیا شے ہے؟ وہ اس معاشرتی تعلق کا ترقی پذیر احساس ہے جو تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان اور اس کے ہمسایہ کے درمیان باہمی تعلقات کو تقویت پہونچاتا ہے۔ ایک اچھے باشندہ کی ابتدائی زمانہ میں یہ تعریف ہوسکتی تھی کہ آیا اُس نے اپنے خاندان اور قبیلہ سے متعلقہ فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ نہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں اچھے باشندے کا اطلاق اُس شخص پر ہوسکتا تھا جو فرائض مذہب سے روشناس ہو۔ زمانۂ حال میں ایک اچھا باشندہ اس شخص کو کہا جائیگا جو اپنے ملک کے خاطر ہر قسم کے ایثار کے لئے آمادہ ہو۔ جنگ عظیم کے بعد کی دنیا نے مدنیت کا اعلیٰ ترین تصور یعنی بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہمارے پیش نظر کر دیا ہے۔ زمانۂ حال کے طلبہ کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ ہماری موجودہ تہذیب ایک مشترکہ مِلک ہے جس کا حصہ دار ہر انسان ہوسکتا ہے

لیکن بہ نیتِ عالم کا یہ تصور تمدنِ عالم میں ہمارے نمایاں کارناموں کو ہی ہم سے نابلد مملوک نہ کر دے اور وہ اس کی قدر کرنا سیکھیں اور اس پر فخر کریں۔ وہ یہ سمجھ لیں کہ وہ ان قدیم روایات کے وارث ہیں جو ان کے بعد آئندہ نسلوں کو اسی طرح ملتی رہیں گی اُنہیں ان کارناموں کو پڑھ کر جنہیں خواہ ہندو یا مسلمانوں یا انگریزوں نے اپنے اپنے دور میں رائج کیا مساوی طور پر ناز ہو سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر کے الفاظ میں؎ اس بات سے ہندوستانی قومیت کی ترقی کے بجائے اس کے ناپید ہونے کا احتمال ہے اگر ہندوستان کے مسلمان اشوک اور چندر گپت کی عظمت سے متاثر نہ ہوں یا غار ہائے ایجنٹا و ایلورہ کے لافانی فن مصوری کے نمونوں اور عدیم النظیر سنگ تراشی کو دیکھ کر ان کا دل غرور و مسرت سے نہ بھر جائے۔ یا جیدیو اور تکارام کی پر کیف نظموں سے وہ بلند تخیل سے متاثر نہ ہوں یا سری کرشن اور گوتم بدھ کے پر معنی اقوال سے گہری جستجو میں منہمک نہ ہوں۔ اور اس صورت میں بھی ہندوستانی قومیت کو عروج کی جگہ زوال ہوگا۔ اگر ہندوؤں پر تغلقوں اور عادل شاہوں کے لاجواب تعمیری نمونوں کو دیکھ کر ناز نہ ہو یا شیر شاہ اور اکبر جیسے حکمرانوں کی سیاسی تدابیر یا چاند سلطانہ اور نور جہاں کی سی بہادر بیگموں کی مردانہ شجاعت، یا محمود گاواں اور ابوالفضل کے سے آزاد رائے اور وفا شعار وزرا کا تدبر، یا البیرونی و فیضی جیسے علماء کا علمی تبحر، یا امیر خسرو اور غالب جیسے شعرا کی بلند خیالی دیکھ کر ان کے قلوب بجا غرور و تمکنت سے مسرور نہ ہو جائیں۔ یہ سب بھی قابل صد افسوس ہوگا اگر ہندو اور مسلمان دونوں کے دل سیوا اور رپن جیسے پاک اور اعلیٰ مقاصد والے ویسرائے یا منرو اور انفسٹن جیسے قابل منتظم، یا ناکٹ اور برائٹ جیسے ہمدردانِ ہند اور ہیئر اور مِلر جیسے مبلغین کو دیکھ کر متاثر نہ ہوں

لیکن اس قسم کے جذبہ حب وطن کو اندھی قومیت پسندی کے رتبہ تک نہ پہونچایا جائے بلکہ طلبہ کی توجہ موجودہ زمانہ کی ترقی پذیر حالات کی طرف منعطف کرائی جائے۔ بجائے اس خیال کو تقویت دینے کے کہ "میرا ملک خواہ غلطی پر ہو یا راستی پر میرا ملک ہے"۔ ان کو یہ سکھلایا جائے کہ جب وہ اپنے ملک کو راستی پر پائیں تو اس کی تعریف کریں اور اگر وہ غلطی پر ہے تو اظہار تاسف کریں۔ ان میں یہ احساس پیدا ہونا چاہیئے کہ حب الوطنی سے کہیں زیادہ بلند ایک اور جذبہ ہے جس کو ہمدردی بنی آدم کہتے ہیں۔

اگر اس طرح تاریخ پڑھائی جائے تو حقیقت میں بھی لدنی تعلیم ہے۔ اس سے طالب علم اپنے

اطراف واکناف کی دنیا کو بخوبی جان لیتا ہے۔ اور عہد ماضیہ کی روشنی میں زمانۂ حال کو اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے۔ اس کی نصفت پسندی ترقی کر جاتی ہے اور آئندہ زندگی میں وہ زیادہ اہم سیاسی مسایل پر تحقیقانہ نظر ڈال سکتا ہے۔ زمانۂ سلف کے بڑے سیاسی اور روحانی مصلحین کی قائم کردہ ایثار و وفاداری کی مثالیں طالب علم کے تخیل کو متحرک کرتی ہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ زندگی ایک مہم ہے اور فرض اس کا زبردست قانون اور یہ کہ وسعتِ حقوق اور حصولِ اختیارات سے ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

نصاب | ہمارے مقاصد کی کامیابی کا انحصار نصاب اور طریقۂ تعلیم پر ہے۔ آج کل تاریخ ہند کی تعلیم مدرسہ کی اکثر جماعتوں میں ہوتی ہے اور تاریخ انگلستان کی تعلیم طبقۂ فوقانیہ کے آخری دو سال کے لئے مخصوص ہے اول الذکر کو جماعت چہارم سے فوقانیہ کی جماعتوں تک لازم گردانا گیا ہے اور آخر الذکر کو صرف وہی طلبہ پڑھتے ہیں جن کا خاص مضمون تاریخ ہو۔ پس ہمارے مدرسوں میں کوئی باقاعدگی نہیں ہے۔ یہاں دو قسم کے مدارس ہیں۔ ایک وہ جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہے اور دوسرے وہ جہاں انگریزی میں تعلیم دی جاتی ہے۔ مدارس عثمانیہ میں جماعت ہائے فوقانیہ کے لئے دو سال کا نصاب متعین کیا گیا ہے اور انگریزی مدارس میں تین سال تک تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ جماعت ہائے فوقانیہ کے نصاب میں ایک اور سال کی توسیع کی جارہی ہے۔ اور ہمارا یہ خیال ہے کہ راہ راست کے جانب ہمارا یہ پہلا قدم ہے۔ اور قوی اُمید ہے کہ اس طریق پر ہمارے طرز تعلیم میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی۔ بلالحاظ اس زبان کے جس میں تعلیم دی جارہی ہے ہم خیال کرتے ہیں کہ کسی مضمون میں ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ اس قدر اہم نہیں جتنا تاریخ میں ہے۔ تجربہ اس امر کا شاہد ہے کہ جماعت ہائے فوقانیہ کے طلبہ نہ مضامین کو انگریزی میں سمجھ سکتے اور نہ وہ اس زبان میں اپنے خیالات کا ٹھیک طور سے اظہار کر سکتے ہیں اس لئے ہماری یہ رائے ہے کہ نہ صرف جماعت ہائے تحتانیہ میں بلکہ فوقانیہ جماعتوں میں بھی تاریخ طالب علموں کی مادری زبان میں پڑھائی جائے۔

متعلق جماعتوں میں نصاب کا تعین | ہم حسب ذیل نصاب کی سفارش کرتے ہیں۔

جماعت سوم :- تاریخ ہند کے قصص جو تاریخ دکن پر مشتمل ہوں۔

جماعت چہارم:۔ دکن کی تاریخ سے مختلف کہانیاں۔
طلبہ کے ماحول پر زیادہ زور دیا جائے۔ تاکہ طلبہ اپنے ہموطن بہادروں پر ناز کرنے لگیں۔ ان کا تقلیدی جذبہ متاثر ہو اور ان کا تخیل اور ہمدردی تقویت پائے۔

فرسٹ فارم:۔ تاریخ دکن اور متعلقہ تاریخ ہند۔
سکنڈ فارم:۔ تاریخ ہند۔ قرون ابتدائی د وسطیٰ۔
تھرڈ فارم:۔ ،، زمانہ موجودہ اور پچھلے حصوں کا اعادہ۔

اس تین سالوں میں مدرس کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ دکن کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ لیکن ساتھ ساتھ تاریخ ہند سے اس کے قریبی تعلق کو نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ مسلمان طلبہ کو ہندو معاشرت اور فنون کی قدر کرنی سکھلائی جائے اور ہندو طلبہ کو مسلمانوں کی تہذیب و علوم کے عزت کرنے کی تعلیم ہو۔

امتحان وسطانیہ کو موقوف کر کے ہم راہ راست پر گامزن ہوئے ہیں۔ اس سے اساتذہ کو مضامین کے انتخاب میں ایک حد تک آزادی برتنے کا موقعہ ملتا ہے اور امتحانوں سے ان کو مجبور ہونا نہیں پڑتا۔ طالب علم کے آگے مسلمہ واقعات پیش کرنا چاہے اور ایسے عنوان جس سے کسی قسم کی منافرت مذہبی ہو یا ملکی قطعاً نظر انداز کر دینی چاہیئے۔

فورتھ فارم۔ تاریخ ہند۔ عہد ہنود و اسلام۔
ففتھ فارم۔ ،، خاندان مغلیہ و انگریز۔
سکستھ فارم:۔ زیادہ تفصیل اور وضاحت سے جس کے ساتھ مدنیت، حالیہ انقلابات و تحریکات، اور حالاتِ حاضرۂ دنیا سے خصوصیت کے ساتھ واقفیت چاہے۔

اعلیٰ جماعتوں میں اُس سے زیادہ تفصیلی مطالعہ کی کوشش کرنی چاہے۔ پس پردہ ایشیائی امور کا لحاظ رہے۔ بیرونی ممالک جاوا و جزائر شرق الہند میں ہندو دھرم کی اشاعت تمام ایشیا میں بدھ مت کا پھیلنا، ہندوستان میں اشاعتِ اسلام، اور عرب و فارس کے ساتھ ہند کے قریبی تعلق کا بلحاظ جنگ و فتوحات مقابلہ کیا جائے، تو سبق نہایت دلچسپ ہوگا مدرسے سے نکلتے وقت طالب علم کے دماغ میں یہ خیال ہونا چاہے کہ ایشیائی تہذیب بھی کوئی

شئے ہے جو ایک زبردست یادگار ہے۔

قدیم ہندوستان میں یونان اور روما کے مابین جو گہرا تعلق تھا اس کو تبلا کر یہ زور دیا جائے کہ ان کے باہمی تعلقات کیسے تھے۔

زیادہ اہمیت ان سماجی معاشی اور سیاسی انقلابات پر دینی چاہیے جو گزشتہ سو سال میں ظہور پذیر ہوئیں۔ مرکزی حکومت کے متعلق تفصیلی تشریح ہو جس کے لئے ہم حسب ذیل نصاب کی سفارش کرتے ہیں:۔ ویسرائے اور اس کی کونسلیں، گورنر اور اس کی کونسلیں، وزرا اور ذمہ داران حکومت، مقامی حکومت کے اصول، لوکل بورڈ اور محابس صفائی کے فرائض دیسی ریاستوں اور برطانوی ہند کی طرزِ حکومت میں اختلاف اور حقوق۔ بدرسین وہ اہم تبدیلیاں جو جنگ عظیم کے سلسلے میں رونما ہوئیں اور اُن کے اثرات برطانوی دستوری حکومت پر۔ مجلس بین الاقوام اور اس کے سماجی معاشرتی اور اخلاقی کارنامے۔ اور اس کے فواید ہندوستان اور مغرب کے لئے۔

ہم نے تقریباً آٹھ سالہ تعلیم تاریخ کا خاکہ تیار کیا ہے۔ جس پر اگر اسی طرح عمل ہو جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے۔ تو یقین ہے کہ ہر لڑکا سولہ سترہ سال کی عمر میں نہ صرف دکن پر فخر کر سکے گا بلکہ ہندوستان سے دکن کا تعلق، ایشیا سے ہندوستان کا، و نیز برطانوی جمہوریہ اور دنیا سے تعلق سمجھ جائے گا۔

تاریخ ہند تمام طلبہ کے لئے لازمی ہے۔ اور تاریخ برطانیہ ان دو اعلیٰ جماعتوں کے لئے جو تاریخ کو اپنا خاص مضمون بنانا چاہتے ہیں۔ ہائی اسکول لیونگ کے امتحان میں تاریخ برطانیہ کا نصاب ابتدا سے موجودہ عہد تک رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ کے کسی عہد کا تفصیلی مطالعہ کرایا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے مدارس فوقانیہ میں تاریخ برطانیہ کی صرف دو سال تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اس لئے ہماری یہ رائے ہے کہ اس کو پڑھاتے وقت ہم کو صرف اس قدر خیال رہنا چاہیے کہ لڑکے تاریخ برطانیہ کے اہم واقعات اور اصول سے جن پر انگریزی ادارہ جات کی ترقی مبنی ہے واقف ہو جائیں۔ ہم اس لئے اس امر کی سفارش کرتے ہیں کہ عہد مخصوص کو نصاب سے بالکل علیحدہ کر دیا جائے۔ اس کے بجائے جملہ عہدوں کا ایک تفصیلی مطالعہ ہو اور

نصاب حسب ذیل ہو۔

ففتھ فارم۔ تاریخ برطانیہ ۱۶۰۲ء تک

سکستھ فارم۔ ۱۶۰۳ء کے بعد۔

لڑائیوں کی تفصیل نظرانداز کر دینی چاہیئے۔ اہم تحریکات اور انقلابات پر زور دیا جائے۔ نظام جاگیری۔ شخصی حکومت۔ پارلیمنٹ۔ اصلاح مذہبی پر زور دیا جائے اور مماثل ہندوستان کے واقعات سے اس کا مقابلہ کیا جائے۔ تاریخ انگلستان میں جدید تحریکات مثلاً رائے زنی کی اہمیت۔ قوانین متعلق فیاکٹری، و مسایل بے روزگاری غربا، پر اس وجہ اہمیت دی جائے کہ اپنے ملک کی مماثل اصلاحات کے جانب ہمدردی پیدا ہو۔ یہ ہماری پختہ رائے ہے کہ ایسے ملک کو جو کسی فوری سیاسی تبدیلی کا اضطراب کے ساتھ منتظر ہے انگریزی ادارے اور ان کے اصول کے متعلق وسیع معلومات کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ دنیا کے ہر ملک نے خواہ وہ اینگلو سیکسن ہو یا غیر اینگلو سیکسن اپنی سیاسی بیداری انگلستان کے ادارہ جات سے ہی حاصل کی ہے۔

طریق تعلیم تاریخ | آج کل عام طور پر مدارس میں تاریخ نصابی کتب سے پڑھائی جاتی ہے۔ کالج کے تازہ دم نکلے گراجویٹ لکچر دینے کے اس قدر عادی ہوتے ہیں کہ وہ طلبہ کو ساکت و صامت بیٹھے ہوئے اپنی تقریر سنانا چاہتے ہیں لیکن یہ طریق تعلیم مدارس کے لئے موزوں نہیں۔ نوٹس دئے جائیں یا دوسری کتابوں سے انتخاب کیا جائے تو طلبہ کو رٹنے کی عادت ہو جاتی ہے اس لئے مدرس کو ایک موزوں نصابی کتاب سے عمدہ طرز بیان کے ساتھ طلبہ سے سوالات کرتے ہوئے تختہ سیاہ اور دوسرے لوازم کی امداد سے تعلیم دینا چاہیئے۔ مگر ہمارے یہاں نہ تو کسی ملکی زبان میں یا انگریزی میں ہی کوئی عمدہ نصابی کتاب موجود ہے۔ کتاب کا مصنف نہ صرف اس زبان پر حادی ہو جس میں وہ لکھی جارہی ہے۔ بلکہ اس کو اس ملک کے چھوٹے حالات کا تفصیلی علم ہونا چاہیئے جس کے متعلق وہ لکھ رہا ہے۔ اور اس کو وہ تمام مقاصد مدنظر رکھنے چاہئیں جن کا ہم نے مقاصد کے تحت ذکر کیا ہے۔ اگر ایک اطالوی لڑکا جو پامپیائی کی تباہی اور اس کے اسباب سے قطعاً ناواقف ہے۔ اپنی نصابی کتاب سے چینی دیوتاؤں کے متعلق معلوم

کرلے تو یہ ایک صریح ناقابل قیاس اصل ہے۔ لیکن ہاں ہم ہمارے مدارس کے ہزاروں لڑکے ایسے موجود ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں کبھی قلعہ گول کنڈہ، ورنگل یا غارہائے الیورہ واجنتا دیکھا اور نہ ان کی تاریخی اہمیت پر دس سطر لکھ سکتے ہیں یہ کمیٹی پرزور سفارش کرتی ہے کہ جماعت ہائے تحتانیہ کے لئے جو تواریخ تصنیف ہوں وہ تاریخ دکن کے نقطۂ نظر سے ترتیب دی جائیں۔ ایسی کتابیں جن سے کسی قسم کے پروپاگنڈا کا اندیشہ ہو مسدود کردی جائیں۔ اس لئے نصاب پر داخل ہونے سے پیشتر ایک بورڈ اس کتاب کی اہمیت پر غور کرے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ انگریزی اور مقامی مادری زبانوں میں مثلاً تلنگی مرہٹی، کنڑی وغیرہ میں نصابی کتب طریقۂ ذیل ذیل پر مترتب ہوں۔

جماعت سوم۔ تاریخ دکن اور تاریخ ہند کی مختلف کہانیاں۔

〃 چہارم۔ تاریخ دکن سے مختلف قصص۔

فرسٹ فارم۔ دکن کی مختصر تاریخ اور اس سے متعلقہ تاریخ ہند

سکنڈ فارم }
تھرڈ فارم } تاریخ ہند معہ مفصل تاریخ دکن۔

فورتھ ففتھ وسکستھ فارم۔ تاریخ ہند۔

دوسرے مضامین کے ساتھ تاریخ کا تعلق | جب تک کسی مقام کے جغرافی حالات سے واقفیت نہ ہو اُس وقت تک وہاں کی تاریخ عمدگی سے سمجھ میں نہیں آتی ملک کی عام ساخت، دریا اور پہاڑوں کے محل وقوع، معدنی دولت اور اس کی تقسیم، قربتِ سمندر، وغیرہ نے ہر ملک کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ لڑائی کے میدانوں کا تعین اور خانہ بدوش اقوام کے حمل ونقل میں جغرافیہ کا بہت دخل ہے۔ طبقۂ تحتانیہ میں مدرس تاریخ، جغرافیہ کی بھی تعلیم دے۔ ادب کے اساتذہ سے بھی تاریخ میں دلچسپی پیدا کرنے کی بہت مدد مل سکتی ہے۔ کیونکہ ملک کی تاریخ اس کے ادب میں مضمر ہوتی ہے۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ پر سنسکرت کی تھوڑی سی واقفیت کے بغیر دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح قرون وسطیٰ کی ہندوستان کی تاریخ جاننے کے لئے فارسی [illegible] یا تامل زبانوں پر حاوی ہونا ضروری [illegible]

دستگاہ کی ضرورت ہے۔ ہماری تہذیبی یکسانیت کے حصول مدعا کے لئے ترقی کی ایک منزل طے ہوگی اگر ہر مسلمان لڑکا کم از کم کسی ایک ہندو ملکی زبان پر حاوی ہو جائے۔ اور ملک کا ہر ایک ہندو لڑکا حسب عملدر آمد قدیم تحصیل فارسی سے گریز نہ کرے۔

مدنیت | تاریخ سے متعلق ایک دوسرا اہم مضمون مدنیت ہے۔ امریکہ کے اکثر مدارس میں اس کی تعلیم بجود ایک علٰحدہ مضمون کی طرح ہوتی ہے لیکن ہمیں فی الوقت المانیہ اور برطانیہ کے نقش قدم پر چلنا مناسب ہے

اسباق تاریخ کے ہمراہ مدنیت کی تعلیم دی جائے۔ ابتدائی جماعتوں سے خاندان دیہہ مذہب اور دوسرے ہشکل اجتماعوں کے متعلق افراد کے جو فرائض ہیں ان کو ذہن نشین کرایا جائے۔ طبقۂ وسطانیہ میں اقتدار اعلیٰ، حکومت اور حکمران وقت کے ساتھ وفاشعاری کا تصور، و نیز تعلیم حفظان صحت اور محکمۂ صفائی کے متعلق ابتدائی تصورات کا بھی علم ہونا چاہیئے اجتماعی کام کی اہمیت پر زور دیا جائے۔ اور مشاغل مدارس میں اس کے لئے عملی کام کا موقعہ عطا ہو۔ طبقۂ فوقانیہ میں مدنیت، اقتدار اعلیٰ، و نیز مرکزی و مقامی حکومت کے فرائض، حقوق اور اس کی تنظیم کے متعلق تصورات کی تفہیم کرائی جائے۔ فی الحال حیدرآباد کی مدنیت کے متعلق ہمارے ذرائع معلومات بیشتر رپورٹ ہائے نظم و نسق سرکار عالی ہیں جو مدرس کو بسہولت دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اُن سے ہمیں مرکزی و مقامی حکومت کی ترتیب و تنظیم، زمانۂ حال میں ہماری ملکی مدنی ترقی اور سرکار عظمت مدار اور ہماری ریاست ابدمدت کے درمیان تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔

تعلیم تاریخ میں دارالتجربہ کی اہمیت اور ضرورت | زمانۂ حال میں سائنس کی تعلیم میں غیر معمولی تبدیلیاں ہوئی ہیں سائنس کے لئے ایک علٰحدہ کمرہ ہوتا ہے اور اس میں دارالتجربہ کی تمام ضروریات مہیا کی جاتی ہیں۔ لیکن معلم تاریخ کے لئے کوئی علٰحدہ کمرہ نہیں ہوتا۔ اور اس کو محض تختہ سیاہ پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اس عنوان کے تحت مدرسین کی توجہ ان مضامین کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے جو بسلسلۂ ٹائمز ایجوکیشنل سپلیمنٹ کے اشاعت جنوری و فبروری ۱۹۳۲ء میں طبع ہوئے ہیں۔ پس تاریخ کے لئے ایک علٰحدہ کمرہ جس میں جملہ متعلقہ تاریخی ساز و سامان ہو

متعین ہونا چاہیئے۔

تصاویر | چند تصاویر جن سے ہندوستانیوں کو دل چسپی ہو نمونتاً کمروں کی دیوار پر آویزاں رہیں۔ ہندوستانی صنعت و دستکاری کے متعلق میکملن کمپنی نے چند تصاویر نہایت کم قیمت پر طبع کی ہیں۔ ممالک محروسہ کے تمام مدارس میں محکمۂ آثار قدیمہ کے پوسٹ کارڈ سایز کی تصاویر موجود رہنی چاہیئے۔ ان کو فریم کرکے کمرۂ تاریخ کی دیواروں پر آویزاں کیا جاسکتا ہے۔ کمرۂ تاریخی میں طبقۂ فوقانیہ کے لئے ایجنٹا کی صنعت و پچہ کاری کا عکسی فوٹو زیب دیگا۔ طبقۂ تحتانیہ کے لئے تصاویر کی کافی تعداد چاہیے۔ طالب علموں میں انڈین پکٹوریل ایجوکیشن اور دوسرے مصور رسالوں سے تصاویر کاٹ کر نوٹ بک اورالبموں میں چسپاں کرنے کا شوق پیدا کیا جائے۔

نقشہ جات | تعلیم تاریخ کے لئے تاریخی نقشہ ناگزیر ہے۔ دکن کے چھوٹے نقشے جن میں تیسری صدی عیسوی کا سیاسی نقشہ عہد اندہرا، ساتویں صدی کے عہد چالوکیہ، نویں صدی میں عہد راشٹر کوٹ، تیرہویں صدی میں جادونبی، کاکتیہ اور ہوسالا خاندان، سلطنت بہمنی اور اس کے انتشار پر پانچوں سلاطین کی حکومت کے نقشے، اور عہد جدید کا ایک نقشہ، انگریزی اور ممالک محروسہ کی جملہ مادری زبانوں میں طبع ہونا چاہیئے۔ ہندوستان اور انگلستان کے تاریخی نقشوں کی سفارش کی جاتی ہے۔ جو میکملن کمپنی سے سستے داموں مل سکتے ہیں۔ جنگ عظیم کے قبل کے مطبوعہ نقشوں کے بجائے حالیہ نقشوں کا استعمال ضروری ہے۔ لانگمین گرین کمپنی کا مطبوعہ نقشہ بین الاقوامی مدرس تاریخ کے لئے بیحد مفید ہے۔ نقشہ کی علیحدہ کاپیوں میں طلبہ سے نقشہ نکالنے کی مشق کرائی جائے۔ اور ان پر توضیحی نوٹ تحریر کرائے جائیں۔

نمایش گاہ مدرسہ | اعلیٰ قسم کی تحقیق وتفحص کلیہ سے متعلق ہے۔ لیکن مدارس میں تجسس کا شوق اور آثار قدیمہ سے دل چسپی اور انہماک کا ذوق پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ممالک محروسہ میں آثار قدیمہ کے بہترین مقامات ہیں تقریباً ہر مدرسہ کے قرب وجوار میں سنگ پر نقش کتبات پائے جاتے ہیں۔ مختلف شہروں میں تاجروں سے قدیم اوردل چسپ سکہ دستیاب ہوسکتے ہیں۔ بعض دیہات میں خوبصورت دستکاری کے شکستہ نمونے پائے جاتے ہیں۔ اگر مدرسہ میں ایک مختصر تاریخی نمایش گاہ ہو تو مدرس کو ان کے اجتماع کا شوق پیدا ہوگا طالب علموں کو اس میں اضافہ کرنے میں فخر ہوگا۔

طرز قدیم کی مصوری، ازمنہ وسطیٰ کے لباس اور اسلحہ، اور پتوں پر کی قدیم تحریرات کماحقہ تھوڑی قیمت پر حاصل ہوسکتی ہیں کتبات کی تحریر کو پڑھنا بھی طلبہ کے لئے ایک اچھا مشغلہ ہے۔ مدرس یہ بھی دیکھ لے کہ طالب علموں نے اس ذخیرہ کی تاریخی اہمیت سمجھ لی ہے یا نہیں۔

تعلیمی تفریح | تعلیمی تفریح سے تفحص و تجسس کا ذوق ترقی پاتا ہے۔ بائز اسکوٹ کی تحریک تعلیمی تفریح کی ممد ہے لیکن ہر دو کے مقاصد مختلف النوع ہیں۔ بائے اسکوٹ کا مقصد ورزش جسمانی ہوتا ہے اور اسکوٹنگ کی مختلف آزمائشوں کی کھلی ہوا میں مشق بعض لوگ محض لطف و تفنن کی غرض سے تفریح کے لئے جاتے ہیں لیکن تاریخی تعلیمی تفریح کا ایک معینہ مقصد ہوتا ہے۔ اگر مدرس اس مقام سے ناواقف ہو جہاں وہ بچوں کو تعلیمی تفریح کے لئے لے جانے والا ہے تو ایسی تفریح سے تو کوئی مفاد ہی نہیں۔ مدرس کو تعلیمی تفریح کا ایک نظام العمل بنالینا چاہیئے اس کو قبل از قبل تمام مقامی رہنما کتب دیکھ لینی چاہیئے۔ تفریح سے پہلے ہی طلبہ تمام متعلقہ تاریخی واقعات سے واقف ہو جائیں کسی مدرس کے ساتھ پندرہ سے زیادہ تعداد طلبہ نہ ہو۔ اگر طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو تو مدرسین کی تعداد میں بھی تناسباً اضافہ چاہیئے۔ طلبہ کو مختلف فریق میں تقسیم کردیا جائے تفریح سے واپسی پر طلبہ کو اپنے تجارب تحریر کرنا چاہیئے تاکہ مدرس کو یہ اطمینان ہوسکے کہ انہوں نے کوئی نئی بات سیکھی ہے یا نہیں۔ موازنۂ مدارس کے مصارف معمولی میں چند مقامات مثلاً الیورہ، ایجنٹا ورنگل، گلبرگہ اور گولکنڈہ کی تعلیمی تفریح کے لئے ایک قلیل رقم منظور ہونی چاہیئے جو ہر سال ایصال ہو سکے۔

تاریخی کتب خانے | سر فلپ ہارٹگ نے اپنی حالیہ رپورٹ میں اس امر کے جانب توجہ منعطف کرائی ہے کہ طلبہ کے پاس کتب کی تعداد کم ہوتی ہے۔ شاذ ہی مدرس طلبہ کو شوق مطالعہ کی ہدایت دیتے ہیں اور بیشتر خود ہی کم عالم ہوتے ہیں امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کی خواہش طلبہ اور ان کے والدین پر غالب رہتی ہے۔ ہر مدرسہ کے لئے ایک مہذب لائبریری کی ضرورت ہے اور کتب خانہ کے لئے مستعینہ رقم کے منجملہ سالانہ تاریخ کے لئے تناسباً ایک تعداد میں ہونی چاہیئے مدرس کے مطالعہ کے لئے تاریخ ہند و انگلستان کی حالیہ کتب، دنیا کے حالات حاضرہ پر چند کتب اور نیز طریقۂ تدریس کی کتب، مدرسہ میں مہیا ہونی چاہیئے۔ مدرسہ کے طلبہ کے لئے چند موزوں کتب اور

ہر کتاب کے متعدد نسخے فراہم کئے جائے۔ ایسے مدارس میں جہاں موزوں کتب خانہ ہے طلبہ اس کا صحیح استعمال نہیں جانتے۔ مدرسین طلبہ کو یہ بتلائیں کہ کون سے کتب میں ان کے مطلوبہ معلومات کا کافی ذخیرہ ہے اور ان کتب کے کن حصوں کا مطالعہ مناسب ہے۔ وقتاً فوقتاً تعلیم تاریخ کے ساعات سے ایک ساعت لائبریری کے لئے علیحدہ کردی جائے۔ تاکہ ان کو کتب خانہ کے استعمال کا صحیح طریقہ معلوم ہو اور نیز یہ کہ کتب کی آخری فہرست کے مطالعہ سے کیا فوائد ہیں۔

تاریخی ذوق کے نشو و نما اور طالب علم کے تخیل کو ازمنۂ ماضیہ تک منتقل کرنے میں ماخذی کتب خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تاریخ انگلستان کے لئے متعدد ماخذی کتب ہیں تاریخ دکن و ہند کے ماخذی کتب کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ مناسب ہوگا اگر تاریخ دکن پر جدید ماخذی کتب تالیف کی جائیں۔

ایسی تاریخی کتب کی ایک انگریزی فہرست جو ہمارے مدارس کے لئے موزوں ہوسکتی ہیں۔ منسلکہ ہٰذا ہیں۔

تاریخی ناٹکیں کرنی، عہد ہائے ماضیہ کے لباس کا مظاہرہ، طلسمی فانوس اور (Stereo scope) اسٹراسکوپ کا استعمال تعلیم و تدریس میں تفہیم کے مناسب اور مفید ذرایع ہیں لیکن ان کی کامیابی کا انحصار بیشتر مدرس پر ہے۔ اگر مدرس بے ساز و سامانی کے ساتھ یہ کام شروع کردے تو بجز مضحکہ کوئی مفاد نہیں۔

امتحانات نصاب اور طریقۂ تعلیم کے متعلق ہماری تحریکات کی کامیابی کا انحصار بیشتر امتحانات پر ہے اگر سررشتۂ تعلیمات ہماری اسکیم کی تائید کرے تو اختتام تعلیم مدرسہ پر صرف ایک سرکاری امتحان ہوگا جس میں بزبان انگریزی و اردو مشترکہ پرچہ جات ہوں گے۔ تمام دنیا میں مرض امتحان پھیلا ہوا ہے اور آزمائش کے دوسرے بہتر طریقوں کا فی الحال عدم وجود، امتحان کو لاحق اور ناگزیر بنادیتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ممتحن اور امتحانات تعلیم کو ایک بے لطف مشغلہ بنادیتے ہیں۔ اگر تاریخ ہند کے سوالات اس طرح منقسم ہوں کہ طالب علم تین سو سال کی تاریخ کے مطالعہ سے مقررہ تعداد سوالات کا جواب ادا کرسکے۔ تو مدرس دوسرے عہود کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے

ممتحنین کی ایک مجلس کا قیام ضروری ہے جو یہ دیکھ لیں کہ آیا پرچہ مقاصد تعلیم تاریخ کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔

معلم تاریخ ہمارا مقصد تعلیم، نصاب، طریقۂ تعلیم اور امتحانات کا طریقہ نظری طور پر کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو اگر معلم جیسا چاہیئے ویسا نہ ہو تو نتائج لازماً غیر تشفی بخش ہوں گے۔

بعض حلقوں میں یہ خیال جاگزیں ہے کہ دو دن کی تیاری کا موقعہ دیا جائے تو ہر کس و ناکس تاریخ کی تعلیم دے سکتا ہے۔ طالب علم اور مدرس میں صرف یہی فرق ہوتا ہے کہ اول الذکر کا موخر الذکر کی نسبت نصابی کتاب کا مطالعہ چند صفحوں تک زیادہ ہوتا ہے۔ حتی الامکان اعلیٰ جماعتوں میں تاریخ کا مدرس ٹرینڈ گراجویٹ ہو جہاں اس مشاہرہ پر ٹرینڈ ایم۔ اے یا ٹرینڈ آنرز گراجویٹ دستیاب ہو سکیں تو لازماً ان کو ترجیح دی جائے۔ اگر ٹرینڈ گراجویٹ کمتر مشاہروں میں ملازمت کے لئے آمادہ ہوں تو طبقۂ وسطانیہ میں بھی ان کا تقرر کیا جائے۔

مدرس کو اپنا سبق نہایت احتیاط سے تیار کرنا چاہیئے۔ اس کی نوٹ بک سے یہ بھی پتہ چل سکے کہ نوٹس کے لکھنے سے پیشتر اس نے کن کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ نیز نوٹس سے یہ بھی مترشح ہو کہ اوائل سبق میں وہ تفہیم کے لئے کیا ذرائع کام میں لائے گا اور طلباء سے کون سے سوالات کرے گا۔ سال بسال تازہ مطالعہ اور تجربات سے نوٹس میں اس نے کیا تبدیلیاں اور اضافہ کیا ہے اس کا بھی اندراج ہونا چاہیے۔ نوٹس صرف امداد کے لئے ہیں تاکہ مدرس کے پاس خاکہ ہو اور وہ نفس مضمون سے کہیں بھٹک نہ جائے۔ طالب علموں کو وہ نوٹس تحریر نہ کر دئے جائیں اور نہ ان کو یہ معلوم ہو کہ مدرس نوٹس دیکھ کر کہتا جا رہا ہے۔

لکچر دینے کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ مدرسہ کے لئے لکچر دینے کا طریقہ مناسب نہیں ہے اکثر یہ لکچر طلبہ کی تفہیم اور استعداد سے بڑھ جاتے ہیں۔

معلم کے لئے میرا اندیشہ ہے کہ وہ کہیں قدیم طریقۂ تعلیم کا زیادہ پابند نہ ہو جائے۔ مدرسہ میں روزانہ پانچ ایک ساعت کا کام، کھیل اور اسکوٹنگ کی ذیلی ذمہ داریاں اور خانگی ٹیوشنوں کی بہتات جس کی روک تھام محکمہ کے جانب سے ہونی چاہیے مدرس کو معلومات جدیدہ سے پرے رکھتی ہیں۔ اساتذہ کو ان کے مضامین کی حد تک جدید انکشافات کے علم کے لئے وقتاً فوقتاً تازہ

یا د اسباق کے انعقاد کی ضرورت ہے ترتیب لائبریری جغرافیہ و مدنیت کے متعلق تعطیلاتی مدارس کا قیام عثمانیہ ٹرینگ کالج میں ضروری ہے محکمہ کے جانب سے مدرسین کو ایسی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں کہ وہ ان جماعتوں میں شریک ہوسکیں۔ اساتذہ کو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں سفر کرانے اور ان مدارس کی تعلیمی حالت کے معائنہ کا موقعہ عطا کیا جائے۔ جہاں تازہ ترین طریقۂ تعلیم کامیابی کے ساتھ رواج پایا ہے۔

اساتذہ کی سالانہ کانفرنس کے اختتام پر مدرسین تاریخ کی ممالک محروسہ کے دلچسپ مقامات کی تعلیمی تفریح کا انتظام ہو۔

نوجوانوں کی تربیت میں معلم کی شخصیت نہایت موثر ہوتی ہے۔ اگر مدرس میں مستعدی اور کارکردگی کا شعلہ نور افگن ہو۔ تو اس کی تجلی سے طلبہ کا دماغ بھی روشن ہوگا۔ لیکن مدرس کے مسن ہونے پر اس برقی قوت کے زائل ہونے کا امکان ہے۔ مناسب ہوگا اگر مدرس اپنا محاسبۂ نفس کرے اور یہ تحقیق کرلے کہ کہیں جوان عمری کے نصب العین کا تموج زندگی کی ناکام مساعی اور حرص میں طوفاں شکن نہ ہوا ہو۔

اراکین ذیلی کمیٹی | پروفیسر ہنمنت راؤ صاحب ایم۔اے۔ ایل۔ٹی (صدرنشین)
جی۔اے چنداورکر صاحب۔ ایم۔اے (معتمد) مولوی سید مجتبیٰ حسین صاحب نقوی۔ مولوی سید فخرالحسن صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔ گنیش چند صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔ ایم ہنمنت راؤ ایم۔اے۔ ایل۔ٹی۔ مولوی محمد یوسف صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔ مولوی شیخ علی حسین صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔ دیوسکر صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔ ڈنگر نارایں صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔

رپورٹ سب کمیٹی ریاضی

مترجمہ عبداللطیف حسنابی۔ اے۔ بی۔ ٹی مددگار مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ

علم حساب پر سب میں پہلی قابل لحاظ کتاب تقریباً چار سو برس پہلے انگریزی زبان میں لکھی گئی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو ضروری معلوم ہوا کہ اس کا سبب تصنیف بتایا جائے۔ چنانچہ اُس نے اس مضمون کو ذیل کے مکالمے کی شکل میں پیش کیا۔

اُستاد:۔ "اگر عدد ایسی ہی نجس چیز ہے جیسی کہ تم سمجھتے ہو تو ہم کو اپنی روزمرہ کی گفتگو میں اس کا اتنا استعمال پیش کرنا چاہیئے۔ اچھا اب تم عدد کا نام نہ لو اور میرے اس سوال کا جواب دو کہ تمہاری عمر کیا ہے؟"

طالب علم۔ گم سُم۔

اُستاد:۔ "ہفتے میں کتنے دن ہوتے ہیں؟۔ تمہارے باپ کے پاس کتنی زمین ہے؟۔ اور اس کے پاس کتنے آدمی ہیں؟"

طالب علم۔ گم سُم۔

اُستاد:۔ "تو معلوم ہوا کہ جب کبھی عدد کی ضرورت ہوگی تم کو جواب میں گم سُم رہنا ہوگا۔"

لیکن آج اس مضمون پر بحث کرنے کے واسطے اتنی وکالت کی ضرورت نہیں۔ اس کی اہمیت ہر جگہ مسلم ہے اور مدرسہ کے نصاب کے کسی اور مضمون کی طرف زمانہ حال میں شاید ہی اتنی توجہ کی گئی ہو۔ ۱۹۰۰ء میں امریکہ میں علم حساب پر مطبوعہ علمی کتابیں صرف ۳۰ تھیں اور ۱۹۲۹ء میں ان کی تعداد ۵۰۰ ہوگئی۔ اس تمام تحقیق اور تدقیق کے نتائج کیا ہیں؟ اس کا جواب مختصر یہ ہے کہ اس سے اس مضمون کی طرف ہمارے ذہن کا ایک نیا طرز عمل پیدا ہوگیا ہے۔ اب ریاضی کا مفہوم یہ نہیں کہ خالی خولی اعداد سے کھیلنا آجائے بلکہ ریاضی ایک ہتھیار ہے جس کی مدد سے زندگی میں واقع ہونے والے تمام مقداری تعلقات پر قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اب مقصود یہ نہیں کہ ریاضی داں پیدا کئے جائیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ایسے آدمی پیدا کئے جائیں جو موجودہ زمانے کی ضروریات کے حریف ہو سکیں۔

اب مضمون کے سماجی افادے کو روز بروز زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے۔

"استعمالی ریاضی" کا نام لیتے وقت ایک بات یاد رکھنی چاہیئے۔ اندیشہ ہے کہ اس سے مراد ریاضی کا وہ استعمال سمجھا جائے گا۔ جو عام آدمی اپنے روزمرہ کے کاروبار میں کرتے ہیں۔ یہ کہا جائیگا کہ "عام آدمی اپنی روزانہ زندگی میں حساب کے چند آسان قاعدے استعمال کرتا ہے اور بس۔ اس طرح اس سے زیادہ علم حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے"۔ یہ خیال گمراہ کن ہے اور اس سے جو لازمی نتیجہ پیدا ہوتا ہے اگر اُس پر عمل کیا جائے تو اس سے تعلیم کی ساری عمارت منہدم ہو کر رہ جائیگی۔

ماہر تعلیم کو صرف یہی نہیں سوچنا چاہیئے کہ ایک اوسط آدمی کیا جانتا ہے بلکہ یہ بھی کہ اُسے کیا جاننا چاہیئے۔ مثلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک آدمی کو اُس کے ذاتی معاملات میں فی صدی کے حسابات کی ضرورت نہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا علم اُسے روپیہ کو ضائع کرنے سے بچائیگا مثلاً اگر لوگوں کو فی صدی کے مطلب کا زیادہ صحیح علم ہو جائے تو وہ چیزیں اقساط پر ہرگز نہ خریدیں۔ اقساط پر بیچنے والوں کو یہ حساب معلوم رہتا ہے خریداروں کو نہیں رہتا"۔

اسی طرح اگر لوگوں کو لین دین کا علم اچھی طرح ہو جائے تو وہ چھوٹے موٹے ساہوکاروں سے کبھی معاملہ نہ کریں جن کی شرح سود تباہ کرنے والی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ کافی ریاضی جانے بغیر آدمی آج کل کی دنیا میں کافی باخبری اور دلچسپی کا اظہار نہیں کرسکتا۔ کوئی اخبار اُٹھاؤ اُس میں سرکاری قرضہ جات، جنگ کے قرضے، محاصل، اعداد و شمار وغیرہ کا ذکر ہوگا اور کوئی آدمی سوسائٹی کا ایک کارآمد فرد نہیں بن سکتا جب تک کہ ان امور کی اصلیت اور غایت کو نہ سمجھے اور ان پر اپنی رائے قائم نہ کرسکے۔ اور اس کے لئے اُسے حساب اوسط، سود فیصدی اور دیگر حسابات کی ضرورت ہوگی جنہیں ایک "علمی" آدمی (یعنی وہ آدمی جو ہر چیز کے عملی مفاد پر زور دیتا ہے) بے کار کہہ کر نصاب سے خارج کردینا چاہے گا۔ نصاب کے مسئلے سے بحث کرتے وقت اس وسیع استعمال کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

ریاضی کے مطالعے سے ایک اور عملی فائدہ بھی ہے۔ یہ ایسا مضمون ہے جس میں طالب علم کے سامنے ہر دم ایک نیا مسئلہ آتا ہے اور ہر وقت ایک ایسا سوال جس کو وہ محض آنکھ بند کرکے اپنی گذشتہ معلومات کو استعمال کرکے حل نہیں کرسکتا بلکہ نئے سرے سے سوچنا اور صحیح قاعدے

صحیح استعمال کرنا ہوگا. نصاب کی کتاب میں جو سوالات ہوتے ہیں اُن کا حقیقی فائدہ اُن کے ظاہری حل سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو اس سے کیا کہ ایک فرضی ریل گاڑی ایک فرضی مسافت کتنی دیر میں طے کرے گی لیکن اگر اس سوال کے حل کرنے میں طالب علم زندگی کے ضروری مسائل کو جو اُس کو پیش آئیں گے حل کرنے کے لئے تیار ہو رہا ہے تو سمجھیئے کہ ریاضی کا پورا پورا سماجی افادہ حاصل ہوگیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم کا عام طور پر اور ریاضی کا خاص طور پر امتیازی کام یہ ہے کہ زندگی کے مسائل میں صحیح استدلال کرنے کی قوت پیدا کرے۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر طالب علم کے سامنے ریاضی کے مسائل اور اُن کے حل کرنے کے مختلف طریقے بھی اسی ضرورت کے لحاظ سے پیش کرنے ہوں گے۔ اور ہم کو یہ بھی نظر آئے گا کہ علمی ریاضی سے ہر اُس مسئلے کو نہیں خارج کر دینا چاہیئے جس کا ہمارے روزمرہ کے کاروبار سے راست تعلق نہ ہو۔

طریقے کمیٹی حیدرآباد ٹیچر کے مدیر کی شکر گزار ہے کہ انہوں نے جاریہ نمبر میں اس مضمون پر دو مقالے شائع کئے ہیں۔ طوالت کے خوف سے اُن کو ہم یہاں نقل نہیں کر سکتے لیکن وہ کمیٹی کی درخواست پر ہی لکھے گئے تھے اور اُن کو اس رپورٹ کے سلسلے میں پڑھنا چاہیئے۔ ان میں بہت سا قیمتی مواد اور بہت سے مفید مشورے درج ہیں۔ یہاں اتنا کافی ہے کہ ان میں "طریقے" کے متعلق جن بڑے نکات سے بحث کی گئی ہے اُن کو مختصر طور پر بیان کر دیا جائے۔

۱۔ حساب کے عملوں کو ہمیشہ مادی اور حقیقی صورتوں سے استخراج کرنا چاہیئے۔ اس کی بہت بڑی اہمیت ہے اور اس پر جتنا زور دیا جائے کم ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بچے کو صرف قاعدہ بتا دیا جاتا ہے جس کو وہ مشین کی طرح استعمال کرتا رہتا ہے۔ اس طرح طالب علم حقیقی دنیا سے بالکل دور جا پڑتا ہے اور عملی میدان زندگی سے ناآشنا رہتا ہے۔ ایک مدرسے میں بچے تعزیت کے مشکل سے مشکل حساب کر سکتے تھے لیکن جب سوال کیا گیا کہ ۵۰ بکریوں کے ایک گلے میں سے ۷ کو علیحدہ کر لیا جائے تو کتنے باقی رہیں گے تو وہ جواب نہیں دے سکے۔ اس سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ خالی قاعدوں کا سکھا دینا کتنا بے کار ہے۔ اگر قاعدے کو اشیا کے ذریعے باقاعدہ اخذ کیا جائے تو قاعدہ بچے کے ہاتھ میں ایک آلہ بن جاتا ہے۔ گنتی اس طرح سکھائی جا سکتی ہے کہ اس کی آغاز انگلیوں سے، جماعت کے بچوں اور کمرے کے (ڈیسکوں) (

کو گن کر کیا جائے۔ باغ اطفال میں بچوں کو بیجوں کی جو ڈھیریاں لگانی پڑیں گی اُن سے خود ضرب اور تقسیم کے عمل کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ اوپر کی جماعتوں میں بہت سے قاعدے اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ چیزوں کو دراصل ناپا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ اسی طرح کا ربط ایسی بہت سی صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ مساحت کے بعض سبقوں کو مکان سے باہر میدان میں دینا مفید ہوگا۔ طالب علم خود قدم سے فاصلے ناپ سکتے ہیں مثلاً مربع میں وتر اور ضلع کی نسبت اس طرح معلوم ہو سکتی ہے اور زمین پر ایک بڑا ذو اربعۃ الاضلاع کھینچ کر اُس کا رقبہ ناپا جا سکتا ہے۔ بلندیاں معلوم کرنے کے لئے ایک سادہ ڈھال نما استعمال کیا جا سکتا ہے۔ زمین پر ایک آئینہ رکھ کر اُس سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کہ ایک لڑکا آگے پیچھے ہٹ کر ایسی جگہ کھڑا ہو کہ آئینے میں ڈنڈے کے سرے کا عکس دیکھ سکے۔ اس کے بعد مثلث کھینچ کر ڈنڈے کی بلندی محسوب ہو سکتی ہے اور بعد میں ناپ کر اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ــــ (حیت) کے مطلب اور اس کی قیمت کو یعنی دائرے کے محیط اور قطر کے تعلق کو اس طرح قائم کر سکتے ہیں کہ چھوٹے بڑے مختلف دائروں کی فی الواقع پیمائش کی جائے۔

ایسا کرنے سے ہر عمل کا طالب علم کو ایک مطلب نظر آئے گا جو قاعدے وہ سیکھے گا وہ سب تجربے اور مشاہدے کا نتیجہ ہوں گے نہ کہ چند ایسی چیزیں جو طالب علم کے دماغ میں ٹھونس دی گئی ہوں بجائے اس کے کہ استاد یہ کہے "اس کو اس طرح کرو"، اُس کو چاہیئے کہ طلبہ ہی سے مشورہ لے کہ "اس کو کس طرح کریں"۔ بے شک ہر منزل پر اُس کو طلبہ کی رہبری کرنی ہوگی لیکن ہر نئی بات کو وہ اُن کی سمجھی ہوئی باتوں سے اس طرح آہستگی اور ہوشیاری سے اخذ کرے کہ یہ نئی نامعلوم بات بھی اُن کی اپنی ملک ہو جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یاد رکھنے کے قاعدے بہت تھوڑے ہیں۔ چار سادہ قاعدوں (جمع تفریق ضرب تقسیم) کسروں اور تناسب میں سب کچھ آجاتا ہے۔ نفع نقصان، فی صدی، سود مفرد وغیرہ کو بتانا چاہیئے کہ تناسب ہی کی خاص صورتیں ہیں۔ ان سوالوں کے جو مختصر اور مخصوص طریقے ہیں وہ اُس وقت اختیار کئے جائیں جب کہ عمل کو طالب علم خود ایسے استدلال سے حاصل کرے۔ طالب علم کو ہر وقت اس بات کا احساس دلانا چاہیئے کہ ریاضی کچھ نہیں صرف عقل سلیم ہے جسے اعداد پر لگایا گیا ہے۔ اگر یہ طرز

عمل اختیار کیا جائے تو یہ بات سہل ثابت ہو جائے گی کہ فلاں لڑکے کا "ریاضی کا دماغ نہیں" کیوں کہ ریاضی کا دماغ ہر اُس لڑکے کو ہے جس کو عقل ہے۔ اس طرز عمل سے لڑکوں کی ساری ذہنیت بدل جائے گی اور عقل سلیم کو استعمال کرنے کی اُن کو جو عادت ہو جائے گی اُس سے مضمون کی ساری پیچیدگیاں سلجھ جائیں گی۔

۲۔ آلات کا مستقل استعمال۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے استاد کا کام بڑھ جائے گا لیکن آگے چل کر اُس کو اس کی محنت چند در چند وصول ہو جائے گی۔ بعض مدرسوں میں آلات موجود ہوتے ہیں اور استعمال نہیں کئے جاتے۔ ذیل میں مثال کے طور پر آلات کے استعمال کے چند کارآمد طریقے بتائے جاتے ہیں جن سے بچے کی دل چسپی بڑھے گی اور اس پر ریاضی کا عملی پن روشن ہوگا۔

(الف) ایک سیر، آدھ سیر، پاؤ سیر، آدھ پاؤ کے باٹوں کے ذریعے کسریں سمجھائی جاسکتی ہیں۔ ۳/۴ سیر چاول علیحدہ کرنے سے کسر ۳/۴ کا مفہوم پیدا ہو جائے گا۔

(ب) فٹ پٹی بڑا سادہ آلہ ہے جس کے ذریعے کسریں اور طول کی پیمائش سکھائی جاسکتی ہیں۔

(ج) کھیل میں ایک دکان قائم کر کے فرضی سکے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ اس سے غبی سے غبی لڑکے کو بھی دل چسپی پیدا ہوگی اور سادہ قاعدوں کی عمدہ مشق ہو جائے گی۔

(د) ایک ٹکٹ خانہ قائم کر کے اس میں ہاتھ سے بنائے ہوئے مختلف قیمتوں کے ٹکٹ فروخت کئے جاسکتے ہیں۔

(ع) ایک اسٹیشن کا ٹکٹ گھر قائم کیا جاسکتا ہے۔ ٹکٹ خریدنے والوں کو اُن کی منزل مقصود کا فاصلہ بتایا جائے اور وہ حساب لگا کر ٹکٹ کی قیمت ادا کریں۔

(ف) گھڑیال کو سامنے رکھ کر ضرب کا عمل اور وقت کے بہت سے حسابات سمجھائے جاسکتے ہیں۔

۳۔ بورڈ پر نقشے کھینچے جائیں جن سے مقداریں زیادہ حقیقی معلوم ہوں گی لیکن نقشوں کو احتیاط اور صحت کے ساتھ کھینچا جائے۔ بعض وقت ایک اچھے نقشے سے وہ کام نکلے گا جو گھنٹہ بھر زبانی سمجھانے سے نہیں نکل سکتا۔ اس سلسلے میں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ترسیم کو نصاب میں اس سے

زیادہ جگہ دینی چاہیئے۔ ترسیمات دراصل مقداروں کی تصویریں ہیں اس لئے ان کو تو بالکل ابتدائی جماعتوں سے اختیار کرنا چاہیئے۔ مثلاً سادہ تناسب کو ترسیمات کے ذریعے بڑی اچھی طرح سمجھایا جاسکتا ہے۔ اوپر کی جماعتیں خود معلومات فراہم کر کے یا اُستاد سے حاصل کر کے ترسیمات بنائیں مثلاً مدرسے میں طلبہ کی سال بہ سال مقدار، چاندی اور کلدار کی قیمتیں وغیرہ۔

(۴) ــــ (Project Method)

ریاضی میں عملیت پیدا کرنے کا اس سے بہتر طریقہ نہیں۔ لیکن یہ چنداں آسان نہیں۔ اس میں کامیابی کے لئے اُستاد کی طرف سے صلاحیت اور سرگرمی کا اظہار ہونا چاہیئے۔ اس کو جس عمدگی اور تکمیل کے ساتھ (Moga) میں انجام دیا گیا ہے دوسری جگہ کرنا مشکل ہے لیکن ذرا سی مناسب تبدیلی کے ساتھ ہر مدرسے میں کم از کم ایک جماعت کے لئے اس کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ ایک سال تک ہر روز آدھ دن (Shop project) میں صرف کیا جائے۔ اُستاد کو اختیار دے دیا جاتا ہے کہ جس طرح چاہے وقت صرف کرے بشرطیکہ جو کچھ بھی کرے دکان داری اور تجارت کے متعلق ہو۔ ابتدا اس طرح کی جاسکتی ہے کہ جماعت مل کر لکڑی کی ایک چھوٹی سی دکان کھڑی کرے۔ اس میں حساب اور پیمائش کی ضرورت ہوگی۔ پھر مدرسے کی ضرورت کی بعض اشیا خرید کر لڑکوں کو جلد فروخت کی جائیں نفع نقصان کا بھی کھاتہ رکھا جائے اور جماعت تصفیہ کرے کہ نفع کو کس کاروبار میں لگایا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ سمجھایا جائے کہ خانگی، تجارتی اور قومی زندگی میں ریاضی کا کیا حصہ ہے۔ لڑکوں کو بیمہ کا نظام، بین الاقوامی تجارت، سرکاری تمسک وغیرہ سمجھائے جاسکتے ہیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ لڑکے کو نہ صرف حساب کے سوالات کا مواد سمجھ میں آئے گا۔ بلکہ ایک طرح کی دلچسپی پیدا ہوگی جس کو بغیر دماغ کی نشو و نما ناممکن ہے۔

۶۔ اوپر جو طریقے بیان ہوئے ہیں ان سے عمدہ نتائج حاصل کرنے کے لئے سخت ضروری ہے کہ لڑکوں کو مادری زبان میں سمجھایا جائے خصوصاً نیچے کی جماعتوں میں۔

جبر و مقابلہ اور ہندسہ: یہ مسلم ہے کہ ریاضی کے ان شعبوں میں عملیت پیدا کرنا مشکل ہے کیونکہ سرے سے ان کی فطرت ہی میں عملیت نہیں۔ لیکن یہاں بھی اگر صحیح طریقہ اختیار کیا جائے

توطالب علم کو ان کا بھی افادہ نظر آسکتا ہے۔ جبر و مقابلہ کا خاص فائدہ "مساوات" میں متصور ہے۔ اس لئے مشورہ دیا جاتا ہے کہ مساوات کی جو سادہ ترین شکل ہے اُس سے لڑکے کو جتنا جلد ممکن ہو روشناس کرایا جائے۔ اگر لڑکے کو "لا" کا مفہوم ہوشیاری سے سمجھایا جائے اور اس کا فائدہ بتایا جائے تو اس کے دل سے اُس کی ہیبت نکل جائے گی۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک سوال ہے جس میں "بکریوں کی ایک تعداد" سے بحث ہے جو ایک شخص نے خریدی ہیں۔ لڑکا پہلے اس پورے فقرے کی بجائے صرف بکری کی شکل کا خاکہ رکھے۔ چند سوالوں تک اسی طرح عمل کرتا رہے۔ پھر ایسا سوال دو کہ مطلوبہ چیز کو نقشے کے ذریعے ظاہر کرنا مشکل ہو۔ اغلب یہ ہے کہ اب وہ خود بخود کوئی مختصر علامت تجویز کرے گا مثلاً بکریوں کے لئے "ب"۔ اب اس کے بعد نہایت آسانی سے لا کو روشناس کرایا جا سکتا ہے جو ہر سوال میں کام دے گا۔

سائنس کا ذرا سا علم ہو جائے تو لڑکے کو جبر و مقابلے کا فائدہ معلوم ہو جائے گا۔ سائنس میں مساوات کی بار بار ضرورت ہوتی ہے چونکہ سائنس نام ہے قدرت کے باقاعدہ علم کا اس لئے اس کو معلوم ہو جائے گا کہ طبعی قوانین کا علم حاصل کرنا ہو تو تھوڑا بہت جبر و مقابلہ جاننا ضروری ہے اور موجد اور محقق کے لئے تو بالکل ناگزیر ہے۔

ہندسہ کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ زیادہ تر ساخت پر زور دینا چاہیئے اور ابتدائی حصہ بہت عملی ہونا چاہیئے۔ مثلاً اس کی کیا ضرورت ہے کہ اس کا باضابطہ ثبوت یاد کیا جائے کہ ایک نقطے اور ایک خط مستقیم کے درمیان عمود چھوٹے سے چھوٹا فاصلہ ہے جیسا کہ یہی بات ناپ کر دکھائی جا سکتی ہے اگر یہ نتیجہ طالب علم خود اخذ کرے تو یہ بہت زیادہ حقیقی علم ہوگا بہ نسبت اس کے کہ اقلیدس کے دیئے ہوئے ثبوت کی زبردستی پیروی کی جائے۔ اگر مسئلے کو اس طرح اخذ کرنا ممکن نہ ہو تو استاد اور طلبہ مل کر ثبوت کا مطالعہ کریں۔ لیکن ایک بار ثبوت معلوم ہو جائے تو اُس کو رٹانے کی بجائے بہتر ہوگا کہ سوالات حل کرنے میں اس کا استعمال کرایا جائے۔

دوسرے مضامین سے ریاضی کا تعلق جس سے ریاضی کا افادہ ظاہر ہوتا ہے:-

(ا) نقشہ کشی کے سبق کو ریاضی کا رفیق کار بنا سکتے ہیں۔ پیمانہ پر نقشہ کشی تناسب کا عملی استعمال ہے۔ اوپر کی جماعتوں میں (عبارتی سوالات کی مدد سے نقشہ کشی بڑی اچھی مشق ہوگی۔ مثلاً

ایک صندوق کھینچو جس کا ایک رُخ مربع ہو، لمبائی چوڑائی سے دُگنی ہو اور ڈھکن ۵۴ درجے کے زاویے پر کھلا ہو۔ جغرافی نقشہ کشی میں بھی ہندسی شکلوں کو داخل کیا جا سکتا ہے مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ لنکا ایک مثلث ہے جس کے اضلاع کے طول دیے ہوئے ہیں۔

(ب) جغرافیہ کے بعض سبقوں کو ریاضی سے متعلق کر دیا جا سکتا ہے۔ مقامی بارش اور تپش کے اعداد و شمار کو مرتسم کیا جا سکتا ہے۔ طالب علم بطور خود ایسے نقشے کھینچ سکتے ہیں جن میں ملک کا رقبہ اور آبادی معلوم کر کے آبادی کی گنجانی دکھائی جائے۔

(ج) دستی مشاغل (Manual Work) بھی استعمالی ریاضی کے لئے اچھا میدان ہے۔ اگر مدرسہ میں پارچہ بافی کی جائے تو دھاگے کی قیمت مزدوری اور آلات کی فرسودگی سب کا لحاظ رکھ کر قیمت کا تخمینہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر نجاری سکھائی جائے تو لڑکے مال مسالے کو استعمال کر کے اپنے ہندسے کے علم کو کام میں لا سکتے ہیں جس سے ان کو رقبوں اور حجموں کا ٹھیک ٹھیک علم ہو سکتا ہے۔ اور ان کو یہ بھی نظر آ جائے گا کہ اس طرح کے حسابات زندگی کے کاروبار میں کتنے کارآمد بلکہ ناگزیر ہیں۔

(د) ریاضی اور سائنس کے قریبی تعلق کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

نصاب۔ نصاب بناتے وقت کسی بھی مضمون کا سماجی افادہ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے لیکن جیسا کہ اس روداد کی ابتدا میں کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ سرسری نظر میں جو چیز بھی روزانہ زندگی سے دور نظر آئے اُسے ایک دم خارج کر دیا جائے۔

ہم نے یہاں صرف ابتدائی ریاضی کے نصاب سے بحث کی ہے۔ نیز دیہاتی مدارس کی ضروریات کو بھی شامل نہیں کیا۔ اس مضمون پر جس چھان بین کی ضرورت ہے اُس کی یہاں گنجائش نہیں۔

ابتدائی اور وسطانی حصوں کے لئے صرف ایک نصاب ہماری نظروں سے گزرا ہے جو ۱۳۳۱ ف کا ہے۔ ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ نئے نصاب کی اشاعت ضروری ہے۔

مرمّہ نصاب کے لئے مشورے

ابتدائی۔ یہ عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ موجودہ نصاب بہت بھاری ہے۔ وہاں تو

صرف چاروں آسان قاعدوں کا استعمال جاننا کافی ہے۔ پہلی دو جماعتوں میں صرف ایسے سوالات دینے چاہئیں جن کی توضیح اور جن کے جواب کی جانچ حقیقی اشیا سے کی جاسکتی ہے (Expression work) کو لازمی قرار دینا چاہیئے۔

جماعت اول۔ گنتی ۱۰۰ تک۔ جمع اور تفریق ۲۰ تک تمام کام حقیقی اشیا کے ساتھ کیا جائے اگر ان کی کافی تعداد نہ میسر آئے تو تصویروں اور نقشوں سے کام لیا جاسکتا ہے۔

جماعت دوم۔ گنتی ۱۰۰۰ تک۔ جمع اور تفریق ۱۰۰ تک۔ پہاڑے اُستاد خود چیزوں کی ڈھیریاں لگاکر بنائے۔ اور اس میں ترتیب یہ رہے کہ پہلے دس گنا، پھر پانچ گنا، دوگنا، چوگنا، آٹھ گنا بتایا جائے۔ اور اس طرح بناتے ہوئے پہاڑوں کی مدد سے ضرب اور تقسیم۔

جماعت سوم۔ گنتی ایک لاکھ تک۔ جمع اور تفریق جس میں باقی ایک لاکھ تک رہ سکتا ہے۔ پہاڑے۔ ضرب اور تقسیم دو ہندسوں سے۔ مثالوں میں روپے، آنے، پائی استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس طرح نہیں کہ تحویل کی ضرورت ہو۔ آسان کسروں کا مفہوم مثلاً ½، ¼، ¾ وغیرہ حقیقی اشیا کی مدد سے۔

جماعت چہارم۔ چار آسان قاعدوں کی توسیع زر کے سوالات (ہندوستانی سکے) تک جن میں تحویل شامل ہو۔ بازار کے لین دین پر خاص طور پر زور دیا جائے۔ بڑے بڑے عدد نہ استعمال کئے جائیں۔ مادی اشیاء کے (Concrete) کسروں کی آسان جمع جس میں ذواضعاف اقل کی ضرورت نہ ہو۔ دئے ہوئے ناپ کے مربع اور مستطیل۔ جماعت کے کمرے کے اندر کی اشیا کو ناپنا اور پیمانے پر کھینچنا۔

وسطانی جماعت۔ موجودہ نصاب قابل اطمینان معلوم ہوتا ہے۔ صرف ذرا تعلیم کے طریقے کو بدلنا اور زیادہ عملی قسم کے سوالات کی ضرورت ہے۔ مقامی پیمانے استعمال کرنے چاہئیں اور غیر ملکوں کے زر کے پیمانوں کو اُڑا دینا چاہیئے۔

فوقانی جماعت۔ حساب کے اندر حصص و راس المال کا ابتدائی علم داخل رہے۔ اور محاصل وغیرہ کے سوالات پر زیادہ توجہ کی جائے۔ سود کے سوالات میں ساہوکاروں کا طریقہ بھی مثال کے طور پر بتایا جائے یعنی روپیہ کو اتنے پیسے ماہانہ تھوک اور حلہ تجارت اور ریل کی حمل و نقل اچھی

طرح سمجھائی جائے اور ممکن ہو تو اتحاد باہمی کے کاروبار پر بھی سوالات گڑھے جائیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ضرب و تقسیم کے مختصر طریقوں کے استعمال سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اس لئے ہمارا مشورہ ہے کہ ایسے طریقوں پر کم وقت صرف کیا جائے اور زیادہ وقت تجارتی حسابات کو دیا جائے۔ جبر و مقابلے کو حساب کے تحت سمجھا جائے، اور اس کے ضرورت سے زیادہ نظری حصے حذف کر دیے جائیں۔

ترسیمات کو آزادی سے استعمال کر کے مقداروں کے تغیر و تبدل دکھائے جائیں اور مساواتیں حل کی جائیں لیکن وقت اور کام، رفتار اور فاصلہ وغیرہ کے سوالات میں استعمال نہ کریں۔

نصاب میں ٹھیک ٹھیک بتایا جائے کہ کیا کیا کرنا ہے۔ مثلاً "آسان اجزائے ضربی" کہہ دینے سے اُستاد کو پوری ہدایت نہیں ملتی۔ اجزائے ضربی کی قسم زیادہ یقین کے ساتھ بتائی جائے مساواتوں پر خاص زور دیا جائے۔

مساحت میں موجودہ نصاب ہو اور اس کے ساتھ (Field work) کی آسان مشق کا اضافہ کیا جائے۔ ہندسے میں موجودہ نصاب کی پیروی کی جا سکتی ہے لیکن زور اثباتی حصے کی بجائے عملی مساحت پر دیا جائے۔

مثالوں کا انتخاب۔

(۱) چونکہ ریاضی کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو عام اصول نئے نئے مسائل پر لگانا سکھائے اس لئے سوالات بتاتے وقت اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کچھ بھی ہو لیکن طلبہ کے سامنے وہی فرسودہ سوالات پیش نہ کئے جائیں۔ جس طرح زندگی کو گوناگوں ہونا چاہیئے اُس طرح ریاضی کو بھی ہونا چاہیئے۔ اس طرح لازم آیا کہ ابتدا ہی سے ریاضی میں مسائل پیش کرنے چاہئیں۔ قاعدے اور عمل صرف ڈھانچہ ہیں اور مسئلے گوشت پوست ہیں۔ نیز چونکہ زندگی کے مسائل میں اس کی ضرورت رہتی ہے کہ ضروری اور غیر ضروری میں تمیز کیا جائے اس لئے ایسے سوالات گڑھے جائیں جن میں غیر متعلق باتیں بھی ہوں۔

(۲) جہاں تک ممکن ہو سوالات ایسی چیزوں سے متعلق ہوں جن کو لڑکا تصور میں لا سکے تاکہ اُسے احساس ہو کہ اشیا سے بحث کر رہا ہے نہ کہ اعداد سے۔ سوالات میں یوں کہا جائے کہ گاڑی سکندرآباد سے قاضی پیٹ جاتی ہے۔ آہنی شہتیر بمبئی سے حیدرآباد لائے جاتے ہیں۔ گھوڑدوڑ فتح میدان میں ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں یہ بھی اہم ہے کہ اعداد تقریباً

صحیح ہوں۔ مثلاً اگر چاول کی قیمت کا ذکر آئے تو وہ رائجہ قیمت کے قریب ہو اور اس کا ناپ مقامی طریقوں کے مطابق ہو مثلاً۔

(الف) ایک گاڑی حیدرآباد سے ۹ بج کر ۱۰ منٹ پر چل کر وقارآباد ۱۱ بج کر ۵ منٹ پر پہونچتی ہے۔ راستے میں تین جگہ تین تین منٹ کے لئے ٹھیری۔ اگر فاصلہ ۴۵ میل ہو تو گاڑی کی رفتار کیا تھی

(ب) تین بالغ آدمی اور ایک بچہ یہ سفر کرتے ہیں۔ اگر شرح ۳ پائی فی میل ہو تو ان کے ٹکٹوں کی قیمت کیا ہوئی۔

(ج) ۵ آنے میں چھ انڈے ملتے ہیں تو ۱۵ انڈے کتنے میں ملیں گے۔

(د) چاول روپے کو ۵ سیر ہو تو ۲½ سیر کتنے کا ہوگا (ڈھیریوں کا طریقہ)۔

(ع) ۷ مرغیاں ۰-۴-۸ روپیہ کو خریدی گئیں۔ ۶۰ دن تک اُن کی خوراک فی مرغی ½ آنہ روزانہ تھی۔ اگر ان کو ۰-۱۲-۱ روپیہ فی مُرغی فروخت کیا جائے تو کتنا نفع ہوگا۔

(۳) عام طور پر اس کا میلان پایا جاتا ہے کہ سوال میں بڑی بڑی قیمتیں دی جائیں۔ اس طرح کے سوالات صرف کبھی کبھی دئے جائیں کیونکہ ان میں مشین کی طرح کام بہت اور سوچنا تھوڑا ہوتا ہے۔ بھلا ۴-۱۴-۶، ۳۱۴۷ روپیہ کو ۳۴۷ سے ضرب دینے میں لڑکے کو کیا دلچسپی رہ سکتی ہے۔ دیکھنے والے کو تو یہی خیال ہوتا ہے کہ اُستاد ایسے سوال دے کر خود آرام کرنا چاہتا ہے پورے سبق میں دو لمبے سوال دینے سے بہت بہتر ہے کہ ایک درجن بھر چھوٹے چھوٹے سوالات دئے جائیں۔

(۴) تمام مثالوں میں سماجی افادہ مدنظر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے حصص و راس المال محاصل، بازاری سود وغیرہ کو نصاب میں جگہ دینے کا مشورہ دیا ہے کیونکہ طالب علم کو مدرسے سے نکل کر اس طرح کے کاروبار کرنے پڑیں گے۔

اس روداد کو موثر بنانے کے لئے کمیٹی سررشتہ تعلیمات کو حسب ذیل مشورے دیتی ہے

(ا) صدر مدرسین کو شوق دلایا جائے کہ نئے طریقے سوچیں اور تجربے کریں خواہ اس سے نصاب سے کسی قدر انحراف ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً (PROJECT) کا طریقہ اختیار کرنا (انسپکٹر تصفیہ کرے گا کہ یہ تجربہ بارآور ہوگا یا نہیں اور اس کے مطابق یا تو منظوری دے گا یا باز رہے گا۔

(۲) نصاب پر نظر ثانی کی جائے اور نصابی مضامین کو زیادہ تفصیل سے درج کیا جائے تاکہ اُستادوں کی رہبری ہو۔

(۳) اس روداد میں جو مشورے دئیے گئے ہیں اُن کے مطابق مثالوں کی ایک کتاب سررشتہ کی جانب سے تیار کی جائے۔ اس میں مقامی پیمانوں اور سکوں کا استعمال رہے گا، ایک مقامی رنگ پیدا ہوگا اور اُستادوں کو صحیح قسم کے سوالات کا علم ہو جائے گا۔

(۴) ریاضی میں تعلیم کی اصلاح اس وقت تک بے کار ہے جب تک سرکاری امتحانات کی اصلاح نہ کی جائے۔ ایک اوسط لڑکا امتحان ہی کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھتا ہے اور جو چیز اس مطلب کے لئے مفید نہ ہو اُسے بے کار سمجھتا ہے۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ صحیح نقطہ نظر پیدا کرنے میں بورڈ آف اگزمینرز (مجلس ممتحنین) وہ کام کر سکتے ہیں جو کتابیں لکھنے سے نہیں ہو سکتا۔

جماعت مدرسہ میں خود مختاری

یہ نہایت ہی مختصر مضمون انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد دکن کی چوتھی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں نہ تو اصول آزادی یا آئین نظم و نسق کی تشریح و توضیح کی گئی ہے اور نہ عطائے خود مختاری کے مالہٗ و ماعلیہ سے بحث۔ بلکہ فقط ایک تجربہ کا ذکر ہے جو مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ میں کیا گیا ہے۔ جن حضرات کو یہ مضمون تشنہ معلوم ہو وہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے کم از کم "راہ بازی" مصنفہ کیڈویل کک، "آزادی کی طرف بچوں کی گامزنی" مصنفہ ہیکمن اور ارنسٹ اے کریڈک کی چھوٹی مگر سبق آموز کتاب "جماعتی جمہوریہ" کا مطالعہ فرمائیں۔ فقط

جس عنوان پر میں کچھ کہنے والا ہوں وہ اکثر حضرات کے لئے نیا ہوگا۔ انگریزی میں اُس کو (CLASS-ROOM REPUBLIC) یا (CLASS SELF-GOVERNMENT) کہتے ہیں اور اس کا اُردو ترجمہ جماعت مدرسہ میں حکومت خود اختیاری کیا گیا ہے۔ میں بذات خود اس کا ترجمہ جماعتی سوراج کرتا ہوں جو نہایت ہلکا پھلکا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں اس تحریک کو مہاتما

گاندہی کی تحریک حصول سوراج سے گڈ بڈ کر دیا جائے میں نے اس لفظ سے قصداً پرہیز کیا ہے لیکن میرے مدرسہ میں ان ترجموں میں سے کوئی ترجمہ رائج نہیں ہے۔ جس تحریک کے ذریعہ بچوں کو خود مختاری کا حق عطا کیا جاتا ہے اس کو منشور آزادی کہتے ہیں اور بچوں نے اپنی فطری جدت طرازی سے اس تحریک کو منشور آزادی کا نام دے رکھا ہے۔ بہرحال خواہ سلف گورنمنٹ کا اُردو ترجمہ کچھ بھی ہو لیکن نہ تو انگریزی لفظ اور نہ اس کے اُردو مترادف کا عام سوراج یا ہوم رول کی تحریک سے کوئی تعلق ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یہہ ہے کہ بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے دیا جائے اور اُمید کی جاتی ہے کہ بصداق "مزدور خوش دل کند کار بیش"، یہ بچے مدرسہ کا کام خوشی خوشی کریں گے اور اچھا کریں گے۔

کلاس کے کام کے دو حصے کئے جا سکتے ہیں تعلیمی اور انتظامی۔ اب تک یہ دونوں کام مدرسین کے ذمہ تھے اور دونوں صیغوں کے لئے بالعموم ڈنڈا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اکثر حضرات کو وہ زمانہ نہ بھولا ہوگا جب کہ ان کو اس خوفناک چیز سے دو چار ہونا پڑتا تھا اور میں تو کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ جب میں ایک دیہات کے چھوٹے سے مدرسہ میں تعلیم پاتا تھا تو وہاں جو مدرس صاحب مجھے پڑھاتے تھے اُن کی کرسی سے ٹیکا لگائے ہوئے ایک نہایت مہیب اور ڈراونا سیاہ عصا تھا جو ذرا سی غلطی پر نہایت پھرتی سے جنبش میں آتا تھا اور چاروں طرف طوفان بپا کرکے پھر اپنی جگہ نہایت اطمینان سے جم جاتا تھا۔ اس کا نام دھومن داس تھا آپ کو غالباً اس کی دہشت خیزی کا پورا احساس نہیں ہو سکتا لیکن میں تب تو اس کی صورت دیکھتے ہی بید مجنوں کی طرح تھرتھرانے لگتا تھا اور اب بھی اگر کوئی لفظ جس کے آخیر میں داس ہو میرے کانوں تک پہونچتا ہے تو میں بلا قصد لرزہ براندام ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ حضرت اکبر الہ آبادی کی وہ نظم جس میں مجنون اور لیلیٰ کی ماں کا سوال و جواب ہے میرے لئے بلائے جان ہے کیونکہ ہر حرف داس کے نام سے مجھے دھومن داس خیال آجاتا ہے اور دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے

میرا خیال ہے کہ کچھ رد و بدل کے ساتھ یہی تجربہ بہت سے حضرات کو ہوا ہوگا گو فی الحقیقت ڈنڈے کی جگہ ½ انچ قطر کی بید نے لے لی ہے لیکن مار پیٹ کا رواج بدستور باقی ہے میں جانتا

ہوں کہ بہت سے حضرات بچوں کو مارنا بُرا سمجھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ خوف کی حالت میں دماغی کمزوریاں بند ہو جاتی ہیں اور جو باتیں یاد ہیں وہ بھی ذہن سے نکل جاتی ہیں۔

اس اصول کے مد نظر مغرب کے ماہرین تعلیم نے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے جس کو جماعتی خودمختاری کہتے ہیں اور جس سے توقع ہوئی ہے کہ بچے اپنا کام برضا و رغبت کریں گے۔

تین سال ہوئے جب میں علی گڈھ سے واپس آیا تو مجھے بھی خیال ہوا کہ میں اس تحریک کا تجربہ کر کے دیکھوں۔ بچوں کو پٹتے دیکھ کر۔ غریب و مسکین بچوں کو جن کو پیٹ بھر کھانے کو بھی میسر نہیں ہوتا مار کھاتے دیکھ کر میرا دل کڑھتا تھا اور میں نے طے کیا کہ میں ضرور کوشش کر کے دیکھوں گا۔ آیا بچے بغیر مار پیٹ کے کام کر سکتے ہیں ؟ جب میں نے اپنے دوستوں سے گفتگو کی تو ہر طرف سے مایوسی ہوئی۔ طرز بیان کے اختلاف کے باوجود سب اس بات پر متفق تھے کہ آن ہونی بات ہے۔ لیکن میرا ارادہ اٹل رہا اور مجھے یہ اعتقاد رہا کہ جو تحریک انگلستان و امریکہ میں کامیاب ہوئی ہے وہ ہندوستان میں بھی کامیاب ہوگی۔ کیڈول لک کے بچوں نے اگر نہ صرف ڈرامے تیار کئے۔ نہ صرف اعلیٰ پایہ کے مضامین لکھ ڈالے بلکہ ایک چھوٹا سا شہر بھی کھیل کھیل میں تعمیر کر ڈالا میک من صاحب کے شاگردوں نے یہاں تک ترقی کی کہ استاد صرف مشیر بن کے رہ گیا تو کیا ہمارے بچے اس قابل بھی نہیں کہ اپنی جماعت کا انتظام کر سکیں اور اور اپنی پڑھائی اور ہوم ورک کے متعلق رائے دے سکیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہندوستانی بچوں کی ذہنیت ایسی گئی گذری نہیں میں نے اللہ کا نام لے کر مڈل کی جماعت کو منشور آزادی دے دیا۔ میں ان جذبات کے اظہار سے قاصر ہوں جو اس آزادی کے حصول سے بچوں کے چہروں پر نمایاں تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک نئی روح پھونک دی گئی ہے۔ مسرت سے آنکھوں میں رونق، گالوں میں سرخی اور ہونٹوں پر احسان مندی تھی۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ کام تیزی سے ہونے لگا۔ حاضری درست ہو گئی۔ ہوم ورک وقت پر اور پورا ہونے لگا۔ جماعت میں خواہ استاد ہو یا نہ ہو ضبط قائم رہنے لگا۔ صفائی کا اہتمام ہو گیا بلکہ تمام وہ باتیں جو ترہیب و تخویف سے ممکن نہ ہو سکیں وہ ان قیدیوں کو آزادی دے کر حاصل ہو گئیں۔

میں نے ابتدا مڈل کلاس سے کی کیونکہ یہی ایک جماعت تھی جس میں میرے گھنٹے تھے

اور میں وقتاً فوقتاً ان کو ان کے مغربی بھائیوں کی کارگذاریوں کے قصے سناتا تھا اور ان کے حوصلے بڑھتے تھے۔

عجیب اتفاق ہے یا یوں کہئے کہ عجیب اصول ہے کہ جس طرح ہندوستانیوں کو انگریزی پارلیمنٹ نے ابتدا میں تھوڑے سے حقوق عطا کئے تھے اسی طرح مجھے بھی ان کی آزادی کو مشروط کرنا پڑا۔ میں نے صرف انتظامی اُمور منتقل کئے۔

(۱) صفائی (۲) حاضری (۳) ہوم ورک (۴) ضبط (۵) یونیفارم ان کی ایک انتظامی کمیٹی تھی جس کے (۵) ارکان تھے جن کے ذمہ مختلف امور تھے۔ ایک کے ذمہ صفائی دوسرے کے ذمہ حاضری وغیرہ۔

ایک ریمارک بُک بھی کلاس میں رہتی تھی تاکہ مُدرسین وقتاً فوقتاً اپنی رائے جماعت کے بارہ میں لکھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گو اس آزادی سے بعض کام چور بچوں نے شروع میں ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی لیکن آخر میں یا تو ان کی اصلاح ہوگئی یا ان کو انتظامی کمیٹی نے "وشہر بدر" یا "آزادی بدر" کر دیا۔ اور وہ پھر معرض خطر میں ہوگئے ان چند "بدنام کنندۂ نکو نامی چند" کے علاوہ باقی طلبہ سے کچھ شکایت نہ تھی سالانہ امتحان میں نتیجہ پیشتر سے کہیں زیادہ اچھا نکلا اور میرے حوصلے بڑھ گئے۔

دوسرے سال جب اسکول پھر کھلا تو میں نے مڈل کو پھر منشور آزادی دیا لیکن مجھے اس بات کا غم تھا کہ جب بچوں کو ذرا قابلیت آئی تو وہ ہائی اسکول میں چلے گئے اور مجھے موقعہ نہ ملا کہ ان کو تعلیمی اختیارات بھی سپرد کر کے دیکھوں کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اس لئے میں نے یہ طے کیا کہ نیچی جماعتوں سے شروع کروں۔ میں نے چہارم کو بھی منشور آزادی دیا لیکن چونکہ میں بذات خود اس جماعت کو نہیں پڑھاتا تھا اور مجھے اُن سے گفتگو کرنے کا موقعہ بہت کم ملتا تھا اس لئے کام بگڑتا گیا اور آخر کار مجھے اس جماعت کی آزادی کو سلب کر لینا پڑا مجھے یقین ہے کہ یہاں بھی کامیابی ہوتی لیکن مجھ سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ میں نے اس جماعت کے مدرسین کو تیار نہیں کیا تھا اور بغیر ان کی رضامندی کے کامیابی کی کوئی شکل نہ تھی۔ مڈل میں بھی کئی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی مدرس صاحب نے بچوں کو باوجود منشور آزادی کے ٹھونک دیا

چنانچہ لڑکے سمجھنے لگے کہ منشور آزادی ایک ڈھکوسلہ ہے۔ اور اس کی وہی اہمیت ہے
جو بچوں کے گھروندے کی ہوتی ہے یعنے جب چاہا بنایا جب چاہا بگاڑا لیکن بہت جلد
مدرسین نئے حالات سے مانوس ہوگئے اور کام ٹھیک طور سے چلنے لگا۔ سال گذشتہ
جب میرے پاس چہارم و مڈل کی درخواستیں وصول ہوئیں تو میں نے صرف مڈل ہی کو
منشور دیا کیونکہ چہارم کے متعلق مجھے اطمینان نہ تھا۔ مڈل میں مجھے توقع سے زیادہ کامیابی
ہوئی۔ یہ لڑکے جو نیچی جماعتوں سے ترقی پاکر آئے گو اب تک خود آزادی سے محروم تھے
لیکن ان کے کانوں میں آزادی کی آواز پہونچ چکی تھی اور وہ کچھ کچھ پہلے ہی سے واقف ہوگئے
تھے۔ اس لئے غیر معمولی عمدگی سے کام چلا ارکان اور میر مجلس بھی اپنے اختیارات سے واقف
ہوگئے تھے اور انہوں نے متعدد بار ان کا استعمال کیا۔ نوٹس بورڈ پر اعلان لگایا گیا۔ فرد جرم
قائم ہوا۔ تاریخ پیشی مقرر ہوئی۔ حکومت اور خاطی دونوں نے مشورے حاصل کئے۔ گواہ
فراہم کئے۔ ایک مدرس صاحب سے ثالث بننے کی درخواست کی گئی اور بحث شروع ہوگئی
تین روز تک ۴ وہ کے درمیان پیروی ہوتی رہی۔ بالآخر فیصلہ سنایا گیا اور خاطی نے فیصلہ کے
آگے سر تسلیم خم کیا۔ اس کے بعد سے پھر کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ کسی رکن کی حکم کی مخالفت کرے
یہ ہے آپس کی حکومت خود مختاری کا اثر۔

اب میرے مدرسے کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی آزادی سے واقف ہوگئے ہیں
مدرسین بھی مانوس ہو چلے ہیں۔ ایک اور واقعہ پیش آگیا جس کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھ گئی
ہے۔ چند روز ہوئے کہ لیگ آف نیشن یعنی مجلس بین الاقوامی کے شعبۂ تعلیمات سے گشتی
شائع ہوئی ہے جس میں استفسار کیا گیا ہے کہ کن مدارس میں خود مختاری کا تجربہ ہو رہا ہے
اس نے اس تحریک میں ایک اہمیت پیدا کر دی ہے اب طبقہ وسطانیہ اور تحتانیہ کی بالائی جماعتوں
سے درخواستیں وصول ہو رہی ہیں کہ ان کی جماعت کو منشور آزادی دیا جائے۔ اس کے ابتدائی شرائط
کی تکمیل کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ جماعتوں میں ایک تنکا بھی نہیں۔ حاضری کے متعلق صرف
اتنا کہنا بس ہے کہ بے حد اطمینان بخش ہے۔ اس بار د باراں کے ایام میں بھی حصول آزادی
کی کوشش کرنے والی کلاسوں میں ۹۰.۰ فی صدی سے کم حاضری نہیں بلکہ بعض جماعتوں کی حاضری

تو ۱۰۰٫۰ ہوتی ہے مجھے یقین ہے کہ اس سال غالباً وسطانیہ طبقہ کی پانچوں جماعتوں کو اور تحتانیہ کی دو جماعتوں کو منشور آزادی دیا جا سکے گا۔ اور مجھے پورا بھروسہ ہے کہ کامیابی ہوگی۔

تین سال کے عرصہ میں اپنے تجربہ کی بنا پر میں نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے کہ جس حد تک ان کو آزادی دی گئی ہے اس کے آگے قدم بڑھانا فی الحال مشکل اور خطروں سے لبریز ہے میری مراد یہ ہے کہ طلبار ابھی اس قابل نہیں ہوئے کہ وہ تعلیمی صیغہ بھی اپنے ہاتھ میں لے سکیں۔ اس ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) بالعموم مدرسین اس طریقہ سے ناواقف ہیں اور اس لئے اس کی کامیابی اور عمدگی کے قائل نہیں (۲) ماحول غیر موافق ہے۔ مدرسہ ایک آئینہ ہے باہر کی دنیا کا۔ اور یہاں اس قسم کی حکومت کامیاب ہوسکتی ہے جیسی کی ملک میں رائج ہے مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے ملک میں آئینی ترقیاں ہونگی اور جیسے جیسے طلبار کے والدین ملکی ذمہ داری کو محسوس کریں گے، ویسے ویسے طلبار میں احساس ذمہ داری بڑھتا جائے گا۔

(۳) تیسری رکاوٹ خود بچوں کی طرف سے ابتداءً ہوتی ہے۔ وہ دفعۃً آزادی حاصل کرکے ذرا کام چور ہو جاتے ہیں۔ لیکن نشہ چند روز کا ہوتا ہے جو بہت جلد اُتر جاتا ہے۔ اور ارکان کمیٹی طلبار بہت جلد ان کو سیدھے راستے پر لگا دیتے ہیں۔

خود مختار جماعتوں میں بہت سی امتیازی خصوصیات نظر آتی ہیں سب سے زیادہ مجھے وہ منظر پسند ہے کہ جب کوئی مدرس رخصت پر ہو یا کسی دوسری وجہ سے کلاس میں دیر سے آئے تو ایک لڑکا کچھ کام دیتا ہے اور پورا کلاس انہماک و توجہ کے ساتھ کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو میں نے یہ بھی دیکھا کہ کوئی تیز لڑکا دوسروں کو سبق بھی دے رہا ہے۔

ان تمام واقعات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مار پیٹ کا نعم البدل معلوم ہوگیا ہے اور اگر ہم اس سے کام لیں تو نہ صرف بچے ہم سے محبت کریں گے، نہ صرف ان کے دل سے مدرس کا غیر ضروری خوف نکل جائے گا۔ جس کی وجہ سے بہت سے لڑکے یا تو غیر حاضر ہوتے ہیں یا تعلیم سے پورے طور پر فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ بلکہ بچوں میں ذمہ داری فرض شناسی، اور کارروائی کی عادت پیدا ہوگی۔ اور تعلیم بہتر و زیادہ سود مند ہوگی۔

آخر میں میں اپنے ہم پیشہ بھائیوں سے سفارش کرتا ہوں کہ وہ بھی اپنے مدارس اور

اپنی جماعتوں میں حکومت خود اختیاری کا تجربہ کریں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر مناسب طریقہ پر کام چلایا گیا تو ضرور کامیابی ہوگی۔

سید فخرالحسن

اختتامی تقریر عالیجناب نواب اکبر یار جنگ بہادر دام اقبالہٗ صدر نشین

اجلاس چہارم کانفرنس انجمن اساتذہ

بلدہ حیدرآباد دکن

خواتین و معزز حاضرین!!

اس وقت یہ توقع نہیں کرنی چاہیئے کہ میں کوئی طویل تقریر کروں گا۔ اپنے خیالات کو قبل ازیں آپ حضرات کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ میں اب جو کچھ عرض کروں گا وہ بہت ہی مختصر ہوگا۔ میرا فرض یہ ہے کہ تمام تقاریر و تجاویز کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں دو دن کے جلسوں میں چھ تحریکیں نہایت اہم اور ضروری پیش کی گئیں جن کو آپ حضرات نے منظور کیا۔ اگر مجھے موقع ملتا اور میں آزاد ہوتا تو زیادہ وضاحت سے کچھ کہہ سکتا جو تحریکیں پیش کی گئی ہیں ان کی نوعیت کے لئے اُردو اور فارسی میں کوئی خاص لفظ مجھے نہیں ملتا۔ البتہ عربی میں ایک لفظ جو "اِستِرَاقُ السَّمعِ" (سنی سنائی باتوں کو اپنا بنا لینا) ہے۔ اس کا اطلاق ان تحریکوں پر ہوتا ہے اور یہ تجاویز (رزولیوشنز) اسی نوعیت کے ہیں۔ کیونکہ یہ سب تحریکیں پہلے ہی سے گورنمنٹ کے زیر غور ہیں اور ارباب متعلقہ ان کی ضرورت کو محسوس کر چکے ہیں اور ان کو دو بعمل لانے کی فکر میں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سُن گن پا کر ان گورنمنٹ کے زیر غور مسائل کو تحریکوں کے سانچے میں ڈھال لیا گیا ہے۔

تعلیم جغرافیہ اور تعلیم تاریخ کی متعلقہ ذیلی کمیٹیوں کی دونوں دلچسپ اور پُر از معلومات رپورٹیں آپ حضرات نے سماعت فرمائیں میری دانست میں یہ نہایت کاوش و کوشش سے

مرتب کی گئی ہیں اور قابل قدر مواد رکھتی ہیں۔

تاریخ ذیلی کمیٹی متعلقہ تعلیم تاریخ کی رپورٹ میں نے بڑی دل چسپی سے سنی اور اس کے سننے سے مجھے بے انتہا مسرت ہوئی۔ پروفیسر ہنمنت راؤ صاحب نے اس مضمون کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ مجھے کمیٹی کی رائے سے بالکل اتفاق ہے اور میں نے اپنے صدارتی خطبہ میں اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا تھا کہ محض کتابی تعلیم کوئی نتیجہ خیز چیز نہیں جب تک بچوں میں قومی اسپرٹ پیدا نہ کی جائے۔ بدقسمتی سے ہم نے صرف واقعات و سوانح اور جنگ و جدال کے تذکروں کا نام تاریخ رکھ لیا ہے۔ ہم کبھی غور نہیں کرتے کہ تاریخ دراصل کیا چیز ہے اور تاریخ کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اسلاف کے نام اور متعلقہ سنین کا محفوظ کر لینا کافی نہیں ہے۔ تعلیم تاریخ کا مقصد اسی حد تک نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ آپ معلوم کریں کہ آپ پہلے کیا تھے اور اب کیا ہیں؟

جن حضرات نے ہربرٹ اسپنسر کے فلسفۂ تعلیم کا مطالعہ فرمایا ہے انہوں نے معلوم کیا ہوگا کہ تاریخ کی تعلیم کا جو مقصد ہے وہی مقصد یہ رپورٹ اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

ریاضی اور جغرافیہ باقی دو رپورٹیں (۱) علم ریاضی (۲) تعلیم جغرافیہ سے متعلق ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مضمون "تاریخ" بغیر "جغرافیہ" کے کارآمد نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ واقعات کہاں ہوئے تب تک کوئی فائدہ تاریخ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

تقاریر پہلی تقریر ڈاکٹر لطیف سعید صاحب کی بعنوان "شخصی حفظان صحت" اور دوسری تقریر "مدرسہ کی جماعت میں حکومت خود اختیاری" کے عنوان سے مسٹر ملانے کی۔ یہ نہایت مفید مضمون ہے اور مقرر کے دو سالہ ذاتی تجربوں پر مبنی ہے۔ اگر ہم اس پر عمل کرنا شروع کر دیں تو یقین ہے کہ بچوں میں بہت سے نیک جذبات کی نشو و نما ہوگی۔ ان میں آزادی خیال و عمل، خودداری، خود اعتمادی جیسے عمدہ خصائل کی داغ بیل پڑے گی اور مدارس کی تعلیم سے ہمارے بچے زیادہ مستفید و بہرہ ور ہو سکیں گے۔ اس تقریر سے مسٹر ملانے کل کے ناگوار واقعہ کی تلافی کر دی ہے۔

مسٹر ٹرنر کی انگریزی تقریر "تعلیم اور شہریت" پر تھی جس میں انہوں نے کہا کہ اچھا شہری بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی کے دل میں "آزادی کا خیال" پیدا ہو جس کے لئے دنیا میں

انسان پیدا ہوا ہے، مگر آزادی کے ساتھ "آزادی" وہ نہیں جو آج کل سمجھی جا رہی ہے۔ اس آزادی میں بعض خاص پابندیاں ہیں۔

آزادی پر جو شرائط عائد ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ کامل امن کے ساتھ خود بھی دنیا میں زندہ رہے اور دوسروں کو بھی جینے دے جو آزادی دوسروں کے امن و آسائش کو خطرے میں ڈال دے وہ جرم ہے اور گناہ۔ اس آزادی سے مراد وہ آزادی ہے جس کے حدود شرع اور عقل اور سوسائٹی نے مقرر کئے ہیں۔

مسئلہ تعلیم پر اظہار رائے مسئلہ تعلیم پر اس وقت کوئی تفصیلی رائے غیر ضروری ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جو ہر چیز کو مذہبی آئینہ سے دیکھتے ہیں یہ اشارہ بے موقعہ نہ ہوگا کہ دنیا کے سب سے بڑے معلم کو طریقہ تعلیم یہ سکھایا گیا تھا۔

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

پہلا حکم یہ ہے کہ یتلوا علیھم ایاتہ یعنے پہلے لوگوں کو ہماری آیات یعنے نشانیوں کی طرف متوجہ کرو یہ اسٹڈی آف نیچر ہے اس کے بعد اُن کا تزکیہ کر دیجئے اس طریقہ سے ان میں ذکاوت پیدا کرو اور جب اس طرح تیار کر لو تو نصاب مقررہ کی تعلیم دو اور جب طلبا رتیار ہو جائیں تو علم کے مصالحہ حکمیہ سکھاؤ یعنے اڈوانس کورس پڑھاؤ۔

یہ وہ طریقہ تعلیم ہے جو ہر زمانہ اور ہر ملک اور ہر قوم کے مناسب حال ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جس پر اس زمانہ میں تعلیم کے لئے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح لباس و خوراک ملک اور موسم کے حالات کے مُطابق ہونی چاہیئے بعینہٖ اسی طرح تعلیم بھی ہر ملک اور قوم کے حالات کو مدنظر رکھکر ہونی چاہیئے۔ یہاں کی تعلیم اور حالات اور ماحول کچھ اور ہے۔ اور دوسرے ممالک کی تعلیم اور حالات اور ماحول کچھ اور ہے۔ کیا وہ شہر ملک جہاں روز آفتاب نکلتا اور وہ ملک جہاں کئی دن آفتاب برآمد نہ ہوتا ہو اپنی معاشرت میں یکساں ہوتے ہیں۔ کیا دونوں مقاموں میں ایک ہی طرز کی عمارتیں بنائی جائیں گی اور ایک ہی قسم کا لباس پہنا جائے گا؟ میں اس وقت جو لباس پہنے ہوئے ہوں وہ یہاں کے حالات اور موسمی اثرات کی مناسبت سے موزون ہے لیکن اگر اس وقت میں کسی بہت سرد ملک

یا مقام پر ہوتا تو یقیناً اُس سے بہت زیادہ گرم پوشاک پہننے کے لئے مجبور رہتا
غرض یہ ضروری نہیں ہے کہ جو تعلیم اور جس قسم کی تعلیم مشرق میں ہوتی ہے وہی مغرب میں ہو اور جو مغرب میں ہوتی ہے وہی مشرق میں جاری کر دی جائے۔
غور طلب یہ امر ہے کہ کونسی تعلیم ہمارے بچوں کے لئے مفید اور سود مند ہو سکتی ہے۔
تعلیم وہی بہتر ہے جو انسان کو "انسانیت" کے معراج کمال پر پہنچا دے۔
اور تعلیم ایسی ہونی چاہیئے جو "فطرت صحیحہ" کو ابھارے اور قویٰ و اعضاء کا صحیح استعمال انسان کو سکھائے۔ آنکھ۔ ناک۔ ہاتھ۔ کان۔ زبان وغیرہ کو برے طریقہ پر غلط نہج سے نادرست اسلوب سے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اچھے طریقہ پر بھی۔ خدا کی اس دی ہوئی نعمت کا شکر یہی ہے کہ ان اعضاء کا صحیح استعمال ہو اچھی تعلیم ان خدا کی عطا کی ہوئی نعمتوں کے استعمال و استفادہ کا صحیح قاعدہ بتاتی اور آدمیت سکھاتی ہے۔
جناب ٹرنر صاحب کا مضمون نہایت دل چسپ ہے۔ بوائے اسکوٹس میری رائے میں سب تعلیموں سے زیادہ ضروری چیز ہے اور میں اس کو انسان کو انسان بنانے کے لئے اس قدر ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر قواعد اجازت دیں تو میں (اپنی محاسن پر ہاتھ رکھ کر) باایں ریش و فش اسکوٹ بننے کیلئے آمادہ ہوں۔ انسان بننے کے لئے "مذہب" کے بعد اگر کوئی اور ذریعہ ہے تو وہ "اسکوٹنگ" ہے
اچھی تعلیم کی غرض صرف یہ نہیں ہے کہ انسان زیادہ دولت کمانے کے قابل بن جائے بلکہ ضرورت تعلیم صرف یہ ہے کہ انسان کا دل مطمئن ہو سکے۔ انسان اچھی زندگی صرف اطمینان قلب ہی سے کر سکتا ہے عمدہ لباس۔ بہترین غذا۔ خوش نما مکانات۔ فراوانی دولت زیادتی طاقت و قوت وغیرہ "اچھی زندگی اور اطمینان قلب" کے ضامن نہیں ہیں۔
میں نے ایک حصہ عمر کا تجربہ گاہ عالم میں گزار دیا ہے اور میں بہت کچھ تجربہ رکھتا ہوں۔ اگر آپ کثرت مال و زر کو باعث اطمینان قلب سمجھتے ہوں تو میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے حیدرآباد میں ایک اتنے بڑے دولت مند ساہوکار کو دیکھا ہے جس کی صرف سود کی ماہانہ آمدنی سوا لاکھ تھی مگر وہ کبھی مطمئن نظر نہیں آیا۔ اگر دولت ہی وجہ اطمینان دلی ہوتی تو وہ بہت زیادہ مطمئن ہوتا جس طرح دولت سے اطمینان

نہیں حاصل ہوتا اسی طرح محض قوت و طاقت قابل اطمینان نہیں ہے۔ ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب کا نام غالباً آپ نے بھی سنا ہوگا وہ کچھ عرصہ پہلے حیدرآباد میں آئے تھے۔ تنومند اور طاقتور آدمی تھے۔ ان کی قوت کا اندازہ یوں کیجئے کہ "چھنگلی" کے برابر موٹی کوئی ۳ × ۵ انچ چوڑی آہنی پٹی کو ہاتھ سے اس طرح بالکل موڑ دیتے تھے جیسے ربڑ یا کسی اور نرم چیز کو۔ لیکن میں نے ان کو اس قابل حیرت "قوت و طاقت" پر بھی "مطمئن" نہیں دیکھا۔

نہایت حسین و جمیل عورت ہو یا مرد وہ بھی حسن و جمال سے مطمئن نہیں اور کیوں کر ہوں جبکہ اطمینان محض حسن و دولت و قوت و آزادی وغیرہ پر منحصر نہیں۔

ایک لیڈر، ایک ڈاکو، ایک رہزن، ایک غارتگر، ایک قزاق، ایک خائن، ایک قاتل جو قانونی شکنجہ میں نہ آسکتا ہو اور جس سے اس کے حرکات ناشائستہ کا انتقام قانوناً نہ لیا جاسکتا ہو اس کا ضمیر خود اس کو ملامت کرتا رہتا ہے اور وہ اپنے پیشہ اور اپنے اس مقصد نازیبا میں کامیاب رہ کر بھی بے اطمینانی اور بے چینی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ مجرم تو آزاد رہ کر بھی کبھی مطمئن نہیں رہ سکتا مگر غیر مجرم کو اور پاک دل کو جیل میں بھی اطمینان نصیب ہوتا ہے اور وہ قید خانہ کی صعوبتوں میں بھی مطمئن رہتا ہے۔ پس تعلیم ایسی ہونی چاہیئے جو دل کو مطمئن کرسکے جو خود مطمئن ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی مطمئن کرسکتا ہے اور یہ اطمینان ہی انسان کو انسان بنا سکتا ہے۔ جب ہم انسان تھے تو ہم سے ساری دنیا مانوس تھی۔ مذہبی کتابوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ جب تم کسی طرح خوف زدہ ہو تو تم کو قبرستان میں پناہ لینا چاہیئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کے قبرستان بھی پناہ گاہ ہوسکتے تھے لیکن آج تو زندہ مسلمانوں کے محلے بھی لوگوں کو مامون نظر نہیں آتے ہیں۔

پڑوسی کے ساتھ سلوک سے پیش آنے کے لئے حضرت سرور عالم نے اتنا زور دیا تھا کہ صحابہ یہ خیال کرنے لگے تھے کہ وہ بھی وارث قرار دیا جائے گا لیکن آج پڑوسی کیا حقیقی بھائیوں کے ساتھ ہمارا کیا عمل ہے؟ جہاں ایک انسانیت کا کال ہے وہاں تعلیم سے کیا حاصل ہے! اس لئے تعلیم سے پہلے انسانیت پیدا کرنا ضروری ہے خدا کرے آپ کی یہ کوشش بارآور ہوں کہ ہم پہلے انسان بنیں اور اس کے بعد زیور تعلیم سے آراستہ ہوں، ورنہ ایک مادی پتلے کو لباس پہنا دینے سے انسانیت حاصل نہیں ہوسکتی۔

مجھے امید ہے کہ آپ کی یہ کانفرنس لوگوں کے دلوں میں تعلیم کی جانب رغبت پیدا کرے گی اور

استادوں کو بہترین اُستاد بننے کا موقعہ بہم پہونچائے گی۔ میں نے آپ کا بہت سا وقت اپنی تقریر میں اُلجھا کر ضائع کیا ہے جس کے لئے میں معافی کا خواستگار ہوں۔

تنقید و تبصرہ

سالنامۂ دکن پنچ بابتہ ۱۹۳۰ء "ہنسو اور موٹے ہو جاؤ" کی نصیحت ایک عرصہ سے سنتے چلے آئے ہیں لیکن ارسطو و فلاطون سے لے کر بو علی سینا تک اور بو علی سینا سے لے کر شفاء الملک مرحوم تک کسی نے کوئی انبساط آفرین و خندہ پرور نسخہ تجویز نہیں کیا۔ خدا بھلا کرے ہمارے لائق دوست حاذق و ماہر حکیم ڈاکٹر جگنناتھ پرشاد صاحب وکیل ہائیکورٹ کا کہ انہوں نے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون کون سے قرابادین کی چھان بین کر کے ایک مفرح اعظم تیار کر دیا ہے جو فلاح عام کے لئے "دکن پنچ" کی دل فریب و دلکش صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ "دکن پنچ" بہادر و اودھ پنچ" کے قریبی رشتہ دار ہیں ممکن ہے کہ ہوں۔ لیکن ہم کیا سبھی یہ پہلی ہی نظر میں کہہ دیں گے کہ "بسیار خوبان دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری"۔ دکن پنچ بہادر مرنجاں مرنج صلح کل ہیں۔ خود ہنستے ہیں اور دوسروں کو ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے ہیں۔ پالیسی کے نام سے گھبراتے ہیں اور اللہ میاں کی گائے کی طرح ملک و مالک کی خدمت اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

مضامین کا تنوّع قابل داد ہے۔ اور کیوں نہ ہو اڈیٹر صاحب بھی تو ہر فن مولا ہیں مضامین باوجود سنجیدگی کے ظرافت کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ دل نشین مواعظ مذاق کے پیرایہ میں ہنسی ہنسی میں سوسائٹی کے نقائص و سقم کی اصلاح۔ وعظ و پند کے کڑوے گھونٹوں میں تفنن و تفریح طبع کی چاشنی اس حکمت کے ساتھ دی گئی ہے کہ تلخی مطلق محسوس نہیں ہوتی اور دوا اپنا اثر غیر معلوم طریقہ پر کئے جاتی ہے۔

باطنی محاسن کے ساتھ ساتھ ظاہری خوبیوں کی کمی نہیں سرورق دیدہ زیب مطلا و مذہب و مصور ہے جس کو دیکھتے ہی تبسم آفرینی شروع ہو جاتی ہے۔ طباعت عمدہ۔ کاغذ نفیس۔ تصویریں نہایت اعلیٰ درجہ کی اور تعداد میں عدیم المثال۔ ان تمام خوبیوں کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسا شاندار سالنامہ غالباً اردو رسائل کبھی نہ پیش کر سکیں گے۔ ان پر طرہ یہ کہ قیمت صرف (عمہ) سکہ عہ۔ ہم اس اشاعت پر حکیم جگنناتھ پرشاد صاحب کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔

---

appreciation of the lectures delivered by Mr. Fakrul Hasan and Mr. Turner. He called special attention to the remarks made by the latter on the value of Boy Scouting and said that the training in character which this movement aimed at should be an essential element in the education of every boy. In his opinion, he said, scouting ranked in importance only next to religion.

After Mr. Ali Akbar had proposed a vote of thanks to the President and others who had helped to make the Conference and the Exhibition a success, the proceedings of the Conference came to a close.

Mr. S. Ali Akbar, President of the Association, then read the resolutions passed at the previous conferences and briefly explained what action had been taken on each of them. After this, he proposed on behalf of the Central Executive Committee that three Sub-Committees be appointed to prepare reports for the next Conference on "The Teaching of Science", "Moral Training in Schools", and "The Teaching of Drawing". The Conference, while accepting this proposal, empowered the Central Executive Committee to settle the personnel of each of these three Sub-Committees.

Mr. W. Turner, M. A., Principal of the Nizam College, then delivered an able and instructive lecture on "Education and Citizenship." He referred to the experiments in self-government which are being made in the West. He also described the House System in the English Public Schools and explained how it helped in creating in the boys a sense of duty and responsibility. Finally, he stressed the importance of team games and Boy Scouting, particularly the latter, as a means of training in citizenship. The Boy Scout movement, he said, was especially valuble in India where there was a deplorable lack of leadership.

After distributing the Exhibition prizes, the Chairman Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, in his concluding remarks said that the best feature of the work of the Hyderabad Teachers' Association was the appointment of Sub-Committees for preparing reports on the various school subjects. He considered the reports adopted by the Conference this year to be of great value, especially the Report on History, the authors of which had paid due regard to that national view-point, the importance of which he had tried to emphasise in his Presidential Address. With regard to the resolutions passed by the Conference, he remarked that most of the questions to which they referred were already under the consideration of Government. He expressed his great

Mr. Moinuddin Quraishi, M. A., Head Master, Asafia Middle School, seconded Mr. Zahoor Ali. Mr. Shaik Abul Hasan, B. A, B. T., Inspector of Schools, Nalgunda District, offered some useful suggestions with regard to the organisation of adult education in the districts. The resolution was then passed unanimously.

Rev. L. Simpson, M. A., Principal, Wesleyan Mission High School, read the report of the Mathematics Sub-Committee, which was adopted unanimously.

The next item on the programme was the consideration of the following resolution :—

"This Conference recommends that, as in the H. S. L. C. Examination, Commerce should be introduced as an Optional subject in the Osmania Matriculation Examination".

Mr. Baqur Mohiuddin, B. Com., Lecturer in Commerce, who moved the resolution, spoke with great enthusiasm on the important part played by commerce in a nation's prosperity and explained the advantages of the study of commerce. After the resolution had been seconded by Mr. Gulam Mahmood, it was put to vote and carried unanimously.

In the afternoon, the last resolution on the programme was moved by Mr. Syed Mujtaba Husain Naqvi, B. A, B. T., Head-Master, Nampally High School :—

"In view of the need for introducing manual training in all grades of schools, this Conference recommends that until provision is made in the State for the training of teachers in manual instruction, an adequate number of stipends should be sanctioned annually by Government to enable teachers who have a special aptitude for the subject to undergo a course of training in British India."

After explaining the educational advantages of manual training, Mr Nakavi pointed out the need for securing well trained teachers for this subject. Mr. Nazir Husain Sharif, who seconded the resolution, spoke on the economic value of vocational education. Like the other resolutions, this resolution was also carried without a division.

pectively and strongly urged the necessity of providing a special school for improving the lot of these children and at the same time making them more useful members of society. Seconding the resolution in Urdu, Mr. Gulam Dastagir, B. A., gave a brief sketch of the history of the education of defective children in Europe. The resolution was adopted unanimously. Mr. Syed Fakhrul Hasan then read a very interesting and illuminating paper in Urdu on "Class Self-Government," in which he described the experiments in self-government successfully carried out by him in his own school, the Chanchalguda Government Middle School.

Mr. S. Zahoor Ali then moved the following resolution :—

"**That in view of the large volume of illiteracy prevailing in the State, this Conference urges the necessity for taking vigorous steps for the advancement of adult education at the Head-Quarters as well as in the districts**".

After inviting attention to the low percentage of illiteracy in India, Mr. Zahoor Ali referred to the useful work of the Seva Sadan in Bombay and Poona and to the rapid progress of adult education in the Panjab. Among the suggestions he made for popularising adult education in H. E. H. the Nizam's Dominions were :—(1) Adult classes should be opened in prisons and village chaurees. (2) In filling up the posts of menials in Government offices and private business firms, preference should be given to literate candidates. (3) Village officers who take an interest in adult education should be given encouragement by Government by the award of *sanads* or certificates. (4) Contractors, managers of mills and others employing labour on a large scale should be compelled by legislation to lessen the hours of work for labourers attending night classes. (5) The District Local Boards and municipalities should give financial help to adult schools. In conclusion, Mr. Zahoor Ali dwelt on the possibilities of the wireless as a means of adult education.

ing superstition. The mere teaching of theory without practical work, he said, would never secure these advantages. A well-equipped laboratory was indispensable for proper scientific training. Mr. Sardar Khan also referred to the value of a knowledge of hygiene, and in this connection, described the unhealthy environment of the majority of the students at Hyderabad and in the districts.

In the afternoon the Reports of the Sub-Committees on the Teaching of History and Geography were read by Professor Hanumantha Rao and Rev. F. C. Philip respectively and adopted without a division. Mr. S. Fakhrul Hasan, B. A., B. T., then moved the following resolution :—

"This Conference recommends that with a view to make instruction in Oriental Languages more efficient, provision should be made in the Osmania Training College for Training such teachers with Oriental qualifications as are in service at present".

Moulvi Hisamuddin Saheb, who spoke on the resolution after it had been seconded by Mr. Abdul Majeed, took exception to certain remarks made by Mr. Fakhrul Hasan with regard to the mental equipment and efficiency of teachers of Oriental qualifications. The President also expressed his strong disapproval of these remarks and told Mr. Fakhrul Hasan that an apology was due from him. After explaining that nothing was further from his mind than to wound the susceptibilities of teachers of Oriental qualifications, Mr. Fakhrul Hasan expressed his regret for any inadvertent remarks in his speech which might have given offence to them. The resolution was then put to vote and carried unanimously.

The first session on the second day commenced with the moving of the following resolution by Mr. V. Hardikar, Principal, Vivek Vardhini High School :—

"In the opinion of this Conference it is high time that a school for defective children was started at the Head-Quarters with a hostel attached thereto".

Mr. Hardikar described the methods usually employed in educating the deaf and dumb and the blind children res-

that apart from the advantage of science as an aid in preparing boys for the modern scientific and semi-scientific professions, there was the obvious value of scientific training as a mind developer. Continuing, he said, "In elementary physics and chemistry stress is laid on the external conditions or the environment. Hygiene is the special study of the environment under which the human organism has to live and develop. Just as many chemical reactions and physical phenomena require a suitable environment if they are to be demonstrated successfully, so does that complicated mass of chemical reactions and physical phenomena which go to make up the mortal part of us, *i. e.*, our bodies, require an even still more carefully adjusted environment, if we are to attain our best. Even a great soul in an inadequate body is sure to be hampered from developing to its full; and it is surely our duty to do the best we can and to live as efficiently as we can. It is only those cognisant of the cardinal principles of hygiene and the allied branches of science, physics and chemistry, who stand a fair chance of attaining the ideal of health and happiness and of usefulness to their fellows, their society, their profession, and to their country. It is from among such that the future leaders for this country, even as it is for other countries, will be chosen All this is not often realised, alas, till too late in the careers of our students, who only realise the vast importance of a sound understanding of the fundamental facts of these branches of science when their school career is well nigh completed Then, should they wish to prosecute the study of these subject at college, they find that they have not a sufficiently solid foundation, if any, to enable them to do so".

Mr Sirdar Khan, B. A., B. T., Science Assistant, Darul-Uloom High School, seconded the resolution in Urdu. He explained how the study of science helps in training the minds of the pupils, in teaching them physical geography, making them understand their environment and in remov-

Every-one who holds a degree is not necessarily qualified for the task of teaching. "In the selection of teachers," he said, "personal and moral excellence should weigh equally with academic qualifications". Referring to our present system of education, he deplored the lack of ideals. The aim of a student should be to acquire knowledge for its own sake. While recognising the need for the introduction of technical and vocational courses, he pointed out that for the scheme of vocational education which Government were expecting to put into force shortly, a change was necessary in the out-look of the student, whose sole aim at present was to enter into Government service. Nawab Akbar Yar Jung Bahadur's remarks on the need for re-organising the system of education on national lines and on the task lying before the Osmania University deserve careful thought and attention. In the end, the learned President referred to the work of the Teachers' Association in terms which were very encouraging to the members of the Association.

The Presidential Address was followed by a lecture on "Personal Hygiene" by Dr. Latheef Sayeed, M. B., Ch.B., Ch.B., Lecturer on Physiology and Hygiene in the Teachers' Training College. His address was the more interesting and entertaining because of the unconventional and original manner in which he approached the subject. It is worthy of careful study by teachers, especially that portion of it wherein he has endeavoured to impress on their minds the fact that it is as much their duty to take care of the body of the child as to train its mind.

The first sitting of the Conference closed with the adoption of the following resolution :—

"This conference recommends that Science, including Hygiene, should be made a compulsory subject in the Middle stage and that immediate steps should be taken to provide each middle school with a qualified science teacher and a well- equipped laboratory".

In moving the resolution, Mr. R. S. Hughesdon, B.A, Vice-Principal, St. George's Grammar School, remarked

Akbar Yar Jung Bahadur, Home Secretary. The attendance was very good, especially during the first and the last sittings. The Director of Public Instruction and many other prominent officers of the Educational Department were present at all the sittings.

The proceedings of the Conference were conducted according to the programme which appeared in the last issue of the *Hyderabad Teacher.* In his interesting Welcome Address, Mr. Syed Zahoor Ali, B. A., B. T., made an impassioned appeal to the parents to show greater interest in their children's education and to teachers to work with greater zeal and earnestness. He also stressed the need for the formation of a Central Teachers' Association for the whole Dominions and suggested the amalgamation of the *Almoolim* and the Urdu section of the *Hyderabad Teacher.*

The General Secretary's report for the Year 1929-30 shows an excellent record of work. The year saw the establishment of a Teachers' Library and a Teachers' Co-operative Society. The three Sub-Committees, which had been appointed to prepare reports on the Teaching of History, Geography and Mathematics respectively, worked longer and more systematically than the Sub-Committees which functioned in the previous year. The financial position of the Association is quite sound, though funds are badly needed for improving the library of the Association.

The Presidential Address delivered by Nawab Akbar Yar Jung Bahadur was extremely inspiring and thought-provoking. In his eloquent Urdu he reminded the teachers that their profession was the most sacred and honourable profession in the world and exhorted them to study psychology and make themselves efficient teachers, so that by employing the right methods in training the minds and emotions of their pupils, they might be able to make them useful citizens. He also showed how important it was that only the right type of men should enter the profession.

B. World Geography. Method of presentation will depend on the knowledge or interest of the teacher, may be scientific, economic, or historical.

C. Home Geography. Its function at this stage that of a test of principles. Need for individual work.

D. Map work. Full acquaintance with contours, transverse sections etc. Organization of school journeys and excursions.

C. MEDIUM OF INSTRUCTION.—Importance of making new ideas clear by the use of the mother-tongue. Difficulties in the High School Stage.

D. RECOMMENDATIONS.—

1. Geography should be made a subject of study in the Indian universities.

2. The present school curriculum in Geography should be revised and suitable text-books should be prepared, especially in the vernaculars.

3. The teaching of Geography should be entrusted to better qualified teachers.

4. Special encouragement should be given to teachers wishing to specialise in Geography.

5. Refresher courses in Geography should be instituted.

6. A Geography Room to serve as a sample room to teachers of Geography should be established in the Osmania Training College

7. School libraries should be well provided with suitable Geography books.

8. A Children's library should be established in Hyderabad.

9. Educational journeys should be organised with financial assistance from Government.

10. One of the conditions for the award of a building grant to an aided high school should be that the management undertake to provide a geography room with suitable apparatus.

S. ALI AKBAR, *(Chairman.)*
Miss F. N. WOOKEY, *(Secretary.)*

Proceedings of the Fourth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

The above Conference was held at the City College on the 3rd and 4th July, 1930 under the presidency of Nawab

SUGGESTED NEW CURRICULUM.

Standard 2. (A) Observational work. (B) Stories of children of other lands.

Standard 3. (A) More detailed observational work leading to simple geography of the town or district. (B) Study of the Globe, and more systematic treatment of further stories of other lands and peoples, with visual Map work to illustrate the stories.

Standard 4. (A) Further simple study of the world and its people with special reference to the world position of India. (B) Geography of India in broad outline. (C) The Nizam's Dominions. (*a*) Natural Regions ; (*b*) Political divisions and towns.

Form I. (A) Broad regional Geography of Eurasia. (B) Political Divisions of Asia, chief natural regions and characteristics. (C) Geography of India with special reference to the Dominions.

Form 2 (A) Broad regional Geography of the Eastern Hemisphere. (B) Revision of Asia, and the monsoon lands of the Eastern Hemisphere in greater detail. (C) Geography of Europe. Typical regions. (D) Trade routes of Eurasia: Land, sea and air.

Form 3. Revision of Asia and Europe. Geography of three Southern Continents. Geography of North America. Chief physical features, climate and production of typical areas only. Chief towns within the selected areas.

Suggestions for work in the three stages, Primary Middle and High School.

METHODS OF TREATMENT.—Primary Stage.

A. Stories. Accounts of life in other lands, Travelling stories. LEADING facts only required.

B. Home Geography. Talks about the immediate neighbourhood. Rambles.

C. Practical and Observational Work. Teachers' Aids. "Pictorial Education", Pictures, Sand Trays. Need for much co-operative expression work.

D. Map work. Introduction and development of map work. Working of simple problems. Use of models.

A. World Geography. Need for clear visualization of general distribution of land, water, high lands and low lands.

B. Home Geography. Closer study of selected areas and development of method of treatment to suit the psychological needs of the children.

C. Map work. Much attention to be given to maps. Range of temperature, and amount and period of rainfall deciding factor in classifying climate.

High School Stage.

A. Method of treatment. Markedly different from that hitherto used. Child the research student, the teacher the director and guide.

Summary of the Report of the Sub-Committee on the "Teaching of Geography".

PRELIMINARY OBSERVATIONS.

ADVANTAGE OF THE STUDY OF GEOGRAPHY. Stimulates observation, thought, imagination, judgment and reasoning. Ends in true patriotism, a sense of civic duty, and international goodwill.

RELATION OF GEOGRAPHY TO OTHER SUBJECTS.

Very close connection between the study of Geography and that of other subjects. Cannot be understood without some knowledge of science. Has much in common with practical arithmetic. Is the handmaid of history. Making of maps and models is a good exercise in handwork. Geography furnishes much material for composition.

SCOPE OF THE WORK. Because of its range a selection of material is essential. The syllabus should serve only as a guide. Each school should have a full scheme drawn up in detail showing the apportionment of the work for each month of the school year.

DEFECTS IN THE TEACHING OF GEOGRAPHY. (*a*) Lack of knowledge. (*b*) Lack of training. (*c*) Lack of equipment. (*d*) Lack of correlation and co-ordination.

REMEDIES. 1. Reading of suitable books, and study of principles. 2. Knowledge of common errors viz: (*a*) Lack of correlation. (*b*) Too hasty generalization. (*c*) Rigidity of treatment. (*d*) Lack and consequent neglect of study of natural regions. (*c*) Drawing instruction in the Primary stage from too small a field. Illustrations taken from too small an area are not all in a form suitable for young children. (*f*) Neglect of practical work. (*g*) Neglect of atlases, wall maps and sketch maps. 3. Knowledge of the value of maps and atlases.

PURPOSE OF MAP STUDY. (*a*) To record definite facts accurately. (*b*) To enable them to be visualised and thus easily recalled.

RESULTS OF MAP STUDY. (*a*) Familiarises the child with conventional colouring. (*b*) Makes acquisition of more facts much easier. (*c*) Economises time by use of sketch maps. (*d*) Allows of easy memorising of chief lines of latitude and longitude of given area. (*e*) Knowledge of latitude and longitude framework makes memory drawing much easier and more accurate. (*f*) Clarifies ideas about climate.

B. THE CURRICULUM.

There is need for radical revision of present curriculum, so that the study of the world may be more evenly distributed over the three stages of the school course, and approached from a more scientific standpoint.

nate spitting. It is obvious that these measures cannot be operated successfully unless there is forthcoming the close and continuous co-operation of the people themselves irrespective of castes and creeds, for disease germs are quite impartial in the selection of their victims.

As I have said before, man must live in groups, large or small, more often large. A potential Buddha also has no right to run away from Society, though even a Gandhi finds it cowardly to seek solitude. If man must live in groups, he should have the sense to see that his life is bound to have influences—physical as well as moral—on those with whom he lives in contact, immediate or remote. Personal Hygiene, therefore, carried a step further, becomes Domestic Hygiene where people of one household have to co-operate with each other. With the exercise of a little imagination, it would not be difficult to understand what is meant by Stage Hygiene and, reaching the climax, the greatest achievememt of the League of Nations, the Health Branch, comprising all the nations of the world, whose aim is to prevent the spread of disease from one part of the world to another, and to localise and ultimately eradicate the diseases in different parts of the world. But, before we can qualify ourselves to render any assistance to this noble movement, it is necessary that we begin with the small and necessary beginnings.

neighbours, and not only against immediate neighbours as distant as one part of the world from another.

Individual Personal Hygiene is, comparatively, an easy affair. For it is nothing more than the necessary periodical, and, under modern conditions, the daily cleaning up of the body with clean water; the timely elimination of outgrowth like the hair and nails; the care of the mouth, the dirtiest part of the body owing to its congested population of 32; more attention to the massage of the gums rather than to the rubbing of the teeth themselves; the proper regulation of bowels by proper diet, consisting as much as possible of natural uncooked food and as little of animal or overcooked and highly-spiced foods; the adoption and maintenance of suitable daily physical exercises; the protection of nose and throat, two important channels of entry of certain fatal disease-germs; necessary and timely attention to eyes, which, in Nature meant merely to see things, are now being put not only to the extraordinary purposes of reading and writing but for the performance of the most delicate tasks, often in artificial light.

Having done all this, there still remain dangers threatening man at every stage of his life. These arise from the prevalance of certain diseases:—

Blood-borne diseases like Malaria, Plague, and Small Pox; Water-borne diseases like Cholera, Typhoid fever, Dysentery; Air and Dust-borne diseases like Consumption and Pneumonia.

All these can be prevented, or when they do occur, their spread can be checked or controlled by suitable measures now known to all those interested in Public Sanitation, and consisting chiefly in the rapid and safe disposal of refuse; the provision of clean and sufficient water; the building of ratproof markets; the construction of suitable dwelling houses for the inhabitants; the elimination of dust and the prevention by Law, if necessary, of indiscrimi-

is no such thing as "Muslim" dress, and for the Hindus to bear in mind that asceticism in apparel must remain the privilege of the Rishi alone; and a Rishi, as certainly as he has business *with* the crowd, has no business *in* it.

With regard to houses-private or public-their sites and dispositions will have to be decided by the climatic conditions of their situations and the needs they are required to serve. They must, however, receive adequate attention with regard to the provision of light and air, the fulfilment of certain conditions for the preservation of health and the prevention of disease, and a scrupulous maintenence of the natural beauty of surroundings.

The human body is like an engine, but a very complicated one. Nature, in various ways, takes care of the engine and its working; but, nevertheless, man himself has it in his hands to help the engine to run smoothly, or, by his carelessness and intemperateness, spoil certain of its parts, and thus bring about its early stoppage or shorten its normal span of working (premature death). Natural death in its strictest sense occurs only when the parts of the body are thoroughly worn out-old age. This, in different parts of the world, shows, within certain limits, variations which are brought about by climatic conditions as well as the degree of wear and tear to which parts of the body may be exposed. Personal Hygiene therefore means the keeping of the body and its parts clean and in working order by struggling against adverse climatic conditions and removing or counteracting the undesirable effects of the necessary wear and tear involved in the physical and mental activities of life. But with the growth of large towns and cities, and the progressively increasing facilities in the means of transport tending to make different parts of the world almost next-door neighbours, this definition of Personal Hygiene has undergone a tremendous extension. Man, therefore, has now not only to protect himself from himself but from his

also hope that when he does come, we shall not need to pray for him.

I shall divide the subject into two parts. The Externals, namely such things as are outside our body; and those that are connected with the body itself.

The Externals include sunlight and air; water and food; our clothes and our houses, private and public. Man often seems to forget that he is an open-air animal. If he realises this he will contrive to get all the benefit he can from both light and air, avoiding only such inclement conditions as are severe or in his experience hurtful. He can do this by making his houses serve the purpose of temporary refuge rather than of permanent hiding. In Nature air, food and water are all essentially clean. They are made dirty and disease-bearing by man's own wrong and intemperate living. And, therefore, living as he has to in groups, he should, individually and in vigilant co-operation with others, see to the avoidance of their contamination, and where such contamination is unavoidable, to see to its speedy removal and safe disposal. He should also realise that the lesser the physical work, the lesser is the real demand of his body for food. If the town dweller reduced his eating to the normal needs of his body, he would not only keep better health, but would also assist in bringing down the prices of food-stuffs to reasonable levels.

The purpose with which man has gradually come to cover his body is mainly protection from heat and cold. Beauty and attractiveness in apparel are only secondary considerations. The tendency of modern dress, however, is to exaggerate the one and fail to realise the other. Sanity in the matter of clothing, obviously, lies in covering the body in a manner that would give it a covering without discomfort and appearance of barbaric show hurting the eye. The attainment of some uniformity in apparel is decidedly helpful in creating a feeling of national solidarity. In this connection, it would be well for us to remember that there

guided by an intelligent application of our knowledge and experience. Unions between men and women must be based on their free and intelligent choice if you wish them to produce healthy and strong children; and all such social and religious tendencies that go counter to this principle must, therefore, be ruthlessly discarded. Surely, the human species deserves at least as much consideration and thought as fruits and cattle.

One parent unhealthy, or what is worse, both parents unhealthy, cannot help producing unhealthy children, unless they are rigorously honest about their business. Such unhealthy children in the present state of our society, with a monstrously unhealthy proportion of beggars, parasites and toadies, who pass for "holy men", or "big men", and an ever incressing number of idle dependents or honest unemployed, are a great meance in more ways than the man in the street can realise. Having signalled the danger and indicated its direction, let me leave the unhealthy-born to the care of the physician and the surgeon or the quack and the barber to do his best or preferably his worst, remembering in this connection that there are perhaps as many quacks inside the profession of the scientific practitioner as outside it.

Let us turn now to the child who is born healthy, or born with merely such defects as are amenable to efficient treatment. Here again I must skip over that dangerous period of infancy and childhood which only an intelligent and well-informed mother can see her child through. A real consideration of the subject of "personal hygiene" as such begins at this stage, when a child can be helped and made to understand how to take care of its body. Members of the teaching profession should consider it as much their duty to get the child in the right path in this respect as it is their duty to see to the training ot its mind. They must, of course, be assisted in this by the Medical Inspector of Schools. Let us all pray for his early coming. And let us

The subject of "Personal Hygiene" has been dealt with, directly and indirectly, often enough in lectures, books, and even in religious discourses ; but, like the motor-horn, fails to draw the necessary attention from those for whom it is meant. I have been lecturing on the subject for more than six years now to the mofussil teachers who come up here for training, and find it making not the slightest difference in the daily lives of the teachers so far as one can judge from their mode of living in the boarding houses. I therefore propose to discard the usual routine manner of dealing with the subject.

Do not run away from fresh air; eat wholesome food ; drink clean water; take regular exercise; have a daily bath ; wear light clothes; take care of your eyes; remember abnormalities of the ear, nose and throat ; sleep sufficiently long ; avoid intoxicants ; and exercise moderation in everything. This is a brief summary of the usual lectures on the subject of personal hygiene. There can be no object served by my repeating these injunctions before a gathering like this. I shall therefore try to treat the subject in an unorthodox and unconventional manner, hoping to shock into some sort of action such of your brain-cells as are in danger of atrophy from disuse.

Let us begin at the beginning. We are what we are because of our parents both immediate and remote. Some of our parents were wise by accident, and mating with appropriate partners produced healthy children, at least physically so. But what about the large number of us who are born with various kinds and degrees of handicaps in the shape of physical and constitutional diseases? Such handicaps can be prevented only by the future parents remembering that Nature requires certain definite types to come together with a view to produce the healthy and desirable types of off-springs. All matings, therefore, before we glorify them by the name of "Marriages", should be such as to conform to, rather than oppose, the promptings of Nature,

Personal Hygiene

BY

DR. LATHEEF SAYEED, M. B., CH. B.

"MENS sana in corpore sano."; "Cleanliness is next to Godliness"; Prevention is better than cure". The idea underlying similar sayings has been universal; but in practical life an intelligent grasp of its implications is as universally missed. The Mussalman, forgetting that the scarcity of water in the home of his religion was compensated for by the apparently cruel but actually kind and generous heat of the sun cleansing up his wisely half-clad body, continues, even in this country of abundance of water, to feel himself merely religiously clean where he can easily afford to be scrupulously clean. The Hindu goes on priding himself on his daily bath and keeps on forgetting that it is more ceremonial than real because of the doubtful cleanliness of the water he uses. The Mussalman thinks there is "culture" in his clothes, though the clothes may be unnecessary, unsuitable and even dirty. The Hindu, on the other hand, on grounds of simplicity, ignores the fact that civilised man must give a decent covering to his body if only for the sake of decency in association with fellow-men. Similar instances of muddle-headeness will occur to you in the matter of food, and in the general care of both the body and mind. Mainly ignorance, to a great extent what I may call the habit of habit, and poverty—these are some of the causes of the insanitary lives we lead. But above all these, I would place the pernicious philosophy of life which makes you submit to poverty as providential. No. Dirt and Disease, and even Poverty, are not inevitable.

4. In all examples Social Utility should be the end in view: for this reason we have suggested the inclusion of stocks and shares, taxes, bazaar interest etc. in the curriculum, because boys will actually have to make such transactions in their post-school days.

In order to make this Report effective, the Committee make the following suggestions to the Education Department.

(1) Principals of Schools should be encouraged to make innovations and experiments even though this causes a deviation from the prescribed curriculum. (*e. g.* Adaptations of the Project Method). The Inspector will decide whether such experiments are fruitful or not and will accordingly either give or withhold his sanction.

(2) The curriculum should be revised and the subjects prescribed should be stated in greater detail in order to give better guidance to teachers.

(3) A Book of Examples on the lines suggested in this Report should be prepared by the Department. This will secure the use of local measures and coinage, will give the requisite local colour and will put the right kind of sums in the hands of the teachers.

4, All efforts towards an improvement in the teaching of mathematics will be futile unless a lead is given in the Public Examinations. For the average boy the examination is " the master light of all his seeing" and he will think that anything not in line with that is beside the mark. The Board of Examiners can do more than all the books ever written to encourage a right point of view.

Members of the Sub-Committee.

Rev. L. Simpson. M. A., (Chairman), Mr. G. Sundaram, B. A. (Secretary), Miss D. M. Clough, B. A., Messrs. Venkatasulu, B. A., R. S. Hughesdon, B. Sc., V. V. Hardikar, Din Dayal Naidu, L. C. Bhogle, B. A., B. T., Abdul Latif, B. A., B. T., S. Gulam Mahmood.

the spice of mathematics as well as of life. This implies that from the very beginning mathematics should deal with problems. The mechanical part of mathematics is only its skeleton, problems are its flesh and bones. Moreover, since in life situations there is need to discriminate between essential and non-essential facts, problems should be framed, which contain irrelevant details.

2. Questions should as far as possible deal with things which a boy can visualise, so that he may realise that he is dealing with *things* and not with mere figures. Let trains run from Secunderabad to Kazipet: let steel beams be brought from Bombay to Hyderabad: let horses run on the Fateh Maidan. In this connection, it is important to make the figures approximately correct. If the cost of rice is concerned, let it be somewhere near the prevailing price and measured according to local usage.

(*a*) A train leaves Hyderabad at 9. 10 and arrives at Vikarabad at 11. 5. It makes three stops of three minutes each on the way. If the distance is 45 miles, what is the speed of the train?

(*b*) Three adults and one child make this journey. What is the cost of the tickets at 3ps. per mile?

(*c*) Six eggs are sold for 5 annas. How much for 51 eggs?

(*d*) Rice is 5 seers per rupee. How much for 27½ seers? (methed of grouping).

(*e*) 7 Turkeys are bought for Rs. 21-4-0. They are kept for 60 days at a cost of ¾ anna each per day. If they are sold at Rs 6-12-0 each, what gain will there be?

3. There is a common tendency to set sums with large numbers. Such sums should be set only *occasionally*, for they require the maximum of mechanical work with the minimum of thought. By what possible interest can a boy be stimulated in multiplying Rs. 38476-14-4 by 347? As far as one can see, the chief value of such examples is to provide a rest for the teacher. Instead of taking up a whole lesson with two long sums, it will often be more profitable to set a dozen small problems.

Standard 3 :—Numeration to 100,000. Addition and subtraction up to a lakh; remaining multiplication tables; multiplication and division by two digits. Rupees, annas and pies may be used in examples, but not such as involve reduction from one denomination to another. Simple notions of such fractions as $\frac{1}{2}$, $\frac{1}{4}$, $\frac{3}{4}$, all in concrete form.

Standard 4 :—Extension of four simple rules to money sums (Indian money), involving reduction. Special emphasis on simple bazaar transaction. Large numbers should be discouraged; easy addition of concrete fractional quantities not requiring the finding of L. C. M. Squares and rectangles to be drawn to given measurements. Objects in the class-room to be measured and drawn to scale.

Middle :—The present curriculum seems satisfactory. What is needed here is rather a change of method and a more practical type of questions. Local measures should be used and the use of foreign money should be eliminated.

High :—Arithmetic should include an elementary knowledge of stocks and shares; more attention to be given to sums dealing with rates and taxes. Interest sums should include examples of transactions with the bazaar sowcars reckoning so many dubs per month (thrift may be emphasised here). Wholesale and retail trade and railway freights should be thoroughly well understood and possibly questions might be framed on Co-operative Society transactions. We consider that the use of contracted methods serves no useful end. We therefore recommend that less time should be given to such methods and more time be given to commercial arithmetic.

Algebra should be treated as subsidiary to arithmetic and the more abstract parts of the subject eleminated. Graphs should be freely used to show variation of quantities and for the solving of equations, but not for the solution of problems in time and work, speed and distance, etc. The ground to be covered should be stated much more definitely. To say Simple Factors, for example, is not a sufficient guide for the teachers; the types of the factors to be taught should be expressely indicated. Most emphasis should be on equations.

Mensuration should include the subjects now prescribed *plus* simple exercises on the Field Book. In Geometry the present curriculum may be followed if emphasis is placed on practical construction rather than on theoretical proofs.

Choice of Examples.

1. Since the aim of mathematics is to teach boys to apply general principles in new situations, problems should be framed with this in view. At all cost, boys must not be allowed to get into a rut of familiar questions. Variety is

If carpentry is taught boys can use their knowledge of geometry by actual handling of materials and so come to understand thoroughly ideas of area and cubical contents. They will see that such calculations are practically useful and indeed vital in the business of life.

(*d*) Reference has already been made to the close connection between mathematics and science.

Curriculum.

In framing a curriculum the guiding principle must be the Social Utility of the matter prescribed. As explained at the beginning of this report, this does not mean a ruthless elimination of everything which is not directly used in the ordinary calculations of everyday life.

We have concerned ourselves only with the elementary mathematics syllabus. Also we have not included the needs of Rural Schools in this survey; that is a subject which needs a more careful and specialised treatment than can be attempted here.

The only curriculum we have seen for the primary and Middle Sections is dated 1331 Fasli. It is respectfully suggested that the time has come for the publication of a new syllabus.

Suggestions for a Revised Curriculum.

Primary

It is universally felt that the present syllabus is over-weighted. What is wanted here is a working knowledge of the four simple rules. In the first two classes only such examples should be set as can be illustrated and checked by actual handling of objects. Expression work should be made compulsory.

Standard 1 **:—Numeration to 100. Addition and subtraction to 20. All work to be done in the concrete. Where a sufficient variety of actual objects cannot be got, pictures or diagrams may be used.**

Standard 2. **:—Numeration to 1,000. Addition and subtraction to 100. Multiplication Tables should be built up by the teacher by appropriate grouping of objects, the order being ten times, five times, twice, four times and eight times tables. Multiplication and division by any of these simple numbers first taught by method of grouping.**

with this subject is necessary. For the inventor and research worker it is indespensable.

In regard to Geometry, we feel that emphasis should be on actual construction and that only a minimum of theory should be required. Why is it necessary, for example, to learn a formal proof of the fact that the shortest distance of a point from a straight line is the perpendicular, when this can be so easily and clearly shown by actual measurement? If the result is arrived at by the boy himself, it will be a much more real item of knowledge than if arrived at through the technical jargon of Euclid. Where it is not possible to establish a general truth in this way, the boys and teacher working together should go through a theoretic proof. But when the truth has been once demonstrated it is surely a more useful exercise for the boy to apply the result in solving problems than to memorise the proof.

The Correlation of Mathematics with other subjects.

Will show the utility of the former.

(a) The drawing lesson may be a valuable ally of mathematics Scale drawing is a practical application of the idea of proportion. Drawing from dictation is a very effective exercise for older pupils, *e. g.* Draw a box having a square end, length twice the width, a hinged lid open at an angle of 45 deg. Map-drawing may be associated with geometrical shapes, *e. g.* The island of Ceylon can be depicted as a triangle the length of the sides given.

(*b*) Some parts of the geography lesson may be linked on to mathematics. Graphs may be made of statistics of local rainfall or temperature. The pupils can make diagrams for themselves to show density of population given the area and population of a country.

(*c*) Manual work is another good field for applied mathematics. If weaving is done in a school, the cost of thread, charge for labour, charges to cover wear and tear can all be introduced in estimating price of cloth woven.

might be usefully devoted to the explanation of the Insurance system, the actual procedure in international trade, Govenment bonds etc. In this way the pupil will not only be given an intelligent knowledge of the material he is handling in his Arithmetic exercises, but will also stimulate his interest without which no real mental development is possible.

(6). To get the best results from the above methods, instruction in the pupils' vernacular, particularly in the lower classes, is essential.

Algebra and Geometry.

It is admittedly difficult to give a practical turn to these departments of Mathematics; in their very nature they are abstract subjects. But even here the right way of approach will help boys to see their utility. The essential value of Algebra lies in the Equation. It is recommended that the simplest form of equation should be taught as early as possible. The dreaded "x" may be robbed of its terror, if its meaning and utility are educed and not imposed on the pupil. Suppose for example that a problem deals with the "number of sheep which a man bought". Let the pupil first try his hand at sketching the outline of the sheep and substituting this for the whole phrase. Let him continue this for a few problems. Then set a problem where it is difficult to represent the required part by a diagram. Instead of a diagram he himself will probably suggest that it would be easier to use some abbreviated sign, perhaps to use the letter "s" instead of the diagram of the sheep. Then the way will be easy to the use of "x" which may be used in any problem.

A little knowledge of Science will soon convince the boy of the utility of Algebra. In this subject the equation is being constantly requisitioned. And since Science is only the systematised knowledge of Nature he will see that for a proper knowledge of Natural Laws some acquaintance

(e) A Station Booking Office may be installed; purchasers of tickets find the distance in miles of their destination and calculate from that the amount to be paid for their tickets.

(f) A Clock face may be used to illustrate the multiplication process as well as a great variety of Time sums.

(3). Good diagrams on the Black Board will help to make quantities more concrete but they must be careful and accurate. A good drawing will often do more to elucidate a problem than any amount of talking. In this connection Graphs should have a much larger place than is generally given to them. Graphs are but pictures of quantity and as such should be used from almost the lowest classes. Simple proportion, for example, can be most effectively illustrated by means of graphs. The upper classes should make graphs from information supplied either by themselves or by the teacher, *e. g.* the number of pupils in school during a number of years, the variation in the value of B.G. and H.S. rupees.

(4). The Project Method. This is the method par excellence for giving a practical turn to Mathematics. It is not an easy method. It requires tact and enthusiasm on the part of the teacher to be successful. Few schools will be able to carry it out so throughly as it has been done at Moga, but in a modified form every school could adopt it for at least one class. A shop project might be given one half of every day for a year. The teacher is given liberty to use the time as he likes provided that all he does centres round a shop and trading. The class may begin by making a small shop out of wood; this involves careful calculation and measurement. There will be purchases in the bazaar, say of school materials, which may be retailed to other pupils. A profit and loss account will be opened; the class will decide how to invest the profit etc., etc.

(5). Explanation of the actual working of Mathematics in private, commercial, and national life. Lessons

into the Unknown so that that also may become their possession. As a matter of fact the number of rules to be learned is very small. The four simple rules, fractions and proportion practically cover all that needs to be taught. Profit and Loss, Percentages, Simple Interest etc., should be shown to be but special applications of proportion. The shorter and specialized methods of working such sums should only be adopted after the pupil has reasoned out the process for himself. All along the line it should be shown that Mathematics is only *Common Sense* applied to number. If this attitude of mind is inculcated, there will be fewer boys who "have no head for Mathematics". Their whole mentality will be changed. Common Sense will be a habit of mind that will guide them through all the intricacies of the subject.

2 Constant Use of Apparatus.

This admittedly means more work for the teacher but it will repay him over and over again. In some schools where apparatus is provided it is often neglected The following are suggested as some useful ways of using apparatus to enlist the interest of the child and to bring home to him the practical nature of Mathematics.

(a) Measures of 1 seer, $\frac{1}{2}$ seer, $\frac{1}{4}$ seer, $\frac{1}{8}$ seer can be very effectively used in teaching fractional quantities. By actually handling $\frac{3}{8}$ seer of rice the symbol $\frac{3}{8}$ becomes charged with meaning.

(b) A foot rule is a simple piece of apparatus which can be used for teaching fractional quantities as well as measures of length.

(c) A Bazaar shop with token coins will arouse interest in the dullest boy and will provide excellent practice in simple rules.

(d) A Post Office may be fitted up where home made stamps of varying values may be sold.

school who could do quite difficult sums in subtraction were nonplussed when asked to say how many remain from a flock of 50 sheep when 17 had been driven away. Nothing could show more clearly the futility of teaching by formal rules. If the rule is educed by actual handling of objects the child sees the meaning of it and the rule becomes a tool with which he can work out all manner of quantitative problems Numeration may be begun by counting fingers, the number of children in the class, the number of desks in the room, the number of catches in a game, etc. Groups of seeds to be manipulated by the child himself will serve to bring out the *meaning* of the processes of multiplication and division. In higher classes many rules may be arrived at by actual measurement or by observing that the same quantitative relationship holds in a number of cases. Some mensuration lessons might well be held out of doors. The boys should actually pace out distances to illustrate, for example, the relation of the diagonal of the square to its side, or the area of a large quadrilateral marked on the ground. A simple form of clinometer may be used for calculating heights. A mirror placed on the ground may be used for the same purpose. A boy adjusts his position until he sees in the mirror a reflection of the top of a pole, then if appropriate triangles are drawn the height of the pole may be determined and afterwards measured. The relationship between the radius and the circumference of a circle may be determined by actual measurement of several circles of varying sizes.

In this way every operation will be charged with meaning. Rules will represent the result of experience and observation, and will not be imposed on the student by the authoritative dictum of the teacher. Instead of the constant "Do it like this" the teacher should approach the class with "Now how shall we do this?". He will need to guide the boys at every step but if he proceeds carefully and slowly from what the boys know, they will be able to follow him

There is another practical value in the study of mathematics. Here is a subject in which a boy is being constantly confronted with a new situation—a problem which cannot be solved by merely remembering what he has been told but only by his own original thinking and right application of rules. The problem in the text book has a value far beyond its own reference. After all, it doesn't matter much to anybody how long a hypothetical train takes to do an imaginary journey; but if in the solving of that problem the boy is preparing himself to solve urgent practical life problems which will confront him later, the Social Utility of Mathematics is vindicated. Now we may say that the distinctive value of education in general and of mathematics in particular is to cultivate the power of using methods of reasoning appropriate to the problems of life. If this dictum is true it will have a very important bearing on the kind of method to be followed and the kind of problem to be presented to the student. It should also help us to see that practical mathematics does not mean the ruthless elimination of everything which does not find a place in our ordinary daily transactions.

Methods.

The Committee is under an obligation to the Editor of the Hyderabad Teacher for printing in the last number two articles on this subject. These contributions were too long to be reproduced here but they were prepared at the request of the Committee and should be read in conjunction with this Report. They contain much valuable material and many helpful suggestions. It is only necessary here to indicate very briefly the chief points dealt with in regard to method.

1. The approach to arithmetical processes should always be from the concrete and actual. This is of vital importance and cannot be emphasised too strongly. So often a child is taught to manipulate figures according to mechanical rules, and the whole process is as far removed from the actual world as is the man in the moon. Children in a certain

turn out men who can react intelligently to the needs of the modern world. The *Social Utility* of the subject is being more and more emphasised.

This should be borne in mind when we speak of "practical" mathematics. There is a danger of limiting the reference to the actual computations made by ordinary men and women in their daily transactions. Some will argue "an ordinary man uses little beyond the simple rules of arithmetic in his daily life and therefore he need learn nothing more." Such a view is entirely misleading and vicious: if carried to its logical conclusion it would result in the bankruptcy of education altogether.

The educationalist must consider not only what the average man *does* know, but what he *ought* to know. For example it may be said that a man doesn't need a knowledge of percentages for his own transactions, but undoubtedly such knowledge will save him from using his money unwisely. "If people in general had a more lively knowledge of the meaning of percentages they would not do such things as buying on the instalment plan. The sellers of goods on the instalment plan know their arithmetic, buyers do not." Neither would people patronise the local money lenders with their ruinous rate of interest if they understood the transaction more clearly. Moreover, without a fair knowledge of mathematics a man cannot take an intelligent interest in the life of the world. One takes up a daily newspaper and reads off such things as Government Loans, War Debts, Customs Duties, Birth Statistics. A man cannot take his place as a useful member of society without understanding these things and forming his own opinions about them. And in order to do this he must have a knowledge of averages, interest, percentages, and other mathematical processes which the severely "practical" man would be inclined to eliminate from the curriculum. This wider reference must be remembered when we come to deal with the question of curriculum.

Report of Committee Appointed to consider "How to give A Practical Turn to Mathematics."

Nearly four hundred years ago the first noteworthy book on Arithmetic was printed in the English language. The author evidently felt that an apology was needed for such a book and introduced the subject in the following dialogue:—

Teacher: If number were so vile a thing as you did esteem it, then need it not be used so much in men's communication. Exclude number, and answer to this question, "How many years old are you?"

Student: Mum.

Teacher: How many days in a week? How much land hath your father? How many men doth he keep?

Student: Mum.

Teacher: So that if number you want, you answer all by mummes.

No such apology is necessary now in treating of the subject. Its importance is everywhere recognised and probably no subject in the school curriculum has received so much attention during recent years. In 1900 there were in America only 30 published scientific studies of Arithmetic, in 1929 there were approximately 500 such studies in print. What is the result of all this careful inquiry and patient investigation? We can express it briefly by saying that it has created a new attitude of mind towards the subject. Mathematics is no longer regarded as a mechanical process whose chief value is to develop ability in the manipulation of numbers. We have come to see that it is "an indispensable tool by which all the quantitative relationships in ordinary living can be interpreted and satisfactorily handled". The aim is not to turn out mathematicians but to

There is a tendency to lecture. The lecture method is not suitable for the school. It is hardly necessary to point out that it often means talking far above the heads of the boys.

There is a great danger of the teacher getting out of date in his subject. With 5 or 6 periods of daily work at school, with other duties connected with sports or scouting outside school hours, with extra private tuitions, which probably have to be controlled to some extent by the Department, the schoolmaster is unable to keep himself up-to-date. It is very necessary that refresher courses be instituted from time to time to enable the teachers to be in touch with modern developments in their subject. Vacation schools in Geography, Civics, Deccan history, library organisation may be started in the Osmania Training College with advantage. Facilities should be given by the Department to enable the teachers to attend these courses. Opportunities should be given to the teachers to travel and visit institutions in other parts of India where the latest methods are successfully applied.

The Annual Conference of the Teachers' Association may be followed by an historical excursion to places of interest in the Dominions in which, all teachers of history should take part.

The personality of the teacher plays a very important part in the training of youth. If the fire of enthusiasm is burning in him, he can kindle it in the minds of his pupils. There is a danger of this fire becoming extinguished as the teacher becomes old. He should therefore frequently self examine himself and see that the ideals of youth are not shattered in the fierce hunt after the vulgar prizes of life.

The Teaching of History.

Professor S. Hanmanth Rao, M. A., L. T., (Chairman), G. A. Chandawarkar, M.A., (Secretary), Messrs M. Hanmanth Rao, B.A., L.T., S. M. Nakvi, B.A , B.T., S. Fakrul Hasan, B.A., B.T., Ganesh Chand, B.A., B.T., Md. Yusuf, B.A., B.T., Shaik Ali Husain, B.A., B T., Deuskar, B.A., B.T., Yusuf Husain, B.A., B.T., S. Ali Akbar, M. A. (Cantab.)

of a more satisfactory test. But the examiner and the examination play a very important part in our country in reducing the instruction to a soulless routine. If the questions set in Indian history over a series of years are so distributed that by reading a period of 300 years one can answer the required number of questions, the teacher is perforce compelled to neglect the other periods. There must be a board of paper setters and the members of the board should see that the papers satisfy the aims mentioned in this report.

The Teacher of History.

Our aims, curricula and methods—even the examination system—may be very perfect in theory and yet the results unstisfactory if the teacher is not of the right type. The view yet prevails in certain quarters that given 2 days' time any one can prepare to teach history. The difference between the teacher and the pupil is that the former is in advance of the latter by a few pages of the text-book. As far as possible the teaching of history should be entrusted to trained graduates who should be appointed from the 4th Form onwards. Where trained M. A.'s. or trained Honours graduates are available for the same salary, they should be preferred. Instruction in history should be imparted by trained men even in the Middle classes and, if possible, by trained graduates where trained graduates are available on lower salaries.

The tearcher must carefully prepare his lesson. His note-book should indicate the books to which he has referred before making notes, the aids and appliances he is going to use for his lesson and the questions he wishes to put to the class. The note book should also indicate the changes he is making from year to year in the light of fresh study or fresh experience gained from year to year. The note-book is only an aid to enable the teacher to have a plan and not to go astray. He must not dictate or create an impression that he is reading from it.

world should be obtained for the use of the teacher. Books suitable for the school standard, and several copies of them, should be added for the use of the boys. Even in those schools which have decent libraries, the boys are unable to make a judicious use of them. The teacher should tell the boy where he has to seek certain information and the portions of the book he has to read. In the 5th and 6th Forms, it is desirable that one of the history periods should occassionally be converted into a library period and the teacher should guide the boy in the way of using the library. The latter must be trained to use the index of a book.

The value of source books in developing the historical sense carrying the pupil's imagination to the times of the events is very great. There are several source books in English History, but there are none on Deccan history and there are practically very few in Indian history. It is desirable that source books on Deccan history should be written.

A list of books on Indian history suitable for our schools is attached as an appendix.*

Enactment of historical dramas, pageants in the costumes of the different periods, the use of the lantern and the stereoscope are also valuable aids in instruction. The extent to which they can be made useful as aids to the teaching of history depends upon the teacher. Needless to say, in the hands of an ill-equipped teacher they would degenerate into amusements,

Examinations.

The success of our suggestions, both as regards the curricula and methods, depends largely on the requirements of our examinations. If our scheme secures the support of the Department, there will be only one public examination at the end of the school course with common papers in Urdu and English. The examination test prevails all over the world and for the present we cannot give it up for want

* This will appear in our next issue. Ed.

expense. The deciphering of inscriptions may be encouraged as a valuable hobby. The teacher must, however, be careful to see that the exact historical value of the collections made is understood by him and by the pupils.

Excursions.

Excursions play an important part in developing the enthusiasm for investigation. The Boy Scout movement has been encouraging excursions, but the aim is different—physical exercise, life in the open air or training in the several Scout tests. In other cases the excursion is a picnic. The historical excursion must have a definite aim in view. If the teacher has no previous knowledge of the place to which he is taking the boys, the excursion has no value. The teacher must carefully prepare the plan of the excursion. He must study the guide books and all the available literature about the place. He should also give a previous discourse to the boys about the historical facts that the boys are going to learn as the result of the excursion. One teacher should not take more than 12 or 15 boys. If more boys are to go, more teachers should also go and divide the boys into groups. After their return from the excursion, the pupils should be made to write down their experiences and the teacher should satisfy himself that they have learnt something new. A small recurring grant should be made to enable the students of our schools to visit Ellora, Ajanta, Warangal, Gulburga, Bidar, Golconda and Hyderabad.

History Libraries.

Sir Philip Hartog in his recent report has drawn attention to the paucity of books possessed by our college students. The desire to pass an examination obsesses the mind of the pupil as well as the parent. Very little attempt is made by the teacher to create a reading habit. In several cases the reading habit does not exist even among the teachers. The schools must have decent libraries and history must get a decent share of the allotments every year. The latest books in Indian and English history, including books on teaching methods and a few books on the modern

classes. Cuttings should be made from the pictorial journals like the "Indian Pictorial Education" and boys should be encouraged to make their own cuttings and paste them in their note books.

Maps.

The historical map is absolutely indispensable for history teaching. Small size maps of the Deccan, showing the political divisions in the Andhra period, A. D. 3rd century, the Chalukya period 7th century, the Rashtrakuta period, 9th century, the Yadava, the Kakatiya and the Hoysala periods, 13th century, the Bahmani period and the period of the five Sultanates and the Modern period should be prepared and published in all the languages of the State and in English. The historical maps of India and England, published at a cheap price by Messrs Macmillan & Co., are recommended for the schools. The geography maps published before the war should be replaced by maps published after the war. The excellent map of the League of Nations published by Longmans Green and Co. is very useful for the history teacher. The pupils should be made to draw maps in separate map-drawing books with explanatory notes. Time charts are also valuable aids to teaching.

School Museums.

Higher research belongs to the University stage, but a taste for research, the spirit of investigation and a love for antiquities, should be promoted in the school stage. Our Dominions are full of interesting antiquities. Epigraphical records on stone can be found in the neighbourhood of almost every school. Old and interesting coins can be obtained in several towns from the bankers. Broken pieces of beautiful sculpture are scattered over several villages. A small history museum will encourage the teacher to make a small collection of these antiquities. The boys could also be led to take a pride in making their own contributions to the museum. Old palm leaf manuscripts, old paintings, medieval costumes and armoury can be collected at a comparatively small

the Middle classes, ideas of government, loyalty to the ruler and the State, elementary ideas of education, sanitation and municipal life should be given. The importance of team work must be emphasised and opportunities given for team work in school activities. In the higher classes, ideas of citizenship, rights and duties, the mechanism of the State, Central and Local Government should be clearly explained. At present, the sources of information for Hyderabad Civics are the Government reports, which are not easily accessible to teachers. We suggest the preparation of a small book for the use of teachers, giving an idea of the working and organisation of Central and Local Government and the civic progress made by the State in recent years, as well as the main principles of government in British India and relationship between British India and our State.

Laboratory Aids in the teaching of History.

Rapid changes have been made in the teaching of science in recent years. A separate room is provided and a fully equipped laboratory is insisted upon. The history teacher, on the other hand, has no room of his own and his equipment is often confined to the blackboard. In this connection, we would like to draw the attention of teachers of history to the very instructive series of articles in the "Times Educational Supplement" of January and February 1930. There should be a separate room for history equipped with, what we may call, the history apparatus.

Pictures.

A few typical pictures of Indian interest must adorn its walls. The pictures of Indian art and architecture, published at a cheap price by Messrs Macmillan & Co. are recommended. All the schools in our Dominions should be supplied with the picture post-cards issued by the Archaelogical Department. They should be framed and hung up on the walls of the history room. Copies of the Ajanta frescoes should find a place in the history rooms of High schools.

Abundant use of pictures should be made in the lowest

Standard IV.	**Stories from Deccan history.**
Form I.	**A short history of the Deccan, with related Indian history**
Forms II & III	**A history of India, with special reference to the Deccan.**
Forms IV, V & VI	**A history of India.**

Correlation with other subjects.

The history of a country cannot be well understood without a knowledge of its geography. The general configuration, the position of rivers and mountains, the mineral wealth and its distribution, proximity to the sea—all these have profoundly influenced the history of the country. Geography has determined the location of battlefields and the migration of conquering hordes. In the lower classes it is advisable that the history teacher should teach geography also.

The language teacher can be of great help in creating interest in history. The history of a country is embodied in its literature. The ancient history of India cannot be appreciated without some knowledge of Sanskrit. The medieval Hindu history cannot be appreciated without a knowledge of Telugu, Canarese, Marathi and Tamil. Historical research is impossible without a working knowledge of these languages. Similarly, Moslem history cannot be appreciated without a knowledge of Persian and Urdu. It will be a great step towards the achievement of our aim of cultural unity, if every Muhammadan boy gets a fair knowledge of at least one of the Hindu vernaculars of the State and Hindu boys of the State do not give up their old practice of mastering Persian.

Civics.

Civics is another important subject intimately connected with history. In several American schools it forms a separate course of study in the school. But we are of opinion that for the present, as in Germany and England, Civics should be taught only through the history lesson. From the lowest classes the idea of duty to the family, the village, the church and other similar bodies should be impressed. In

or non-Anglo-Saxon, has derived its political inspiration from the institutions of England.

Methods of Teaching History.

The usual method in schools is the text-book exposition. Graduates fresh from college are so much accustomed to the lecture method, that they do all the talking and expect the boys to be passive listeners. This method is unsuitable for the school. Dictation of notes or extracts from other books is a method that encourages cramming. The teacher must have a suitable text-book and combine narration, questioning and a skilful use of the black-board and other visual aids. At present, there are a few Urdu text-books specially written for our boys. But there are no suitable text-books either in the other vernaculars of the State or in English. The writer of a text-book should be not only a master of the language in which it is written, but must possess an intimate knowledge of the country about which he writes and have the outlook, which we have presented in our aim. An Italian school boy who does not know anything about the ruins of Pompeii but has learnt every detail about the Chinese gods from his text-books is a phenomenon absolutely inconceivable. But there are at least hundreds of school boys completing their school course every year from our State, who have not seen Golconda or Warangal or Ajanta or Ellora and who are not able to write an account of 10 sentences about their historical significance. It is the emphatic recommendation of this Committee that the text books for the primary classes and the lower forms of the school should be written from the point of view of the Deccan. The text-book should never be a medium for propaganda of any kind. It is therefore essential that every text book should be approved by a Board, before it is introduced in the schools.

We recommend the preparation of the following text-books in English and Vernaculars, viz., Urdu, Telugu, Marathi and Canarese :—

Standard III. **Stories from Deccan and Indian History.**

We have outlined a course of history extending over a period of 8 years. If it is followed in the spirit in which it is drawn up every school boy at the age of 16 or 17 will not only feel proud of belonging to the Deccan but will also be able to appreciate, the place of the Deccan in India and that of India in Asia, the British Commonwealth and finally the world.

While the school curriculum provides for the compulsory study of Indian History by all the students, English History is prescribed in the two highest forms of the school, for those who wish to specialise in History. The course for the H. S. L. C. Examination consists of English History from the earliest times to the present day and in addition one of the periods of English History is studied with more intensity. We are of opinion that since English History is taught only for 2 years in the High School, our aim should be to enable the boys to understand the leading events of English history and the general principles underlying the development of English institutions. We, therefore, recommend that the special period might with advantage be dropped. A more detailed study of the whole period is suggested and the course will be as follows:—

Form V. English History upto 1603.
Form VI. English History after 1603.

The details of wars and battles should be neglected. Emphasis is to be laid on broad movements. Feudalism, Monarchy, Parliament, Reformation and frequent comparisons of similar movements of Indian History should be emphasised. The modern movements in English History like the Suffrage movement, Factory legislation, problems of the Poor should be stressed with the idea of enlisting the sympathy of the pupils with similar movements in our country. It is our considered opinion that a sound knowledge of the working of English institutions is essential to a country eagerly desirous of political change, for it is well known that almost every country in the world, Anglo-Saxon

The Moslem boys should be made to appreciate the value of Hindu culture and art and the Hindu boys to appreciate Moslem culture and art.

The abolition of the Middle School examination is a step in the right direction. The teachers can exercise a certain amount of freedom in the choice of topics and need not be guided by the examination routine. Unchallenged facts only should be presented to the pupils at this stage. Topics that are likely to engender hatred of any kind, religious or racial, should carefully be avoided.

Form IV.	Indian History.	Early and Medieval.
,, V.	,, ,,	: Modern.
,, VI.	,, ,,	: A more advanced survey, with special emphasis on civics, modern movements and world problems.

A more intensive study is attempted in the higher forms. The Asiatic background should always be kept in view. The spread of Hinduism outside India to Java and the Indian Archipelago, the spread of Buddhism all over Asia, the spread of Islam in India and the intimate connection between India and Arabia and Persia offers an interesting contrast to wars and conquests. The school boy should not be made to leave the school with the impression that there is no Asiatic culture worth remembering.

The intimate connection that existed between Ancient India, Ancient Greece, and Rome should be emphasised and their reciprocal influence explained.

Greater emphasis should be laid on the social, economic and political changes that have taken place during the last 100 years.

Civics. We recommend the following syllabus for civics :—

A clear analysis of the structure of the central government. The Viceroy and his councils, the governors and their councils. Ministers and responsible government. The principles of local government, the working of Local Boards and Municipalities. The Government of Indian States. differences between States and British India. The rights and duties of citizenship.

The profound changes that have followed the Great War, their effect on the British Commonwealth, the changed position of India after the war, the League and its social, economic and intellectual activities, their advantages to India and the East.

schools. We have two sets of schools, one set offering instruction in Urdu and the other in English. Again the Osmania schools provide for a two years' High School course, while the English schools spread it over for three years. We understand that the High school course is going to be extended to three years. We think that this will be a step in the right direction and we hope that it will lead to the introduction of a uniform course of study in all the schools irrespective of the language in which instruction is given.

We consider that in no subject is the question of medium of instruction so important as in History. Experience has shown that even in the High School stage, the students are not able to grasp the subject in English, still less to express themselves clearly in that language. We are, therefore, of opinion that not only in the Primary but even at the High school stage, History should be taught in the vernacular of the pnpils.

Treatment of the subject in different classes

We recommend the following syllabus :—

Standard III. Stories from Indian History bearing on the Deccan History.

" IV. Stories from the Deccan History.

Emphasis should be laid on the events of the pupil's neighbourhood. The pupil should feel proud of the heroes of his locality. His imitative instinct should be appealed to and his imagination and sympathy should be roused.

Form I. History of the Deccan and related Indian History

" II. " " India: Early and medieval period.

Form III. History of India: Modern period and revision of the earlier periods.

The aim of the teacher during these 3 years should be to emphasise the importance of the history of the Deccan. At the same time, the intimate connection with India should not be overlooked.

Tukaram, or find food for deep and satisfying thought in the discourses of Sri Krishna or Gautama Budha. It will not be the growth but the death of Indian nationalism if the Hindus are not filled with pride at the architectural splendours of the Moguls and the Adilshahis; at the political achievements of great rulers like Shershah and Akbar; at the fine heroism of noble queens like Chand Sultana and Nur Jahan; at the liberal statesmanship of devoted ministers like Mahamad Gawan and Abul Fazl; at the wide learning of scholars like Alberuni and Faizi; or at the inspiration of poets like Amir Khusru and Ghalib. It will be sad indeed if the minds of Hindus and Mahamadans alike are not stirred with the high and noble aims of Viceroys like Mayo and Ripon, of administrators like Munro and Elphinstone, of friends of India like Fawcett and Bright, of missionaries like Hare and Miller".

Advantages of the Study of History.

History thus taught will enable the pupil to develop a healthy patriotism and will not lead to a rabid nationalism or communalism. It will enable the pupil to understand the world he is living in. He will also be able to better understand the present in the light of the past. His sense of judgment will develop, and in later life he will be able to develop a critical attitude towards political problems. The examples of sacrifice and devotion, presented by great political and spiritual leaders of past times stir the imagination of the pupil. He is made to feel that life is a mission and duty its highest law, and that the acquisition of privileges involves the sharing of responsibilities.

The Curriculum.

The achievement of our aims depends upon our curricula and our methods. At present, Indian History is taught throughout the school course and English History in the two highest classes of the school. The former is a compulsory subject for all the pupils from Standard IV onwards, while the latter is studied only by those who wish to specialise in History. There is, however, no uniformity in our

the correlation of history with the other subjects. Lastly, all the teachers of history are not sufficiently qualified and many of them are not trained in the methods of teaching. This report is an attempt to make a few suggestions to remedy the above defects.

The Aim of Teaching History.

The primary aim of teaching History should be to train the pupils in citizenship. But the question arises, what is citizenship? It is the increasing sense of social relationship that develops between man and his neighbours as civilisation advances. In primitive times, a good citizen was one who satisfactorily discharged his duties to his family and tribe. In medieval times, a good citizen was one who scrupulously followed the demands of his religion. In modern times, a good citizen is one who is prepared to give up everything for the cause of his country. The post war-world, with its increasingly shrinking nature, presents to us a higher conception of citizenship, viz. loyalty to Humanity. The pupils of the present day must be trained to feel that what we call modern civilisation is a common heritage and is to be shared by all.

But this idea of world-citizenship should not lead to the self-effacement of our peculiar contributions to the culture of the world. The pupils must be impressed with the richness of our past culture. They must be able to appreciate it and feel proud of it. They must feel that they are the inheritors of worthy traditions, which have to be passed on to future generations. Our boys must feel equally proud of the contributions made by the Hindu, Moslem, and British periods of Indian History. In the words of Sir Akbar Hydar Nawaz Jung Bahadur, "It will not be the growth but the death of Indian nationalism if the Mussalmans of India fail to be impressed by the greatness of Asoka or Chandragupta or be filled with pride and joy at the immortal frescoes of Ajanta and the sculptured monuments of Ellora or fail to derive inspiration from the glorious songs of Jayadeva or

sub-committees which the Association has appointed from time to time have done most useful work by bringing their accumulated knowledge and experience to bear upon important questions connected with education, and if their findings are given effect to both by their colleagues and the Department, an enormous improvement will result. You have just listened to the annual report of the Association. It is satisfactory to note that the enthusiasm which inspired the early efforts of the Association still continues, and I have no doubt that it will continue for years, so that the Association may become in course of time an institution producing ideal teachers by its precepts and example.

I wish the Association a long and happy record and pray that it may continue to render service to the cause of education and contribute to the progress of the country. I also pray for the long life and prosperity of our Gracious Ruler.

Report of the Sub-Committee

ON THE

TEACHING OF HISTORY IN SCHOOLS.

IT is generally felt that the teaching of History in our schools is not very satisfactory. The chief defect is the absence of a definite aim in the teaching of the subject. Political and military events are emphasised and the social and cultural aspects are neglected. Names of kings and emperors, accounts of wars, treaties and annexations are mechanically memorised. More attention is paid to words than to the ideas underlying them. The text-books are not suitable to our environment. Sufficient attention is not paid to

widely accepted can not but react on the culture of the people. The history of nations, their rise and fall, is an incontestable testimony of these interacting influences. High ideals, a desire to acquire knowledge for its own sake, and a selfless spirit of national service must be created in addition to mere individual training and culture. The courses of studies and the system of teaching should be revised with a view to the attainment of the best possible results in the above direction.

Need for Suitable Teachers.

The best system of education in the world might fail if there were not efficient teachers to work it. One can not overrate the importance of securing suitable teachers. The qualifications which a teacher should possess need hardly be enumerated. The tremendous responsibilities placed on his shoulders, the task of moulding the character of the pupils, the mental and moral discipline which his duties entail, call for the highest qualities of head and heart. In the selection of teachers personal and moral excellence should weigh equally well with academic qualifications. At present, unfortunately, a grave danger exists owing to the unparalleled limitation of employment, which gives a young man no opportunity to consult his own aptitudes and talents while applying for the post of a teacher. A rise in the standard of living with a corresponding falling off in the sources of income has created such uncertainty about the future that few can be expected to distinguish between right and wrong and make hair-splitting distinctions about their own merits and demerits. Everyone who holds a degree considers himself fully qualified for the task of teaching. Under these circumstances it is useless to expect a high standard of efficiency.

The Work and Influence of Teachers' Association.

The establishment of the Training Callege and the organization of the Teachers' Association have been of immense value in improving the quality of teachers. The

studies from time to time to meet the changing requirements of the times. And if at any time there should arise a general desire to acquire knowledge for its own sake, it will be necessary to overhaul the whole educational system with a view to foster greater national spirit and nobler sentiments. Nationality, whether based on race, religion or geographical limits, has certain features peculiar to itself, which it is the business of every healthy system of education to maintain. Each nation is distinguished from other nations by certain well marked traits which can not be overlooked or neglected without endangering the very life of that nation as a nation. Internationalism is a beautiful dream and it is possible that in the course of time it may prove a panacea for our social evils, but under present conditions it is highly impracticable. So long as nations are not prepared to merge their separate identity in a common undistinguished humanity, no nation can take the risk of losing its independent individuality. This is a very plain fact.

In any attempt to shape the educational policy and programme in accordance with national traits and aspirations, the importance of the Osmania University can not be ignored. With awakened popular consciousness, this university will perform the same great tasks which are at present discharged by the universities of Oxford, Cambridge, Leyden and Tokio. Without this spirit it will sink to an inferior place, producing only mechanical men without a purpose, without a will and without a soul. The graduates of this university, instead of enriching and inspiring their country, will only be useful domestics in the drawing rooms and kitchens, or at best, clerks in Government offices. This is not an inspiring ideal.

A cursory glance at the history of the nations reveals a very close connection between culture, education and language. Any type of culture is bound to influence education and stamp it with its own hall-mark; similarly any system of education universally adopted or a language

may soar high in the purer realms of thought and speculation, are utter failures in the field of action. There is, however, one characteristic common to both sets and that is that they pursue individual and selfish, rather than social and national, ends.

This great drawback is in a large measure due to a changed environment and a lack of high ideals. The highest aim which the educated classes place before themselves is to secure government jobs, while they pay no attention to the acquirement of knowledge for its own sake. As the educational programme which any country follows is necessarily circumscribed by its needs and aspirations, it is impossible to raise the standard without a thorough change in the mentality of the people. Situated as we are, the greatest need of the hour seems to be to provide for the livelihood of thousands who would otherwise go to swell the ranks of the unemployed and the discontented. I am glad to announce that H. E. H. the Nizam's Government is giving careful consideration to this aspect of the question. A Committee has been appointed to devise ways and means to include technical and vocational courses in school and college curricula. If it arrives at some satisfactory solution, it is likely that government may issue orders before your next annual meeting. But I still hold that unless there is a changed outlook among the people themselves, no material results can be achieved. The situation will remain just as at present if even after qualifying for law, medicine, engineering or any other vocation, people continue to clamour for government jobs and are incapable of standing on their own legs. I feel confident that the outlook will soon change, and I propose that a beginning should be made by adopting agricultural and commercial courses of studies as a preliminary to the inclusion of other vocational courses of studies.

Education and National Life.

Of course, it will be necessary to revise the courses of

If I had had time to deal fully with the question of our present system of education, I would have laid special emphasis on the proper education of girls and on physical education, and at the same time I would have drawn attention to the need for adult education.

As a tree is recognised by its fruit, so should it be possible on a cursory glance over the products of our colleges and universities to know what is good and bad in our system of education. Education in this country has brought two kinds of men into existence—those whose ambitions are limited to securing high and low jobs and those who, while they have become wise and philosophical, lack ambition and initiative. The latter have certainly acquired a mental culture all their own, but their ambitions and aspirations have either been stifled or so impaired that they have lost the urge for further effort. It is obvious that no will and no action can result without ambition and initiative. Reason can no doubt serve as a torch-bearer, but it does not by itself lead to action. Light would serve no useful purpose in a house without living human beings. The same light helps in the achievement of noble deeds as well as in the perpetration of the worst crimes. On the one hand, reason enables an efficient policeman and a clever detective to protect life and property, on the other, it might equally help a highway robber in his nefarious objects. Thus mere light of reason is not everything. It is necessary that one should be able to control one's desires and to lead them into fruitful channels. An intelligent person whose reasoning has been trained by education but who has no ambition or aspiration is like a lamp shining in a deserted place. Thus while, on the one hand, our system of education has produced a numerous class of slaves who consider government service to be the sole aim of life and the only way to glory and who are incapable of breathing in an atmosphere of freedom and liberty, it has given rise, on the other hand, to a small number of men who, though they

sion. In fact, one may say of the teacher, "Thy greatness is only next to God's".

Skilled labour and scientific care make an insignificant seed grow into a fruitful tree. Likewise, the mental and spiritual faculties with which Nature has endowed a human being can be so developed by sound education and proper training as to make him perfect, and indeed, "the vicegerent of God on earth". Just as an experienced farmer secures a good crop by the use of necessary tools and implements and rich and powerful manure, in the same way, an efficient teacher, possessing a knowledge of psychology, can, by employing the right methods of teaching, cultivate the mind and impulses of his pupil in order to make him a useful member of society.

Our Present System of Education.

The natural process leading to all sane actions is to will before acting, the will to act being governed by the desire to attain some particular object. The acts which one performs are those the necessity of which for gaining one's goal is dictated by one's reason and previous experience. In view of this natural process, we should receive education with some fixed aim and some definite goal, and until we decide what we are going to do in this world, we can neither get the right kind of training nor secure those benefits which education ought to confer on us. A programme is essential only for that person who is really prepared for a journey and whose destination is known and not for one who is compelled to work in a slavish rut. What should be our aim and destination? Is our present system of education suitable for our aim, and can it take us to our destination? These questions need long and careful discussion. On the present occasion, I will not enter into the discussion of these questions, but I will simply touch on the present system of education so far as it pertains to the point which I am trying to stress.

Presidential Address

BY

NAWAB AKBAR YAR JUNG BAHADUR,
Home Secretary, H. E. H. the Nizam's Government.

(Translation from Urdu.)*

LADIES AND GENTLEMEN,

I cordially thank the Hyderabad Teachers' Association for asking me to preside over the Fourth Annual Conference of the Association. I consider it a real honour to conduct and humbly to guide the deliberations of an assembly representing a noble band of workers engaged in the sacred profession of teaching.

It has become customary for Presidents modestly to indulge in an expression of their shortcomings which is not generally real; but as far as I am concerned, I can assure you that it is not out of modesty or out of regard for mere convention that I declare that I was unworthy of the honour which has been conferred on me.

The Teacher's Status.

The value of everything in this world is determined by its utility and by the real needs which it satisfies. The more important, far-reaching and permanent are the advantages derived from it, the greater will be the value attached to it. When this principle, the truth of which, I am sure you will all accept, regulates the price of a thing, I may be permitted to say that from the point of view of this principle, there is no profession in this world more honourable and deserving of greater respect than the teaching profes-

---

* We are indebted to Mr. Fazlur Rahman, B.A., Lecturer, City College, for the help which he gave us in translating the Presidental Address from Urdu into English.

of the Association, and this year he had also been appointed the Secretary of the Sub-Committee on the "Teaching of Geography". Mr. Ahmaduddin was rendering help to the Branch Association of the Residency Middle School. The premature deaths of these two members are deeply regretted by us all.

Conclusion.

In conclusion, I have to convey our sense of profound gratitude to our worthy President, Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, who has so kindly agreed to guide our deliberations this year. It is a source of great encouragement to us to have him in our midst to-day. Let me conclude this report with a prayer that the Great Giver of Life and Light may endow all the members with sufficient strength and zeal to carry on the work of the Association and to materially help in maintaining the educational progress of these Dominions. I am sure you will all join me in another prayer to the Almighty for long, prosperous, and happy life to our gracious, benevolent and beloved ruler Nawab Sir Mir Osman Ali Khan, Fateh Jung Bahadur, G. C. S. I., G. C. B., under whose benign rule we are enjoying the benefits of peace, which is so essential to the carrying on of the great and good work undertaken by the Association.

Income.	Expenditure.
From all sources Rs. 1835-12-6	Rs. 300-0-0 Grant for the *Hyderabad Teacher*. " 175-0-0 Allowances and contingencies " 240-12-6 Last Conference including Exhibition. Total Rs. 715-12-6

At the end of Aban 1338 Fasli, we had a balance of Rs 1120/- to the credit of the Association.

The Hyderabad Teacher.

This journal has been maintaining its usual standard of efficiency. It is the only Anglo-Urdu Quarterly of its kind in the Dominions, and it has been rendering valuable services to the cause of education continuously for the last four years. The great success and popularity of the journal are due to the ability and the zeal of the editorial staff, which consists of 1. Mr. S. Ali Akbar, M. A. (Cantab.), 2. Rev. F. C. Philip, M. A., 3. Mr. P. V. R. Sebastian, B. A. 4. Mr. Syed Fakrul Hasan Mulla, B. A., B. T., and 5. Mr. Abdul Noor Siddiqui, B. A., B. T., all of whom, in spite of their other onerous duties, have spared no pains to maintain the high standard of efficiency of the magazine. Before his transfer to Aurangabad, Mr. Ahmed Husain Khan also rendered valuable services as a member of the staff of the English section of the journal. In this connection, special mention must also be made of our eminent contributors whose valued articles have been highly appreciated by our readers in and outside these Dominions.

The hand of death has removed two of our able and energetic members Mr. K. P. Sastri, B. A., L. T., and Mr. Ahmaduddin Khan, B. A., LL. B., B. T., both of whom were very useful members of this Association. Mr. K. P. Sastri had been a member of the Central Executive Committee practically from the date of the inception

by Mr. S. Zahoor Ali, B. A., B. T., Principal, Darul Uloom High School and Mr. G. A. Chandavarkar, M. A., Head Master, Residency Middle School. The reports prepared by these representatives have been published in the "Hyderabad Teacher".

2. The Library of the Association has been thrown open to all the members of the Association, who are freely taking advantage of the opportunity thus offered. The Government has been approached for a grant to this library and it is hoped that after its sanction, many more useful books of educational value will be added to it. The work of organising of this library in its initial stage was undertaken by Mr. Ahmad Husain Khan and Mr. K. R Chari, to whom our best thanks are due.

3. The Divisional Inspector of Schools at the Head-Quarters submitted to the Director of Public Instruction a draft of rules for starting a Central Teachers' Association for the whole of H. E. H. the Nizam's Dominions and it is hoped that, when the starting of the said central organisation becomes a *'fait accompli'*, the teachers in the various parts of the Dominions will have an excellent opportunity of meeting together at the annual conference and of exchanging views on subjects of educational importance. Such discussions are a great help to teachers in maintaining a progressive standard of teaching in the schools where they work.

4. The application of the Association for a grant-in-aid is under the consideration of the Education Department. If the grant is sanctioned, we shall be able to carry on our work with even grater success.

5. *Finances.* The accounts of the Association were duly audited by Messrs. S. Gulam Mahmood and Md. Yusuf, B. A., B. T., to whom our best thanks are due. The details of the income and expenditure for the year 1338 Fasli are as follows:—

the Branch Associations and to transact the usual business of the Association.

Monthly meetings.

During the year under report, at each of the fourteen centres seven monthly meetings were held, at which the following subjects were discussed.

1. The extra-mural activities of a teacher.
2. How to give a practical turn to the present curriculum.
3. Teaching of Geography with a model lesson.
4. Teaching of History with a model lesson.
5. Teaching of Geography from a human point of view.
6. Study of Civics as a part of History teaching.
7. Relation between History and Geography.

With one exception, the above subjects are related in one way or the other to the subjects for which the Association had appointed Sub-Committees for preparing reports for submission to this Conference. It will thus be seen that throughout the year the Association has been regularly carrying on the work in conformity with the aims and objects of this Association.

Central Co-operative Society.

The Central Executive Committee had proposed that a Central Cooperative Credit Society should be started in the Office of the Divisional Inspector, Head-Quarters, for the benefit of all the members of the Association. Fifty members have already joined this Central Cooperative Society which bids fair to be successful.

Miscellaneous.

1. This Association was represented at the Fifth Annual Conference of the All-India Federation of Teachers' Association, held at Madras during the Christmas of 1929,

to three separate Sub-Committees which were formed in January 1930. Each Sub-Committee was composed of members who, besides taking special interest in the teaching of the particular subjects, were on account of their ability and experience, eminently fitted to serve on them. These Sub-Committees had sufficient time to meet and fully discuss the subjects which were entrusted to them. Each of the reports submitted by these Sub-Committees was discussed at a special meeting, to which all the teachers teaching the particular subject in all the local schools were invited to offer their suggestions. It will thus be seen that the final reports of these Sub-Committees were drawn up after a full and mature consideration of each subject in all its bearings. As notified in the programme, all the three reports will be submitted to the Conference for its approval.

The reports prepared last year by the Sub-Committees on 1. "The Teaching of Mathematics," 2. "Physical Education," 3. "Vocational Education, 4. "The Teaching of Urdu," and 5. "The Teaching of English" were all duly submitted to the Director of Public Instruction for necessary action.

A circular requiring all the schools to follow the suggestions made in the Mathematics Report was issued in January last. We have also been recently informed that a committee consisting of Mr. S. M. Hadi, Mr. Sajjad Mirza, Mr. W. Turner, Mr. F. Weber, and Mr. Ali Akbar has been appointed under the chairmanship of Mr. S. M. Azam to consider the Report on Physical Education and prepare a scheme for all the schools in the Dominions. The other three reports on "Vocational Education", "Teaching of English" and "Teaching of Urdu" are still under the consideration of the Education Department.

Meetings of the Central Executive Committee.

Four ordinary meetings of the Central Executive Committee were held during the year under report to prepare the quarterly programme of the subjects to be discussed at

organization and efficiency of schools. Will the authorities tackle this problem and ease the situation ?

Conclusion.

A few words of parting advice. Since schools are becoming larger and larger and more complex day by day, I want you to cultivate *esprit de corps* and learn to work in unison. Sink yourself in the school and let the school get the credit. Another piece of advice. Since we have not started Refresher Courses in schools, keep yourself well posted in your subject or subjects and be up to date. Above all, be a student all your life.

Report on the working of The Hyderabad Teachers' Association during the year 1929-1930

BY

SYED MOHAMED SHARIF MUSHADI.

General Secretary.

(Translated from Urdu by G. A. Chandravarkar, M. A.)

MR. PRESIDENT, LADIES AND GENTLEMEN,

FIVE and a half years have now elapsed since the Hyderabad Teachers' Association was first started. During this period every attempt has been made to carry on the work of the Association in conformity with its rules and aims.

As in the previous years, the consideration of three important school subjects, *viz.*, 1. "The Teaching of Mathematics in Relation to Practical Life", 2. "The Teaching of Geography" and 3. "The Teaching of History" was entrusted

India, he is much better off in prospects. Nevertheless, I find that the majority of our teachers seem to be discontented. Although the grade increments exist and there is a prospect of getting into the gazetted grade, our teachers hanker after immediate promotion and want to jump into the higher grade. Owing to the time scale water-tight compartment system, almost everybody is more bent upon passing the higher examination than doing full justice to his legitimate work and thus making himself eligible for the higher grade. Ever since the influx of the Osmania graduates and undergraduates there has been a setback in the working of the time scale. The market value of diplomas and certificates has, according to the economic law of demand and supply, become much depreciated. There is much confusion and disparity in the matter of appointments. Candidates are eager to accept lower grades. At the same time, direct appointments are made on grades corresponding to the degrees which are galling to those who have accepted the lower grades or those who are vegetating in the lower grade. To add to the confusion, occasionally there is direct recruitment to the gazetted line which creates bad blood among the senior B. T's. The inordinately slow grade increments of non-gazetted posts are taxing the patience of the young teachar to the utmost. So there is discontent everywhere. The unqualified man is cursing the time scale, for his promotion is blocked for ever. The man with a lower certificate is keen on passing the higher examinations and this goes on like a recurring decimal until the bar of the gazetted grade is reached. Many a matriculate has, thanks to the time scale, become a trained graduate and bettered his prospects, but he, too, is discontented, for there is the alluring gazetted grade beckoning him. He never cries halt and is thus never satisfied with his lot. So in my opinion the time scale has been a mixed blessing, for while it has filled our schools with teachers of superior qualifications, it has bred discontent which is undermining the

whether the latter is present or not, silently discharge their duties and finish the syllabus far ahead of the annual examination. They are never caught napping in surprise visits of the Inspecting Officers but, in the language of the scout, are *ever prepared.* (3) Super-teachers, who not only carry out all duties devolving on them in the school hours, but are keen on helping each and every boy who cares to go to them in their off periods. They remove doubts of boys, correct composition exercises, solve sums for individual boys, and even hold private classes after or before school hours for the sake of backward boys or in order to finish the syllabus, if it is too long to be completed in the working days. With them a holiday is a working day. It is such selfless teachers who are the ornament of the teaching profession and who leave behind them a name which is enshrined in the hearts of the pupils. We want such men for our boys.

Salaries of Teachers.

I shall next examine the present-day teachers' lot in the Nizam's Dominions. Our Dominions are quite in advance of British India in at least two things, *viz.* pay and prospects of the teaching staff and vernacularization, *i. e.* medium of instruction. Owing to the munificence of H. E. H. the Nizam's Goverment, we have a scale of salaries and grades which are the envy of Board and Aided Schools in British India. Although the time-scale adversely affects non-qualified or less qualified teachers who, in the pre-war days by dint of hard work and brilliant results could work up their way to the highest rungs of the educational ladder, yet, on the whole, the time scale has been a boon and blessing to teachers who do not generally excel in the fine art of canvassing for posts and promotions. By now almost everybody in the Department, barring recently appointed recruits, has got his grade according to the time scale rulings. Compared with his predecessors in the old Imad-ul-Mulk days or during the transitory period of Alma Latifi, he is quite ahead in pay. Compared with his compeer in British

presenting this picture is to open your eyes to this sorry state of affairs, so that this policy of aimless drift is stopped and we as parents and guardians, as it behoves us, begin to take keen and abiding interest in the development, growth and consummation of our children; otherwise we stand eternally charged with the worst criminal breach of trust imaginable.

Let me turn to my brother teachers, co-workers in the educational field and members of a profession which has more often been maligned than respected. You belong to one of the noblest professions, if not the noblest profession in the world. Since nobility entails obligation, according to the saying, *noblesse oblige*, you are saddled with responsibilities. The children of to-day, who will be the future citizens of to-morrow, are entrusted to your care. You are their custodians in the school and on the field. Not only are you responsible for their progress of studies but for the moulding of their character. It is said that children in obedience to the law of heredity take after the parent, but according to the other determining factor, *viz*, environment, your pupil becomes a replica or exact copy of your own for good or bad. He assimilates all your virtues as well as vices, if you have any. So you had better be very careful in regard to how you conduct yourself in the class, outside the class, on the playing field, during an excursion or in a social function and lastly in your home when he visits you.

Three Categories Of Teachers.

I divide teachers into three categories (1) those who are habitual slackers and who work only under pressure and who, when that pressure is removed, have a rollicking time of it. They are often seen taking an afternoon *siesta* in the class with both their legs poised on the table, writing letters to their friends or relatives, reading a newspaper or a novel or engaged in something that does not pertain to the class. They are the black sheep of our Department. (2) Duty loving teachers who without any reminders from the Headmaster,

have an idea. To strengthen the Urdu side of the magazine, why not incorporate the monthly *Al Moallim* with *The Hyderabad Teacher*, with Mr. Sajjad Mirza as chief editor on the staff of the Urdu section of the Quarterly ? I am also given to understand that the Hyderabad Government Training College authorities contemplate starting a Teachers' Monthly of their own, but instead of dissipating time, energy and money, would it not be infinitely preferable to have one strong central monthly with an expert editorial staff, from which perennially flows a stream of articles of uniform excellence, the current issue always better than the back number ?

Duty of Parents.

Turning to the august visitors who have gathered here, I thank you for participating in our deliberations, but I want you to take more interest in matters educational and make the arduous task of the teachers less cumbersome, smoother and more palatable. As parents or guardians of the boys, you may evince more lively interest by just supervising their studies, by watching the moulding of their moral character and by fostering in them the physical culture and sporting spirit, thus looking to their even three-fold development on mental, moral and physical sides. Looking introspectively, how many of us really take a live interest in the progress and development of our children ?

I put it to you, how many of us make a study of our children and follow their gradual evolution, noting their likes and dislikes, special aptitudes and natural aversions and chalk out their careers and future accordingly. How many square boys are put in round holes ! How many round boys are put in square holes ! Extricating themselves out of this adverse environment, they enter the arena of life, ill-equipped, sorry specimens of humanity. We parents are responsible for the criminal neglect of our children. We have no definite aim, no settled programme and no ambitious outlook for them ; we leave them to fate and chance. I am not playing the role of a carping critic. My only aim in

I shall be failing in my duty were I to omit to thank our popular Director of Public Instruction Mr. Khan Fazl Mohomed Khan for continuing to be the patron of not only the Association but also its organ, *The Hyderabad Teacher*.

We the members of the Hyderabad Teachers' Association are proud to have as our president Mr. Syed Ali Akbar, the Divisional Inspector of Schools of the City Circle, the life and brain of the Association, whose untiring zeal and enthusiasm and unremitting work have made the Association and its quarterly what they are to-day. The Hyderabad Teachers' Association in virtue of its being affiliated to the All-India Federation of Teachers' Association is recognised even beyond our State. Every year two delegates are sent on behalf of the Association to attend and take part in the sessions of the All-India Federation, which changes its venue year after year and is held in some important city or town during the Christmas week. Last year Mr. Chandavarkar of the Residency Middle School and myself had the good fortune to represent the Association in the All-India Federation. But one suggestion I am going to make is why should not the Hyderabad Teachers' Association increase its sphere of activities within the Dominions also? What is there to prevent it from becoming the nucleus or parent Association, to which all the District and Taluqa Teachers' Associations would be affiliated. If the Director of Public Intruction thinks fit, he may circularise primary, middle and high schools to start Teachers' Associations where none exist at present, and our indefatigable President will look to the affiliation and the rest.

The Hyderabad Teacher, the official organ of the Association, has gained an All-India recognition, having been approved for use by the Educational Departments of the Punjab, U. P., Behar and Orissa, C. P. and Berar and the Indian States of Mysore and Baroda. Some of its valued contributors hail from outside our Dominions. Here also I

The Fourth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

WELCOME ADDRESS

BY

MR. SYED ZAHOOR ALI, B.A., B.T.,

Chairman of the Reception Committee.

MR. PRESIDENT, LADIES AND GENTLEMEN,

THE Hyderabad Teachers' Association has done the signal honour of electing me the Chairman of the Reception Committee, and as such it is my pleasant duty, on behalf of the Association, to extend a hearty welcome to our distinguished President Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, Secretary, Home, Educational and Miscellaneous Departments, to our esteemed guests and beloved teachers to this the 4th Annual Conference. In the three preceding Conferences, we had as presidents such illustrious personages as Nawab Sir Hyder Nawaz Jung Bahadur, Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur and Mr. Khan Fazl Mohomed Khan—names to conjure with in the Hyderabad official world—and in keeping with this tradition we have now in our midst a legal luminary, a former High Court Judge and the Judicial Secretary, who also holds the portfolio of Education.

The Hyderabad Teachers' Association, under whose auspices we have met, although quite young, has striven to do silent but steady work for the past five years. The Association has done its best to promote *camaraderie* and fellowship among the teachers of the different institutions in the city, to study the educational needs and problems in their various aspects and educate the public through the pages of its official organ, *The Hyderabad Teacher.*

Middle School; Mustaidpura Middle School; Zenana Training School; Rifae Am Middle School; Shah Gunj Middle School; Madrase Hind Wastania Char Mahal; Darush Shafa Middle School; Girls' School, Machali Kaman; Primary School, Alava Yatima; Osmania Industrial School; Industrial School Khadimul-Muslameen; Asafia, Malakpet.

The Zenana Nampalli College is to be congratulated on winning the largest number of prizes. Amongst teachers, Mr. S. M. Jafer of Darul Uloom High School was awarded the first prize for paintings; Mr. Abdul Jabbar of the City College and Mr. Ghiasuddin of the Shah Gunj Middle School obtained first class certificates for craft-work; Mr. Abdul Hameed Khan of the City College secured two prizes and Mr. Mushtak Ahmed of the Darus Shafa Middle School one prize for educational appliances.

In response to the desire expressed by certain zenana lady.teachers last year, arrangements were made on the 2nd July for lady-teachers and other interested zenana ladies to visit the exhibition Lady Hydari graced the occasion with her presence and performed the opening ceremony. Nearly a thousand zenana ladies, the majority of whom were teachers and students of Girls' schools, availed themselves of the opportunity of seeing the exhibition. The lady-teachers of St. George's Grammar School gave valuable assistance to the Exhibition Committee in making the Purda arrangements.

On the 5th July, a holiday was given to all the Boys' schools at the Head-Quarters by the Director of Public Instruction to enable the pupils to see the Exhibition. Over 10,000 students visited the Exhibition between 8 a. m. and 5-30 p. m. on that day.

The Annual Educational Exhibition Organised by the Hyderabad Teachers' Association.

THE annual educational exhibition was held as usual at the City College along with the Conference of the Hyderabad Teachers' Association from the 2nd July till the 5th July, 1930. Miss. D. Webster, President, and Mr. Nazir Husain Sharif, Secretary of the Exhibition Committee, deserve much credit for the excellent manner in which they organised the Exhibition, which was a much greater success than the previous exhibitions. The exhibits were tastefully arranged in two large rooms close to the College hall. They included pencil and coloured drawings, paintings, historical and geographical maps and charts, teaching appliances, specimens of needlework and embroidery, and of clay-modelling and plasticine work. Two new sections were added this year, *viz.*, Scouting and Historical Sections. The exhibits for the latter section had been kindly lent by Professor Hanumanth Rao of the Nizam College.

In spite of the fees which were for the first time levied on the exhibits, there was no appreciable decrease in their number, while in point of quality there was a distinct improvement as compared with previous years. Thanks to the income derived from the fees, the Association was able to offer more decent prizes this year in the shape of books, watches, stationery boxes etc. The names of the institutions which won prizes are as follows :—

City College; Zenana College; Darul Uloom High School; All Saints' High School; St. George's Grammar School; Mahboobia Girls' School; Madrasae Aliya; Islamia High School; Engineering School, Nampalli; Wesleyan Mission High School, Secunderabad; Gosha Mahal Middle School ; Vivek Vardhani High School; Shah Ali Bunda

organisation have been drafted and forwarded to the Director of Public Instruction. If something definite could result from these suggestions, such a Central Association would help considerably the cause of education in the Dominions. It ought to be possible for the whole State to take advantage of such a Conference as this, which has proved so beneficial to those present, for we feel we are right in saying that the 1930 Teachers' Conference will long remain a pleasant and inspiring memory to all who participated in it. Vision and practice—the two constituent elements of a successful conference—were its distinctive features. The lofty note struck by the President in the opening speech was continued throughout, and it ended in the same strain with the inspiring address of Mr. Turner which concluded the session.

The practical aspect of the Conference was exemplified in Dr. Latheef Sayeed's original and instructive lecture on Hygiene, the Exhibition itself and the practical bearing of the resolutions and reports submitted. If the various suggestions involved in the lectures, resolutions and reports are acted upon, as we trust they will be, this Conference may well become a land-mark in our educational history. The sustained interest in the proceedings throughout speaks well for the general interest in education, and the appreciation manifested should be an incentive to the promoters and all concerned to continue their labours on behalf of the Conference which is doing so much to further the cause of education in these Dominions.

Mr. P. V. R. Sebastian, B. A., one of the editors of the *Hyderabad Teacher*, has proceeded to England on study leave to specialise in English literature at the London University. We wish him every success and take this opportunity of thanking him for his help in the editorial work of this magazine.

For a full report of the Conference see page 59.

concentrating its attention on a few subjects every year and drawing up carefully beforehand a programme of work for the whole year, the Association has immensely increased its usefulness and fully justified its existence. There is, however, need for greater co-ordination between the work done at the branches and the deliberations of the Sub-Committees, and it is to be hoped that the Branch Secretaries will assist the Sub-Committees which have been appointed this year by furnishing them at the proper time with full reports of the discussions held at their respective branches. Another need is the provision of a suitable library. The present library of the Teachers' Association is too small to be of much use to the Sub-Committees. The Association has applied to the Education Department for a grant to the library, and it is to be hoped that the Director of Public Instruction, who, as patron of the Association, has shown much interest in its work, will facilitate the task of the Sub-Committees by sanctioning this application.

All the three reports adopted by the Conference this year are constructive and full of useful suggestions. We take this opportunity of paying a tribute to their authors. In view of the general feeling that the present courses of study in history and geography need revision, the syllabuses prepared by the History and Geography Sub-Committees respectively deserve special attention. The recommendations of these Sub-Committees have already been forwarded to the Sub-Committee recently appointed by the Director of Public Instruction for revising the courses in history and geography.

In his Welcome Address, Mr. Zahoor Ali emphasised the need for the formation of a Central Teachers' Association for the whole Dominions. This question has been under the consideration of the Hyderabad Teachers' Association for nearly two years and, as the General Secretary pointed out in his report, even the rules for a central

Editorial.

The Fourth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

The present number of the *Hyderabad Teacher*, which marks the beginning of the fifth year of its life, is devoted to the proceedings of the Fourth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association. We have published elsewhere in this issue the full texts of the Chairman of the Reception Committee's interesting welcome address, the General Secretary's report, the able and instructive presidential address, the useful & illuminating reports on the Teaching of History and Mathematics prepared by the History and Mathematics Sub-Committees respectively and adopted by the Conference, and the delightful lecture on "Personal Hygiene" delivered by Dr. Latheef Sayeed. The full text of the long report of the Sub-committee on the Teaching of Geography will appear in our next issue. We also hope to be able to publish in our next issue the text of the extremely instructive lecture on "Education and Citizenship" delivered at the Conference by Mr. W. Turner, Principal of the Nizam College.

As was remarked by the President of the Conference, Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, the best feature of the work done by the Hyderabad Teachers' Association during the year 1929-30 was the preparation of the **reports** which were read at the Conference. The calling of a meeting of specialist teachers to consider the respective reports before presentation to the Conference was a helpful idea and avoided unnecessary time being spent in discussion at the Conference itself. Another useful plan which the Association adopted this year was that the topics selected for discussion at the monthly meetings at the various branches of the Association were closely related to the subjects for which Sub-Committees had been appointed. By thus
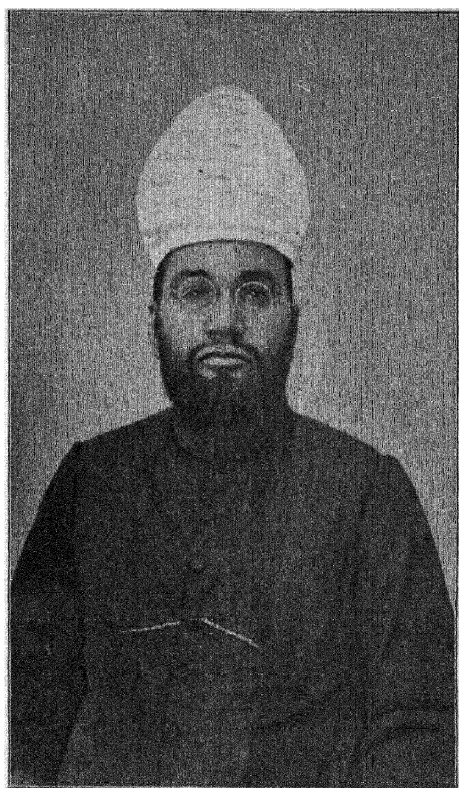
Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, Home Secretary, who presided over the Fourth Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.
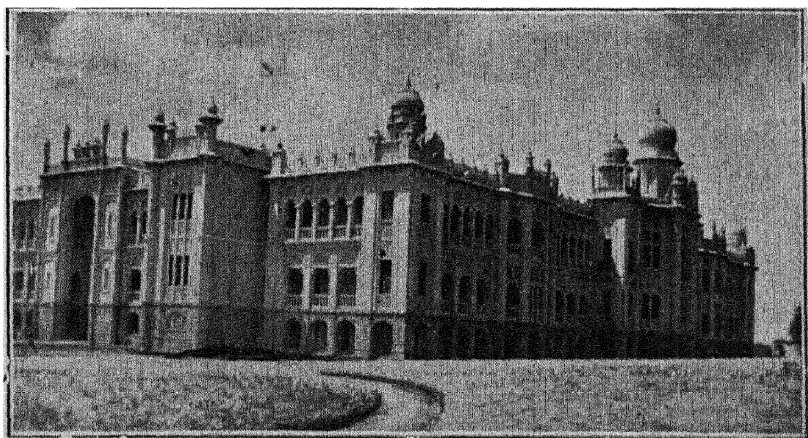
The City Intermediate College, where the Conference was held.

THE HYDERABAD TEACHER.

July—September 1930.

Conference Number.

CONTENTS.

REGISTERED ASAFIA NO. 47.

Vol. V. July 1930, A. D. No. 1.

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan, Esq., M. A.,
Director of Public Instruction,

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of The Teachers' Association, Hyderabad - Deccan.

Conference Number

Editorial Staff

S. ALI AKBAR, M. A., (Cantab.)
F. C. PHILIP, M. A.
P. V. R. SEBASTIAN, B. A.

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD,
1930.

Annual Subscription Rs. 3.

*

جلد (۵) رجسٹر شدہ بہ سرکار عالی نمبر ۴۶ شمارہ (۲)
آذر سنہ ۱۳۴۰ف م اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء

زیر سرپرستی عالیجناب خان فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

دائرہ ادارت۔

سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسئول
سید فخر الحسن تابی۔ بی۔ اے بی ٹی۔ (علیگ) مدیر
محمد عبد اللہ صدیقی بی اے بی ٹی۔ (علیگ) منیجر

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر دفتر ناظمی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدا کرنا۔

(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اصول

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسۂ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)

صرف اردو حصہ (عہ) فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲ر) صرف اردو (۸ر)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔

(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔

(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـــہ	صہ ۸ر	ـــے
نصف صفحہ	صہ	ـــے ۱۲ر	عہ ۸ر
ربع صفحہ	ـــا ۸ر	عہ ۶ر	۱۵ر
فی سطر	۱۰ر	۸ر	۶ر

حیدرآباد ٹیچر

آذر ۱۳۴۰ف م اکٹوبر ۱۹۳۰ء

فہرست مضامین

جلد ۵ — شمارہ ۲۵

افتتاحیہ

"اتحاد انجمن ہائے اساتذہ عالم" کے سرپرستی اور آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشن کی نگرانی میں کل ایشیا تعلیمی کانفرنس پہلے پہل بنارس میں بتواریخ ۲۶ ؍ تا ۳۰ ؍ ڈسمبر منعقد ہوگی۔ یہ کانفرنس اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس ہوگی جس میں ایشیا بھر کے پس افتادہ ممالک کے نمائندے شریک ہونے کے لئے دور دور سے آئیں گے۔ علاوہ ازیں اٹلی اور امریکہ کے ماہرین تعلیم بھی شرکت کریں گے۔ ایسی کانفرنس میں نہ صرف مختلف ایشیائی ممالک کے لوگوں میں باہمی تبادلہ خیالات کا موقع ملے گا اور ہر ملک کو اپنی تعلیمی حیثیت کا علم ہوگا بلکہ شرکار کانفرنس نئے خیالات، جدید معلومات اور دوسروں کے تجربات کا قیمتی ذخیرہ لے کر اپنے اپنے وطن کو واپس جائیں گے اور غالباً پہلے سے بہتر مدرس ثابت ہوں گے۔

کانفرنسوں کے متعلق بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ محض گپ شپ اور زبانی باتوں کی محلفیں ہیں جن کا کچھ نتیجہ نہیں نکلتا اور جن کی تقریروں اور خطبوں سے کسی مدرس کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ یہ ممکن ہے کہ کانفرنسوں کی ساری تجویزیں بار آور نہ ہوسکیں لیکن اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ اکثر تحریکوں کے ذریعہ سرکار کی توجہ بعض خاص مسائل کیطرف منعطف کرانے میں ضرور کامیابی ہوئی ہے۔ مدرسین بھی جو کانفرنسوں میں شریک ہونے کی زحمت فرماتے ہیں، وہ خواہ ابتداءً محسوس نہ کریں کہ لکچروں اور تقریروں کے سننے سے ان کے عملی کام میں کیا نمایاں فرق ہوا ہے لیکن جلد ان کے چشم باطن کے سامنے نئے علوم، نئی کیفیات اور نئے وجدانات کے دروازے کھلجاتے ہیں اور وہ نامعلوم طریقہ سے اپنے روزانہ کام میں ناقابل بیان تغیر محسوس کرنے لگتے ہیں۔

بنارس کی کانفرنس میں شریک ہونے کی اقصائے ہندوستان میں زور و شور سے تیاریاں ہو رہی ہیں اور سینکڑوں کی تعداد میں صوبجاتی نمائندے مقدس تیرتھ گاہ پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ بمبئی سے تو ایک اسپیشل ٹرین خاص تعلیمی نمائندوں کو پہونچانے کے لئے چھوٹے گی جب ہم اپنی ریاست کی طرف دیکھتے ہیں تو ہر طرف خاموشی صرف جامعہ کے چند اور انجمن کے چار نمائندے عازم سفر نظر آتے ہیں بنیت انتظامی کمیٹی بخیر مبادا ان میں سے بھی ایک آدھ ٹپک جائے۔

طلبہ کی اخلاقی تربیت میں والدین کا حصہ

یہہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ طلبہ کی اخلاقی تربیت باوجود نہایت اہم وناگزیر ہونے کے تعلیمی اُمور میں عملاً نظر انداز کردی جاتی ہے۔ جس کے دو خاص وجوہ ہیں۔ اول اساتذہ نے یہہ سمجھ رکھا ہے کہ اخلاقی تربیت کی ذمہ داری بلاواسطہ والدین پر عاید ہوتی ہے۔ اور اپنے اس خیال وعمل کی تائید میں کئی دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ جن کی تفصیل اس بحث کے لیے غیر ضروری ہے۔ دوم والدین کی دانست میں تعلیم کے ساتھ تربیت کی تکمیل بھی اساتذہ کے فرائض میں داخل ہے۔ اور ان کا اپنا فریضہ صرف اسی قدر ہے کہ بچّے کو مدرسے میں داخل کرکے وقتاً فوقتاً تعلیمی مطالبات پورے کردیں اور بس؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را　　　تو دانی حساب کم و بیش را

مگر یہہ ہر دو نظریے بجائے خود غلط ہیں۔ جن کے نادرست ہونے کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ اخلاقی تربیت کا موجودہ معیار باوجود اپنی شدید ضرورت واہمیت کے بلاخوف تردید زبانِ حال سے علی الاعلان کہہ رہا ہے کہ اخلاقی تربیت سے عاری تعلیم کی زندگی فی الحقیقت انسانیت کاملہ کی حیات نہیں بلکہ موت ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہہ ہونا چاہیئے اور ہو رہا ہے کہ ہر سال خواندہ افراد کی تعداد میں دل خوش کن اضافہ تو ہوجاتا ہے مگر ان کے سرمایہ زندگی میں چند ادھوری معلومات اور ناپختہ قابلیت کی بے بہرہ ضامن یعنے دو چار کاغذی اسناد کے سوا اخلاقِ حسنہ اور انسانیت کاملہ کا کوئی قابلِ قدر ولایقِ اعتماد جوہر موجود ہی نہیں ہوتا۔ تربیت اخلاق کی کامل ذمہ داری کا بار والدین پر ڈال کر اساتذہ کا خود کو سبکدوش تصور کرنا کسی طرح قرینِ انصاف نہیں ہوسکتا۔ اور تو اور مدرسے اور مکان میں گذرنے والی ساعات کے تناسب کے لحاظ سے بھی اساتذہ کا ذمہ دار ہونا ثابت ہے۔ اور اگر تعلیم وتربیت کے چولی دامن کے تعلق پر نظر کی جائے تو یہہ ذمہ داری نسبتاً اور بھی اہم ہوجاتی ہے جس سے جائز طور پر انکار کرنے کی تھوڑی سی گنجائش بھی کسی پہلو نظر نہیں آتی۔ ایسی صورت میں ضرورت اور شدید ضرورت

اس بات کی ہے کہ اساتذہ تعلیم اور تربیت کی اہمیت کو ایک ہی نظر سے دیکھیں۔ اور جب تک ایسا
نہیں ہوگا نتائج تعلیم عملاً ناقص رہیں گے۔ جس طرح زندگی کے لئے جسم اور جان کی احتیاج ناگزیر
ہے اسی طرح کامل انسانیت کے لئے تعلیم و تربیت لازم و ملزوم ہیں اور ایک کے بغیر
دوسرے کا وجود اس قدر موہوم اور بے حس ہوتا ہے کہ اس پر ہستی کا صحیح اطلاق کسی طرح نہیں
ہوسکتا۔ باوجود اس لزوم کے تعلیم کو تربیت سے جدا کرنا جسم و جان کے باہمی رشتہ حیات کو منقطع
کرنا ہے۔ اسی طرح تربیت اخلاق کے اٹل فریضے سے والدین کا دیدہ و دانستہ گریز کرنا نہ صرف
تعجب خیز بلکہ افسوس ناک بھی ہے۔ چنانچہ یگانگی میں بیگانگی کا برتاؤ بالکل بے جوڑ اور مضرت رساں
ہوتا ہے یہہ ایسا اہم فریضہ ہے کہ اس سے جائز طور پر دست کش ہونے میں سخت سے سخت مجبوری
اور معقول سے معقول عذر بھی بہ ہر نوع درست نہیں ہوسکتا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ خانہ داری
کی نہایت معمولی ضروریات بھی جن کا سرانجام بالکلیہ نوکر چاکر سے متعلق ہوتا ہے جب والدین کی ذاتی
اور موقتی نگرانی کے بغیر انجام نہیں پاسکتی ہیں تو پھر اپنی عزیز از جان اولاد کی اخلاقی تربیت کا اہم ترین
فریضہ ان کی ذاتی توجہ کے بغیر صرف استاد کی کوشش سے کیونکر پورا ہوسکتا ہے۔ اگر تربیت اخلاق
کے مسئلے میں استاد کی حیثیت مثل طبیب کے تسلیم بھی کر لی جائے تو یہہ بھی ماننا پڑے گا کہ مریض کو پرہیز
کرانے کی ذمہ داری تیمارداروں کی بجائے طبیب پر عائد نہیں ہوسکتی مگر جو تیماردار بدقسمتی سے مریض
کے پرہیز کو بھی طبیب کے فرائض میں داخل کرتا ہے اور اپنا فرض صرف اسی قدر سمجھتا ہے کہ دوا
کی قیمت اور طبیب کی فیس بروقت ادا کر دی جائے تو ایسے مریض کے جانبر ہونے کی کیا توقع ہوسکتی
ہے۔ بادی النظر میں قصور تو علاج کا معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں پرہیز کی غلطی مہلک ہوتی ہے
جو موثر اور نافع علاج کو بھی بے اثر کر دیتی ہے کیونکہ علاج کے ساتھ پرہیز کو جو اہمیت حاصل ہے
وہ بجائے خود علاج ہے یہی حال اخلاقی تربیت کا ہے۔ چنانچہ جب تک والدین کے ساتھ
اساتذہ اور اساتذہ کے ساتھ والدین اشتراک عمل نہیں کریں گے طلبہ کی اخلاقی تربیت کا مسئلہ
حل نہیں ہوگا۔ اس بحث سے ثابت ہوا کہ تربیت اخلاق کی ذمہ داری ایک طرف اساتذہ اور
دوسری جانب والدین پر کم و بیش عائد ہوتی ہے۔ اور یہہ ایسی ناگزیر ہے کہ ایک دوسرے کے
ٹالے ٹل نہیں سکتی۔

اساتذہ کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز باہمی تبادلہ خیالات ہے۔ جس کی دو صورتیں ہیں۔ بالمشافہ اور تحریراً۔ یوں تو تحریر سے ملاقات بدرجہا بہتر ہوتی ہے مگر جن کے اوقات کورنش کے باوجود اس کی اجازت نہ دیں وہ تحریر سے کام لیں اور اس میں ہرگز کوتاہی نہ کریں۔ یہہ ضروری نہیں ہے کہ والدین ہی کی طرف سے پیش قدمی ہوا کرے خود اساتذہ کو بھی کوئی موقع ضائع نہ کرنا چاہیئے۔ اگر ضرورت ہو تو اساتذہ کو اوقات فرصت میں تبادلہ خیالات کے لئے بیرون مدرسہ جانے کی اجازت بھی ملنی چاہیئے اور اشارات تعلیم کی کاپی میں آخر کے چند صفحات صدر مدرس کی اطلاع کی خاطر اس کے اجمالی ذکر کے لئے مختص کردئے جائیں تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔ اس سے ایک لازمی فائدہ یہہ ہوگا کہ مدرسین میں تبادلہ خیالات کا احساس عام اور اہم ہو جائے گا اور اس کے ساتھ خود والدین کی توجہ میں بھی اضافہ ہوگا۔ مشہور تہوار اور عیدیں کے موقع پر جبکہ والدین کو بھی اطمینان اور فرصت ہوتی ہے۔ مدرسے کی جانب سے ملاقات کے لئے اجتماع ہوا کرے تو بہ یک کرشمہ دو کار کا مصداق ہوگا اس کے لئے نہ مصارف درکار ہیں اور نہ غیر معمولی انتظام کی ضرورت ہے۔ البتہ مدرسین اور والدین کو دو ایک گھنٹے صرف کرنے ہوں گے۔ اور عام تعطیل کے سبب بار بھی نہ ہوگا۔ مثلاً کسی عید کے موقع پر طلبہ سے کہدیا جائے کہ اساتذہ سے فرداً فرداً ملاقات کرنے کی بجائے اپنے والدین کے ساتھ وقت مقررہ پر مدرسے میں جمع ہو جایا کریں تو بہت بہتر ہے تاکہ تھوڑے سے وقت میں یہہ کام بہ آسانی پورا ہو کر عید کی حقیقی مسرت کو تعلیمی اذکار اور اصلاح حال کی خوش آئندہ تدابیر کی بدولت المضاعف کردے۔ ممکن ہے کہ پہلے اور دوسرے موقع پر امید افزا اجتماع نہ ہو۔ ایسی صورت میں مایوس نہ ہو جائے۔ اگر کسی کام میں بہ مرتبہ اول کامیابی حاصل نہ ہو تو اس کے یہہ معنے نہیں ہیں کہ ہمیشہ ناکامی ہو گی۔ اور ناکامی چونکہ عموماً غلط تدابیر کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے استعمال کردہ تدابیر کی مناسب اصلاح پر کافی غور اور مشورہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نقش اول سے نقش ثانی بہتر ہو۔

انجمن طلبہ کے ماہواری جلسوں کی صدارت وغیرہ کے لئے والدین کو بھی مدعو اور آمادہ کرنا چاہیئے۔ اور اگر اُن کے لئے مدرسے کے اوقات ناموزوں ہوں تو بہ آسانی موزونیت

پیدا کی جاسکتی ہے جس کی صورت یہہ ہے کہ ایک سے تین بجے تک دو گھنٹے کا وقفہ دیگر تعلیمی کام کے بعد پانچ بجے سے جلسے کا آغاز کیا جائے۔ اس خصوص میں عام طور پر ایک قابل افسوس حق تلفی یہہ دیکھی جاسکتی ہے کہ مدارس میں جب کبھی سالانہ اور غیر معمولی جلسے ہوا کرتے ہیں تو اُن کی صدارت والدین کی بجائے افسرانِ سررشتہ کے سر تھوپ دی جاتی ہے اور اس پر طرہ یہہ کہ نظام العمل میں والدین کے فرائض۔ تعلیمی ہمدردی۔ اساتذہ کے ساتھ اتحاد عمل۔ درستی اخلاق کی تدابیر باہمی مشکلات کا حل۔ وغیرہ کے متعلق ہونے سے بھی کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ حالانکہ موقع کی مناسبت کے لحاظ سے یہہ قطعاً ناقابل نظر انداز ہیں۔ اس سے بڑھ کر ستم یہہ کہ اسٹیج پر آکر تقریر کرنے والوں کی فہرست میں اساتذہ و طلبہ نیز افسران سررشتہ کے سوا والدین کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔

والدین میں تعلیمی دلچسپی پیدا کرنے اور ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ایسے زرین موقعوں کو اس بُری طرح نظر انداز کر دینے کے بعد حضرات اساتذہ کا یہہ کہنا کہ تربیت اخلاق کا مسئلہ والدین کے اشتراک عمل کے بغیر حل نہیں ہوسکتا خود ان کے لئے قابل غور ہے۔ یوں تو مہینا مدرسے کی جانب سے والدین کو طلبہ کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کی اطلاع دی جانے کی ضرورت ہے تاکہ جو خامی والدین کی توجہ سے رفع ہوسکتی ہے اس کے ارتفاع میں تاخیر کے سبب مایوسی اور دشواری نہ ہو۔ نیز ایک خرابی دوسری بُرائی کو پیدا نہ کرے۔ مگر سہ ماہی۔ ششماہی اور سالانہ امتحانات کے بعد اکثر مدارس میں نتائج امتحان صرف طلبہ کو سُنا دیے جاتے ہیں اور والدین کو کوئی اطلاع ہونے نہیں پاتی۔ جن مدارس میں کم از کم سالانہ نتیجہ کارڈ وغیرہ پر لکھ کر والدین کی آگاہی کے غرض سے طلبہ کو دیا جاتا ہے اول تو اس میں طلبہ کی اخلاقی حالت کا ذکر ہوتا ہی نہیں۔ دوسرے یہہ کہ طلبہ نے اپنے والدین کو مطلع کیا یا نہیں اس کے اطمینان کی کوئی سبیل پیدا نہیں کی جاتی جس کا نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ اکثر والدین لاعلم رہتے ہیں۔ بعض وقت تو یہہ بھی سُنا گیا کہ ناکام طلبہ نے جن کو اپنی ناکامی سے والدین کو آگاہ کرنے کے لئے نتائج کا کارڈ دیا گیا تھا۔ والدین کو نہ صرف اپنا کامیاب ہونا باور کرایا بلکہ جدید کتب وغیرہ کے لئے روپیہ بھی حاصل کیا۔ اس ضمن میں یہہ واقعہ بھی کس قدر افسوس ناک ہے کہ مدرسے سے طلبہ کا نام خارج ہوئے مہینوں گزر جاتے ہیں مگر والدین کو علم نہیں ہوتا اسکی

وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اساتذہ اور والدین میں اتحاد عمل نہیں ہے۔ یوں تو مدرسہ اور اُس کی ہر ایک چیز سے والدین کو جائز طور پر استفادہ کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیئے مگر خاکر کتب خانے اور دارالمطالعہ سے بلا معاوضہ فائدہ اُٹھانے کے ذرائع بہ سہولت تمام فراہم کرنے جائیں۔ اس میں مدرسہ کا نقصان ہی کیا ہے۔ برخلاف اس کے بہت ممکن ہے کہ بعض خوشحال والدین نقد معاوضہ دیں یا اپنی طرف سے کوئی اخبار و رسالہ وغیرہ جاری کرا دیں۔ کتب وغیرہ کی داد و ستد میں مدرسے کو کچھ ایسی وقت بھی نہیں ہوگی طلبہ کے ذریعے لانے اور لیجانے کا کام بآسانی انجام پا سکتا ہے۔ اس طریقہ عمل میں ایک بڑا فائدہ یہہ مضمر ہے کہ تعلیم و تربیت کے متعلق بہت سے مفید مضامین والدین کی نظر سے گزر کر دیدہ اثر ے دارد کا مصداق ہوں گے اتحاد عمل کو مستحکم کرنے اور ترقی دینے کے لئے والدین کی طرح اساتذہ کو بھی چاہیئے کہ ازدیادِ تعلق کے معمولی مواقع مثلاً عیادت۔ تعزیت۔ مُبارکباد وغیرہ نظر انداز نہ کریں۔ اگر مدرسے میں یہہ طریقہ رائج کر دیا جائے کہ طلبہ ہر ہفتہ ہوم ورک کی کاپیوں پر والدین سے اطلاع یابی کی دستخط بالالتزام لیا کریں اور مدرس متعلقہ اس کا اطمینان کر لیا کرے تو اس میں طرفین کو کسی قسم کی زحمت نہیں ہوگی اور اس سے نہ صرف ہوم ورک باقاعدہ۔ صاف و پاک اور بے نقص ہو جائے گا بلکہ اشتراک عمل کا سلسلہ بھی مستحکم اور غیر منقطع ہوگا۔ جن مدارس میں صنعتی تعلیم اور باغبانی کا انتظام ہے اگر وہاں سے طلبہ کی دستکاری کی چھوٹی چھوٹی کارآمد اشیاء اور باغبانی کے ثمرات کبھی کبھی والدین کو تحفتہً بھیجے جائیں تو یقیناً حق بہ حقدار رسید کا مصداق ہوگا۔ جب والدین اپنے بچّوں کے عمدہ مشاغل کے مفید نتائج کو دیکھیں گے تو ان کے دل میں مسرت کے ساتھ مدرسے کی محبت و قدر و قیمت اور احترام کے حقیقی جذبات خود بخود مشتعل ہوں گے۔ اور کوئی عجب نہیں کہ یہ جذبات کسی موقع پر کارنمایاں کر جائیں۔ جب کوئی طالب علم کسی بات میں امتیاز حاصل کرے تو اس سے والدین کو خاص طور پر مطلع کرنا بھی بے حد مفید ہوگا۔ اگر مدرسے کے چند مقررہ امتحانات کے اختتام پر طلبہ کی اخلاقی حالت کے متعلق جو مکان کی چار دیواری تک محدود ہو، والدین سے نہایت مختصر مبنی بر حقیقت رپورٹ طلب کی جائے۔ اور جماعت میں طلبہ کے روبرو فرداً فرداً پڑھی جائے۔ نیز مدرس صاحب ضروری رہنمائی کے بعد طلبہ کی رائے سے بہترین رپورٹ کا انتخاب

کرائیں اور مناسب حال انعام انجمن طلبہ کے جلسے میں تقسیم کرنے کا نہ صرف انتظام کریں بلکہ انعام یافتہ طلبہ کے نام ایک مخصوص تختے پر جلی اور خوشخط لکھ کر مدرسے کے کسی منظر عام پر آویزاں بھی کر دیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس مفید تدبیر کا ایک ادنیٰ جزو بھی خوش آیندہ اخلاقی نتائج مترتب کرنے سے قاصر رہے گا۔ اگرچہ کہ اشتراک عمل کی متذکرہ بالا تدابیر بہ ظاہر معمولی نظر آتی ہیں مگر تجربے کی بناء وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایک قلیل عرصے میں والدین اور مدرسے کے باہمی تعلقات اس قدر گہرے خوشگوار اور مستحکم ہو جائیں گے۔ کہ وہ مدرسے کے ہر ایک فائدے کو اپنا ذاتی فائدہ تصور کر کے دامے، درمے، قدمے، سخنے، نت نئے فوائد سے اس کو مالا مال کرنے میں ہرگز دریغ نہیں کریں گے جیسا کہ آج کل مہذب ممالک میں ہو رہا ہے خدا کرے کہ ہمارا ملک بھی اس نیک تقلید کی بدولت زیادہ سے زیادہ فائدہ جلد از جلد حاصل کرے۔

غالباً یہہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ تربیت کی کٹھن منزل کا راستہ ایسا دشوار گزار اور پیچدار واقع ہوا ہے کہ علم النفس کی رہبری میں باوجود پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے کجروی سے بچنا محال ہے ایسی حالت میں بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ طریقہ تربیت کی غلطیوں سے کوئی گھر خالی نہیں ہے۔ بعض غلطیاں تو ایسی فاش اور مہلک ہوتی ہیں کہ جن کا اثر مدتوں زائل نہیں ہوتا چنانچہ بچوں کو ڈرانے کا مرض ہر ایک گھر میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ کونسا گھر ایسا ہے کہ جہاں خصوصاً کم سن بچے مختلف آوازوں اور متعدد فرضی ناموں سے نہ ڈرائے جاتے ہوں۔ اخلاقی تربیت میں ڈرانے کا عمل اپنے اندر اتنے مہلک اثرات رکھتا ہے کہ جس کے سبب اور تو اور خود بنائے اخلاق تک اس قدر کھوکھلی ہو جاتی ہے کہ اس پر نہایت ادنیٰ درجے کے اخلاق کی عمارت بھی قائم نہیں رہ سکتی چنانچہ یہہ کلیہ ہے کہ جس اصول میں ڈر کو دخل ہو وہ اخلاقی تربیت کا جزو نہیں ہو سکتا۔ اور اگر باقاعدہ طور پر تحقیقات کی جائے تو یہہ حقیقت پایہ ثبوت کو پہنچے بغیر رہ نہیں سکتی کہ دنیا میں جتنی بھی اخلاقی بُرائیاں پائی جاتی ہیں ان کی نصف سے زائد تعداد کا اصل سبب محض ڈر ہوتا ہے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ معصوم ہونہار تربیت کنندگان کی غلط تربیت کے سبب ذمائم اخلاق کی دائمی معصیت میں کس بُری طرح مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ؎

حال دلم کہ خون شد از دیگران چہ گویم برمن حبیب من زد صد تیر کج ادائی

اخلاقی نقطہ نظر سے طلبہ کی غذا سیدھی سادی اور زود ہضم ہونی چاہیئے۔ جو لوگ اپنے بچوں کو نہایت مرغن یا روکھی پھیکی غذا کھلاتے ہیں وہ غالباً اس حقیقت سے واقف نہیں ہوتے کہ غذا نہ صرف جسم بلکہ اخلاق و فضائل پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ کثرت سے گرم اشیاء کا استعمال کرتے ہیں ان میں تہور پیدا ہوتا ہے اور جو ان سے سخت پرہیز کرتے ہیں ان میں جُبن پایا جاتا ہے تہور اور جُبن دونوں بوجہ افراط و تفریط محاسن اخلاق میں شمار نہیں کئے جا سکتے غذا کے مقابلے میں لباس کا مسئلہ اگرچہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے مگر موجودہ زمانے کی فیشن پسند وبا نے اس کو سب سے زیادہ اہم کر دیا ہے۔ طالب علموں کی غذا کی طرح ان کا لباس بھی بہت سیدھا سادہ پاک و صاف اور مختصر ہونا چاہیئے مگر مشاہدہ شاہد ہے کہ آج کل سب سے بڑھ کر رنگینی نزاکت۔ دل فریبی شان اور نمائش طالب علموں کے لباس میں کوٹ کوٹ کر بھری نظر آتی ہے۔ اور غیر موزون لباس سے طبیعت میں بہت سی اخلاقی بُرائیاں مثلاً غرور حقارت زنانہ پن۔ شوخی۔ تجسس جائز افعال سے بیجا اجتناب۔ حفظ مراتب سے اعراض وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ یہہ بھی اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ایسے ہی طلبہ کا تعلیمی نتیجہ ہر مدرسے میں ہمیشہ نسبتاً خراب رہا کرتا ہے۔ حالانکہ بوجہ امارت و خوش حالی حصول علم میں ہر طرح کی سہولت موجود ہوتی ہے۔ ابھی حال کا واقعہ ہے کہ مذکورہ صفات سے متصف ایک صاحبزادے جن کی ٹوپی رات میں ملازم کی غلطی سے پانی میں گرنے کے بعد فوراً اُٹھالی گئی تھی مگر صبح میں مدرسہ جانے سے پہلے استری نہ ہونے کے سبب گھر بیٹھ رہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ موجودہ نسل جو اصل سے سود کو پیارا سمجھ رہی ہے وہ بالآخر یقیناً خسارے میں رہے گی۔ اسی سلسلے کا ایک اور واقعہ جو اپنے اندر بہت کچھ سامان غور و فکر رکھتا ہے یہہ ہے کہ ایک صاحبزادے کو ان کی اماں جان نے یہہ کہہ کر ایک روپیہ دیا کہ میاں ذرا ڈیوڑھی کے جوان کو دیدو کہ معمول کا سودا لائے۔ جب جوان نے روپیہ لینے کے بعد صاحبزادے سے کہا کہ سرکار اندر سے سودے کی ٹوکری بھی لادیجئے تو بس یہ سننا ہی تھا کہ سرکار آگ بگولہ ہوگئے اور سارا گھر سر پر اٹھا لیا کہ اس بے ادب و گستاخ نوکر نے مجھے کیا سمجھا ہے آخر کار اس ناکردہ گناہ ملازم نے ہاتھ جوڑ کر بار بار معافی چاہی تو

خیر گزری اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اللہ اللہ کیسی انوکھی ذہنیت اور کتنا بین تفاوت ہے کہ آنے والا زمانہ تو موجودہ پود سے یہہ کہہ رہا ہے کہ تم تیم اُٹھانے کے لئے آمادہ ہو مگر حال یہہ ہے کہ ببول کی ٹہنکڑی بھی بار ہے۔ غالباً اکثر طلبہ کو والدین کی طرف سے ماہانہ کچھ نہ کچھ جیب خرچ ملا کرتا ہے۔ ضرورت کی چیزیں فراہم کر دینے کی بجائے نقدی حوالے کرنا بعض وقت تخریب اخلاق کا موجب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس تیقن کی بنا پر کہ جیب خرچ ملے گا۔ قرض لینے کی عادت ہو جاتی ہے جس کے سبب ان کا بیجا ذوق و شوق بڑھ جاتا ہے مگر آمدنی کے ذرائع محدود ہوتے ہیں اور جب قرض کی ادائی ناگزیر ہو جاتی ہے تو تو فیر آمدنی کی ناجائز صورتیں پیدا کرنے سے احتراز نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک موقع پر دیکھا گیا کہ ایک طالب علم جو ایک پان فروش سے قرض لیا کرتا تھا چند ہی مہینوں میں تھوڑی تھوڑی بقایا بہت ہو گئی جس کو وہ یکمشت ادا نہیں کر سکتا تھا۔ نوبت یہانتک پہنچی کہ دوکاندار گھر پر تقاضا کرنے کے لئے آنے لگا۔ اور گھر والوں کو اطلاع ہو گئی۔ اس موقع پر باپ نے آزمائش کے طور پر ماں کے ذریعہ لڑکے کو چند روپئے دے کہ بازار سے ضرورت کی مختلف چیزیں خرید لائے۔ اول تو چیزوں کی قیمت میں بڑا تفاوت پایا گیا اور دوسرے یہہ کہ لڑکے نے باقی ماندہ روپیہ اور چند آنے واپس دینے کی بجائے کہدیا کہ کھو گئے اور جب دوسرے دن دُکاندار سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ میاں نے پائی پائی بے باق کر دی ہے۔ بالفرض یہہ مان بھی لیا جائے کہ مذکورہ بالا واقعہ عام نہیں بلکہ خاص ہے تو بھی اس خصوص میں مناسب حزم و احتیاط کی ضرورت ناقابل نظر انداز ہے۔ کم از کم اتنی احتیاط تو لازماً ہونی چاہئے کہ طلبہ کو جیب خرچ کے لئے جو نقدی دی جایا کرے اس کے مصرف کے واجبی ہونے کا اطمینان بھی ہوتا رہے تاکہ عدم بازپرس کے سبب طلبہ کی اخلاقی حالت خراب نہ ہونے پائے۔ اور والدین کو بعد از وقت افسوس نہ کرنا پڑے۔ اگرچہ کہ طلبہ کا تھوڑا سا وقت گھر کے نوکر چاکر کی صحبت میں گزرتا ہے مگر خود غرض اور خوشامدی نوکروں کی اتنی صحبت بھی اس قدر زیادہ مہلک نتائج مترتب کرتی ہے کہ ان کا تفصیلی بیان موجب طوالت ہے۔ الصُّحبۃُ مُؤثّرۃٌ ولوکان ساعۃ۔

ایک اور خرابی یہہ پائی جاتی ہے کہ طلبہ گھر کے نوکروں سے ایسی خدمات بھی لیا کرتے

ہیں جن کو وہ خود بلاہرج کار اور بآسانی انجام دے سکتے ہیں۔ نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ ان میں نہ صرف کاہلی پیدا ہوتی ہے بلکہ یہہ نارواحکومت کے خوگر بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح محلے کے آوارہ دوست نما دشمنوں کی مخرب اخلاق محبت سے بچوں کو بچانا والدین کا فرض اولیں ہے ؎

پسر نوح با بدان بنشست   خاندان نبوتش گم شد

ناٹک اور سینما کے اخلاق سوز نظارے بھی طلبہ کے اخلاق کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا رہے ہیں تہذیب جدید کی یہہ خانماں برباد وبا اس قدر عام ہو گئی ہے کہ اگر اس کی حسب ضرورت روک تھام نہ کی گئی تو کوئی عجب نہیں کہ یہہ ناعاقبت اندیش پود جادہ علم سے منحرف ہو کر جہالت و بد اخلاقی کی دائمی ضلالت میں مبتلا ہو جائے اور پھر اصلاح حال کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہو۔ والدین ذرا تو غور کریں کہ اگر طلبہ اپنے مطالعے اور درس کی تیاری کا قیمتی وقت اور ان کی گاڑھی کمائی بے دردی سے خرچ کر کے تنگ و تاریک مقامات میں گھنٹوں مخرب الاخلاق نظارے دیکھا کریں تو ان کی صحت و بصارت کا حال کیا ہوگا اور حصول علم کے سکون و اطمینان اور وقت و محنت طلب کٹھن مرحلے کیونکر طے ہوں گے۔ مزید براں طلبہ اپنے دل و دماغ پر جو اثرات و نقوش لے کر اٹھیں گے ان کا زائل و محو کرنا کس قدر مشکل ہوگا۔ کیا اس خطرناک کشاکش اور اس کے مہلک نتائج سے اپنی عزیز اولاد کو بچانا والدین کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو کیا اغماض و خاموشی ہی اسکی عملی صورت اور موثر تدبیر ہے یہاں افسوس کے ساتھ یہہ کہنا پڑتا ہے کہ طوفان و تلاطم میں گھرے ہوئے جہاز کا ناخدا جب ایسا خدا ناترس اور غافل ہو تو وہ یقیناً سلامتی کے کنارے پر پہنچ نہیں سکتا اگر والدین طلبہ کے غیر درسی مطالعے کی نگرانی اور سامان نوشت و خواند کی جانچ پڑتال کیا کریں تو یقین ہے کہ بہت سی پوشیدہ خرابیوں کا انسداد ہو جائے پہلے پہل طلبہ اپنی قابلیت کا نمونہ اور قلم کا زور دکھلانے کے لئے ایک دوسرے کو رنگین عبارت کے خطوط لکھا کرتے ہیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ عاشقانہ طرز و انداز اختیار کر لیتے ہیں جس کے سبب ان کی طبیعت میں بھی اس قسم کی کیفیات پیدا ہونے لگتی ہیں اس میں نہ صرف ان کے نہایت قیمتی اوقات کا بیجا مصرف ہوتا ہے بلکہ خیالات فاسدہ بھی عملی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر کسی کو طالب علم کی تصاویر کا البم دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو تو

وہ اس مبنی بر حقیقت بیان کو بے کم و کاست تسلیم کرنے میں ہرگز تامل نہیں کرے گا کہ اس میں فحش اور ناقابل دید تصاویر بھی موجود ہوتی ہے۔ جن کو طالب علم نے اپنی پسند سے خرید کر جمع کیا ہے جس طرح کسی شخص کی خواہش کی چیزوں کو دیکھ کر اس کے مزاج اور ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اُسی طرح طلبہ کے البم سے ان کی نو خیز طبیعتوں کی نہایت ناموزوں اُمنگوں کے سخت خطرناک نتائج کا پتہ لگ سکتا ہے۔ طلبہ کا غیر درسی مطالعہ بھی عموماً اسی قبیل کا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ مخرب الاخلاق ناول عشقیہ قصص گل و بلبل کے ترانے اور غزلیات کے دواوین۔ ان کے علمی مشغلے کے اجزائے ضروری ہیں جو بظاہر تو بہت دلچسپ بلکہ علم آموز معلوم ہوتے ہیں کیونکہ بعض وقت طلبہ کی وارفتگی اور انہماک کا یہ عالم ہوتا ہے کہ سیر و تفریح اور کھانے پینے کے اوقات بھی ان ہی کی نذر ہو جاتے ہیں مگر فی الحقیقت ان میں نہ طالب علمانہ دلچسپی کا سامان ہوتا ہے اور نہ ان سے علم و اخلاق کی معلومات میں ترقی ہوتی ہے بلکہ ان کی حقیقت اس خوفناک جنگل کی مانند ہے جس میں ہر قسم کے درندے تو منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ مگر دور سے دکھائی دینے والا جاذب نظر سراب نما منظر چند نہتے ناعاقبت اندیش نادانوں کو اپنی طرف مقناطیسی قوت سے کھینچ رہا ہے اس غیر موزوں مشغلے کے زہر آلود اثرات سے اخلاق کے ساتھ تعلیم بھی بری طرح متاثر ہو رہی ہے چنانچہ سائنس ریاضی اور تاریخ جیسے سراپا دلچسپ مضامین سے طلبہ کو کچھ نفرت سی ہونے لگی ہے اور بدقسمتی سے وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کی طبائع کی یہ ناموزونیت جو خود ان ہی کے کرتوت کا لازمی نتیجہ ہے۔ کوئی فطرتی نقص ہے۔ طبقۂ وسطانیہ کا ایک طالب علم جو حساب کے امتحان میں چند خشک پیمانے اور انگریزی مہینوں کے ایام کی تعداد یاد نہ ہونے کے سبب سو میں سے صرف سولہ نمبر اور وہ بھی بمشکل تمام حاصل کرتا ہے۔ وہ اُردو مضمون نگاری کے پرچے میں اتنے بے محل رنگین اشعار جن میں غالباً چند مہمل طبع زاد بھی ہوتے ہیں۔ لکھتا ہے کہ جوابی پرچہ بجائے خود منظوم ہو جاتا ہے۔ ان واقعات پر نظر کرتے یہ کہنا خالی از مبالغہ ہوگا کہ طبقہ تحتانیہ سے اونچی تعلیم کے ہر ایک مدرسے میں اُردو کا ایک نہ ایک شاعر طالب علم موجود ہوتا ہے جس کی بے ہنگام شاعری کا خبط نت نئی شگوفہ کاری کیا کرتا ہے۔ ایک مدرسے کی انجمن طلبہ کے ماہواری جلسے میں ایک طالب علم نے جسے اُستاد صاحب نے کوئی اخلاقی نظم پڑھنے کے

لئے نامزد کیا تھا۔ اپنا طبع زاد بے معنی کلام نامناسب حال انداز سے سنایا۔ جس کو تمام اہل ذوق اساتذہ نے بالاتفاق "گل وبلبل کا دقیانوسی ترانہ" سمجھا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہہ عجوبہ نگاری دراصل "نعت شریف" تھی۔ ببین تفاوت راہ از کجا است تا بکجا۔ عموماً گھر کی بوڑھی بڑی عورتیں خصوصاً چھوٹے بچوں کو قصے کہانیاں سنایا کرتی ہیں جو زیادہ تر مبالغہ آمیز اور بے نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر ایسی کہانیاں عمر بھر بھی سنی جائیں تو ان سے سیر و اخلاق کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ حالانکہ بچوں کے اخلاق و آداب درست کرنے کا یہہ بھی ایک بہترین ذریعہ ہے گزشتہ زمانے میں جب کہ علم کی روشنی اس قدر جلوہ گر نہیں تھی۔ بے علموں میں بھی محاسن اخلاق کے ایسے جواہر ریزے پائے جاتے تھے جو آج کل کے ذی علموں میں نظر نہیں آتے جہاں اس سیرت سازی کے بہت سے اسباب ہیں وہاں ایک ناقابل تردید بڑا سبب یہہ بھی ہے کہ ان لوگوں کو اپنے زمانۂ طفولیت میں پُر از نتائج اخلاقی قصص سُننے کے مواقع بکثرت ملا کرتے تھے اگر رستم کی دلاوری اور سکندر کے استقلال کے حقیقی اسباب دریافت کئے جائیں تو یقیناً بچپن میں سُنے ہوئے قصوں سے ان کو نہایت ہی قریب کا تعلق ہوگا۔ ہمارے گھروں کے موجودہ طریقۂ قصہ گوئی کی اصلاح کی ایک تدبیر یہہ ہوسکتی ہے کہ پڑھے لکھے مرد اس قسم کے قصے کہنے سے عورتوں کو نہ صرف منع کیا کریں بلکہ مناسب حال اخلاقی قصص پڑھ کر سنایا بھی کریں۔ نیز جو عورتیں خود پڑھ سکتی ہیں ان کے لئے سوانح اخلاق کا ذخیرہ حسب ضرورت فراہم کر دیں۔ اس سلسلے کی ایک آخری مگر نہایت ضروری کڑی یہہ ہے کہ گھر کی چار دیواری کا اخلاقی ماحول اور خود والدین کے اخلاق کا عملی نمونہ بچوں کے لئے ازبس مفید و موثر اور قابل تقلید ہونا چاہیئے مگر افسوس کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ اکثر گھروں میں باہر سے زیادہ تخریب اخلاق کا سامان موجود ہوتا ہے۔ جس طرح کسی حکیم کے مریض ہو جانے سے اس کے بیماروں کا علاج اس سے ناممکن ہوتا ہے۔ اسی طرح گھر کے زشت خو بزرگ بھی اپنے بچوں کے اخلاق کو عملاً درست نہیں کر سکتے ایک وقت کا واقعہ ہے کہ ایک اونچے مکان کے کم سن بچے نے اپنے دروازے سے خوانچے والے کو پکارا۔ اور جب وہ پلٹا تو اس کو ایک موٹی گالی دے کر روپوش ہوگیا۔ راستہ چلنے والوں میں سے ایک صاحب نے خوانچے والے سے کہا گھر والوں سے شکایت کرنی چاہیئے۔ اور اگر تم چاہو تو میں تمہاری طرف سے گواہی بھی دوں۔ اتنے میں پاس کے مکان سے ایک

عورت کچھ خریدنے کے لئے باہر نکلی اور جب اس نے یہہ سارا قصہ سُنا تو بولی کہ کیا اگر دو گالیاں اور کھائی ہیں تو گھر والوں سے شکایت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہہ گھر تو "ہمہ خانہ آفتاب است" کا مصداق ہے۔ اس سے واضح تر ایک اور واقعہ یہہ ہے کہ ایک ذی علم باپ جو اپنے بچے کو اس دروغ گوئی پر سخت ترین جسمانی سزا دیتا ہے کہ اس نے مدرسہ جانے کی نسبت سراسر جھوٹ کہا۔ اس واقعے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہی باپ اپنے اُسی لڑکے سے یہہ کہتا ہے کہ اس وقت مکان پر دستک دینے والے اگر فلاں صاحب ہوں تو کہہ دینا کہ مکان میں موجود نہیں ہیں کہیں باہر گئے ہیں نیز یہہ کہ کب آئیں گے ہم کو اس کا علم نہیں ہے۔ ؎

مشکلے دارم ز دانشمندِ محفل باز پُرس ۔۔۔ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

جب تک مکان کی تربیت کا طریقہ درست اور والدین کے عمدہ اخلاق کا نمونہ قابل تقلید نہ ہوگا طلبہ کی اخلاقی تربیت اساتذہ کی امکانی کوشش کے باوجود بھی ادھوری اور ناقص رہیگی اس کی اصلاح کی چند صورتیں جو مناسب حال اور ممکن العمل بھی ہیں۔ اشتراک عمل کی ضرورت کے تحت بالاختصار بیان کردی گئی ہیں البتہ ان کے فرائض تربیت میں بھی تھوڑی سی مزید سہولت اور کمی پیدا کی جاسکتی ہے اس کی صورت یہہ ہے کہ اگر ہماری علم پرور و دریادل سرکار نیز علم دوست ذی ثروت حضرات طالب علمانہ دلچسپی کے مختلف مفید مشغلے۔ مثلاً سیر و تفریح کے پر فضا باغ کھیل کود کے میدان۔ ورزش کے ساز و سامان پیراکی کے حوض۔ تالابوں میں کشتیاں۔ عجائب خانے تعلیمات کا نمائشی گھر جہاں طلبہ کی فراہم کی ہوئی اشیاء قدر و معاوضے کے ساتھ لی جایا کریں۔ لکچر ہال اور لکچروں کا انتظام۔ دلچسپ و مفید مشغلوں کا بلا معاوضہ نظارہ ذرائع آمد و رفت کے کرایہ میں بلا تخصیص ایام و تعداد مناسب رعایت قابل دید اور تاریخی مقامات کے دیکھنے میں عام سہولت۔ وغیرہ رفتہ رفتہ حسب ضرورت مہیا کردیں تو یقین کامل ہے کہ ایک طرف والدین کے فرائض تربیت میں نمایاں طور پر کمی ہوجائے گی اور دوسری جانب خود طلبہ بھی کسی مخرب الاخلاق کشش سے بہ آسانی اور جلد متاثر نہیں ہوں گے خدا کرے کہ ہم سب کو اپنی مراد زندگی کا یہہ مُبارک و مسعود دن جلد از جلد دیکھنا نصیب ہو اِستجب یا مُجیبَ الدَّعوات۔

سید غلام محمود
معتمد مجلس تربیت اخلاق شعبہ صدر انجمن اساتذہ مستقر بلدہ

افریقیہ کے مدارس صحرائی

(سید احمد ایم۔اے بی ایس سی معلم طبیعات کلیہ جامعہ عثمانیہ)

ان دنیا میں آج کل تعلیم ایک زبردست مسئلہ بن گئی ہے یہاں تک کہ کسی قوم کی ترقی کا معیار ہی تعلیم کو قرار دیدیا گیا ہے۔ تعلیم پر جس قدر زیادہ اخراجات کئے جاتے ہیں اسی قدر وہ قوم ترقی کے میدان میں بلند پایہ سمجھی جاتی ہے۔ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت سے تو اب کسی کو انکار کی گنجائش نہیں لیکن طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم میں اب بھی کافی اختلاف ہے۔ تعلیم میں سب سے زیادہ اہم ابتدائی اور ثانوی تعلیم ہے۔ اختلاف آرا اس کے متعلق ہے۔ ایک نظریہ یہہ ہے کہ بچوں کے معلم مرد ہونے چاہئیں تاکہ بچوں میں مردانگی، ہمت اور جرأت پیدا ہو۔ دوسرا نظریہ یہہ ہے کہ معلموں کو عورتوں میں سے ہونا چاہیئے تاکہ بچوں میں اولوالعزمی اور کمزوری کی حمایت کے جذبات پیدا ہوں۔

پس یہہ مسئلہ کہ بچوں کے معلم مرد ہوں یا عورتیں ایک معرکتہ الآرا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس پر رائے زنی بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس کے اہل ہیں۔ ہمارا مقصد یہاں صرف یہ دکھلانا ہے کہ تہذیب و تمدن سے دور صحرائی افریقہ کے قبیلوں نے اپنے لئے اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا ہے۔ یہاں یہہ بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ یہہ مسئلہ قدیم زمانے میں بھی مرکز توجہ تھا۔ چنانچہ اسپارٹا والوں نے اس مسئلہ کو یوں حل کیا تھا کہ ابتدا ہی سے بچوں کو عورتوں کی صحبت سے جدا کر دیتے تھے اور مرد معلموں کے سپرد کر دیتے تھے تاکہ ان میں جبن اور دون ہمتی نہ پیدا ہونے پائے بلکہ ان کی بجائے جفاکشی بہادری اور بے خوفی کے اوصاف پیدا ہو جائیں۔

افریقہ کے جس علاقے کا بیان یہاں پیش نظر ہے وہ انگریزوں کے زیر اقتدار ہے چنانچہ انگریزی حکومت وہاں دیسی رسم و رواج کے متعلق نئے نئے طریقے اختیار کر رہی ہے۔

جن کو تمدن کے اعتبار سے تو شاید مہذب نہ کہا جا سکے لیکن ان کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں وہاں کے ایک با اقتدار افسر کیپٹن ڈبلو ہیجنس نے ایک قبیلہ کے "مدرسوں" کا بذات خود معائنہ کیا چنانچہ ہم بھی ذیل کے حالات اُن ہی کے بیان سے اخذ کر کے لکھتے ہیں:۔

کینیا واقع افریقہ کے دو قبیلے (نندی) اور (مسائی) بہت مشہور ہیں ان میں آپس میں برابر کشت و خون ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک ایسی باہمی جنگ کی بدولت کیپٹن موصوف کو ان کے "مدارس" کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

بچوں کو جوانمرد بنانے کا مسئلہ ایسا ہے جس میں ان وحشی قبائل نے کہنا چاہیئے کہ بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اِن قبائل میں زیادہ تر نیزہ استعمال ہوتا ہے اور جب ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں تو اُن ہی نیزوں سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک قبیلہ دوسرے پر حملہ کرتا ہے تو اس سے یہہ بھی غرض ہوتی ہے کہ اپنے جوانوں کی دلیری، بے جگری، حاضر دماغی اور سپہگری کا امتحان ہو جائے۔ اس کو یوں کہنا چاہیئے کہ جوانوں کے لئے سب سے بڑی "سند" ہے کیونکہ ان حملوں میں یہہ قبیلے کسی جوان کو اس وقت شریک کرتے ہیں۔ جب کہ وہ دلیری صداقت شعاری اور حافظہ کی زبردست آزمائشوں میں کامیاب ہو چکا ہو۔ یہہ آزمائشیں اتنی سخت ہوتی ہیں کہ ہمارے "بہترین" مدارس کے طلبا بھی ان میں مشکل سے پورے اُتر سکتے ہیں۔

اُن کے یہاں صداقت شعاری کی ایک آزمائش یہہ بھی ہے کہ لڑکوں سے اُن کی زندگی کا ہر واقعہ اور ہر لغزش دریافت کی جاتی ہے۔ اگر معلوم ہو جائے کہ انہوں نے غلط بیانی کی تو سزا یہہ ملتی ہے کہ بھڑوں سے یا زہریلے کانٹوں سے کٹایا جاتا ہے۔ کیا ہمارے یہاں کے طالب علم اس آزمائش کو گوارا بھی کریں گے؟ بایں ہمہ کینیا کے قبیلہ نندی میں ہر سال یہہ دن آتا ہے جبکہ نوجوانوں کو اس آزمائش میں پورا اُترنا پڑتا ہے۔ یہہ گویا اُن کا "سالانہ امتحان" ہے۔ کیپٹن ہیجنس کا بیان ہے کہ انہوں نے بیسیوں نندی قبیلہ کے لڑکوں کو اس آزمائش سے ہنسی خوشی گزرتے دیکھا ہے۔

ان امتحانوں میں کامیابی کا انعام یہہ ہوتا ہے کہ ہتھیاروں کا ایک پورا سامان اُن کو ملتا ہے یعنی سات فٹ کا ایک نیزہ بھینس کے کھال کی ڈھال تیز دھار کی تلوار اور ایک گرز جب

امتحان میں کامیاب ہونے والوں کو یہہ انعام مل جاتا ہے تو وہ اس کے استعمال کے لئے بہت بے چین رہتے ہیں اور جہاں کہیں انھیں کسی دوسرے قبیلہ کا کوئی شخص موقع سے مل گیا تو فوراً نیزے کی مشق شروع کر دیتے ہیں۔ اسی قسم کے "بے قراروں" کو قابوں میں رکھنے کے لئے انگریزی حکومت نے کیپٹن ہیبنسن کو متعین کیا تھا۔ چنانچہ وہ کیکبی نامی ایک گائوں میں گئے جو کچی دیواروں اور چھپروں کی جھونپڑیوں کا ایک مجموعہ تھا۔ گاؤں کی بوڑھی عورتیں وہی اور بیل کے خون سے کچھ تیار کر رہی تھیں۔ نندیوں میں یہہ دستور ہے کہ زندہ بیلوں کی گردن کی ایک رگ کو کند نوک کے چوبی تیر سے چھید کر خون نکالتے ہیں اور جب کافی حاصل ہو جاتا ہے تو پھر گارے اور کٹی ہوئی پتیوں سے اس زخم کو بند کر دیتے ہیں۔ لڑکوں کی غذا چونکہ زیادہ تر یہی ہوتی ہے اس لئے مدرسہ کی آخری میقات کے ختم پر یہہ گویا اُن کے لئے "مٹھائی" تیار ہو رہی تھی۔

ایک روز شب کو مطلع صاف تھا اور چاند کی پہلی تاریخ تھی "امتحان جوانمردی" کا آغاز ہوا۔ مختلف گاؤں سے لوگ اپنے اپنے لڑکوں کو لائے، جن کی عمریں بارہ اور سترہ کے درمیان تھیں اور کیکبی کے "اُستادوں" کے حوالہ کر دیا۔ لڑکے ذرا پریشان سے نظر آئے۔ اور تھی بھی پریشانی کی بات کیونکہ بعد کے چند دنوں میں اُن کے لئے عجیب آزمائشیں پنہاں تھیں شام کو جب لڑکے کھانے وغیرہ سے فارغ ہو چکے تو اُستاد اُن کا ایک دستہ بنا کر چند میل دور جنگل میں لے گئے۔ راستہ وحشت ناک تھا رات تاریک تھی۔ یہہ بجائے خود ہمت کی ایک آزمائش تھی۔ درندوں کی مہیب آوازیں الگ آ رہی تھیں کہیں بجّو کی چیخ سنائی دیتی تھی تو کہیں شیر گونج رہے تھے۔ پہلے شیرنی کی آواز گونجی اور پھر شیر کی گرج سُنائی دی تھی جو سب کے سب سن رسیدہ تھے بیل کی کھال کے لبادے میں لپٹے ہوئے خاموش چلے جا رہے تھے اور لڑکے جو تقریباً برہنہ تھے سوائے اس کے کہ ایک ہلکی سی چھوٹی چادر اُن کے کندھوں پر پڑی ہوئی تھی پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے اور سب کے سب تھرتھرا رہے تھے کیونکہ رات بہت سرد تھی۔

مدرسہ کا قیام | یہہ لوگ دریا کے کنارے کنارے چند میل جنگل میں اسی طرح چلتے رہے

پھر جہاں جاکر ٹھیرے وہ ذرا کھلا ہوا مقام تھا لیکن اندھیرا وہاں بھی گھپ تھا۔ اور چاروں طرف سے عجیب وغریب آوازیں آرہی تھیں۔ کہیں چمگادڑوں کی سرسراہٹ اور اُن کے دانت بجنے کی آواز آتی تھی دور کہیں جنگل کی گہرائیوں میں سے آتی ہوئی اُلّو کی چیخ سنائی دیتی تھی۔ اس قافلہ کے ساتھ کپتان ہجینس بھی تھے۔ اب چلتے چلتے اتنا عرصہ ہوگیا تھا کہ پو پھٹنے کے قریب آئی۔ کپتان موصوف کے آدمیوں نے ایک موزوں مقام پر اُن کا خیمہ نصب کر دیا، لیکن اُستاد اور شاگرد سب کے سب جنگل میں گھس گئے اور تھوڑی دیر میں ڈنڈے، شاخیں اور گھانس کے پُولے لئے ہوئے واپس آئے۔ اس سامان سے انہوں نے ایک بڑا سا جھونپڑا تیار کیا۔ یہہ گویا "مدرسہ" تیار ہوگیا۔ اس میں فرنیچر کی قسم سے کوئی چیز نہ تھی سوائے اس کے کہ چند چوبی اسٹول تھے جو لڑکے اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ چھہ مہینے کے لئے یہی جھونپڑا اُن لڑکوں کے لئے "مدرسہ" ہوگیا۔

اس جھونپڑے کے تیار کرنے میں اُن کو دو دن تک سخت محنت کرنا پڑی۔ لیکن لڑکے صبح ہی تڑکے پہلی "آزمائش" کے لئے تیار ہوگئے۔ اُن کے معلم "مسٹر رفق" کہلاتے ہیں، اُن میں سے ایک نے جھونپڑے کے دروازے پر ایک چوبی اسٹول رکھدیا اس اسٹول پر ہر لڑکا باری باری سے بیٹھا۔ ہر لڑکے کے سر پر بیٹا ہوا دودھ ملا گیا اور استرے سے سر کے سارے بال صاف کر دئے گئے۔ جب سب لڑکوں کے سر اس طرح مونڈ دئے گئے تو اُن سب کے بال جمع کر کے جنگل میں آفتاب کی سمت میں پھینک دئے گئے۔ یہہ گویا سورج دیوتا کی بھینٹ تھی، جس کو وہ سب سے بڑا دیوتا خیال کرتے ہیں۔ نندی قبیلہ میں اس کا نام "آسیس" ہے۔ پس یہہ کہنا صحیح نہیں کہ یہہ قبیلہ کسی "مہادیو" کو نہیں مانتا۔ بلکہ "آسیس" کی پرستش اور اس سے عمدہ الفاظ میں دُعائیں مانگنا نندی متعلمین کی تعلیم کا جزو ہے۔ جب لڑکوں کی روحوں کو "پاک" کرنے کی یہہ رسم ادا ہوچکی تو ہر لڑکے کو ایک دوا کافی مقدار میں پلائی گئی تاکہ اس کی صحت جسمانی میں فرق نہ آنے پائے۔ دنیا جہاں کے لڑکوں کی طرح ان لڑکوں نے بھی دوا پیتے وقت بہت کچھ مُنہ بنایا۔

مکاری کی آزمائشیں:۔ اس کے بعد اُن کے معلموں نے کچھ کام بتائے اور کچھ ہدایتیں دیں

جس میں وہ سہ پہر تک مصروف رہے۔ اب نندی جنگجویوں کا ایک جتھا جملہ ہتھیاروں سے مسلح جنگل میں آ نکلے بڑھا اور لڑکوں کو جھونپڑے میں سے نکال کر ایک قطار میں بٹھا یا ہر لڑکے کے سامنے ایک ایک جنگجو دو زانو بیٹھ گیا اور تیوری پر بل ڈال کے ہر لڑکے کی آنکھوں پر اس کے سامنے کے جنگجو نے اپنی آنکھیں جما دیں کہ گویا وہ لڑکے کے دل کے اندر کی باتوں کو بھی دیکھ لے گا۔ ایک گھنٹے تک یہ لڑکے آنکھیں کھولے اُن مہیب صورت جنگجویوں کی آنکھوں کو دیکھتے رہے جو دراصل لڑکوں کی مکاری اور بزدلی کی آزمائش کر رہے تھے۔ جس لڑکے کی آنکھیں جھپکتیں یا اُس پر ہراس طاری ہوتا تو اس کو دوسری آزمائش کے لئے بیٹھنا پڑتا۔ اگر اب بھی وہ اپنے بے رحم ممتحنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ایماندار لڑکے کی طرح نہ ڈال سکتا تو اس کو ذلت کے ساتھ گھر واپس بھیج دیا جاتا۔ لیکن کیکبی کے اس کیمپ میں کوئی لڑکا ایسا نہ تھا جو اس آزمائش میں پورا نہ اترا ہو۔ اس لئے غروب آفتاب تک اُن کو کھیلنے اور کچھ کما لینے کی چھٹی دی گئی۔ اس کے بعد ایک سخت آزمائش سے گزرنا پڑا۔

یہ آزمائش عجیب بات ہے کہ ان جدید سائنٹیفک تعلیمی طریقوں سے بہت ملتی جلتی ہے جو متمدن دنیا کے بعض مدارس میں ہوتے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس آزمائش سے دماغی اور اخلاقی کردار (CHARACTER) بنتا ہے اور قوت فیصلہ اور قوت فکر پیدا ہوتی ہے۔ واقعی اس وقت کا منظر بھی اس جنگل میں خوب تھا جبکہ رات ہو چکی تھی اور تارے ٹمٹمانے لگے تھے اور جنگل کے باشندے بیدار ہو گئے تھے۔ کہیں سے تو گیدڑ کی پکار سنائی دیتی تھی کسی طرف سے بجّو کی آواز آتی تھی اور کہیں سے کوئی دوسری ڈراؤنی آواز آتی تھی۔

لڑکے پھر جھونپڑے میں سے ایک قطار میں نکلے اور باہر کھلے میدان میں آ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ ہر لڑکا اپنے خیالات میں محو تاروں کو دیکھنے لگا۔ اس وقت کامل خاموشی طاری تھی ایک لفظ بھی کسی کی زبان سے نہ نکلا۔ ہر لڑکا معلموں کی ہدایات کے بموجب اپنی زندگی کے ہر ہر واقعہ کو مستحضر کرنے میں مصروف تھا۔ واضح رہے کہ نندیوں میں نوشت و خواند کا بالکل رواج نہیں اس لئے اُن کے پاس کتابوں کا کوئی ذکر ہی نہیں لیکن ہر وہ لڑکا جو اس آزمائش گزر جاتا ہے بجائے خود ایک کتاب یا خزانۂ معلومات

بن جاتا ہے۔ اب اس کو قبیلہ کی تاریخ، رسم و رواج اور اس کے قوانین، مذہب جادو اور ٹونے ٹوٹکے وغیرہ سب معلوم ہو جاتے ہیں۔ علاوہ اس کے اس کو مفصل طور پر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مویشیوں کی افزائش کس طرح کی جاتی ہے، زراعت کس طرح ہوتی ہے کھالوں کی دباغت کس طرح عمل میں آتی ہے اور اسی طرح کی بیسیوں صنعت و حرفت کی باتوں کو وہ جان جاتا ہے۔ ہر اہل بادیہ کے لئے قوت حافظہ بہت ضروری ہے اس لئے نندی لڑکے کے لئے حافظا ور عام معلومات کا یہ پہلا امتحان ہوتا ہے جس میں اُسے کامیاب ہونا پڑتا ہے۔

ایک گھنٹہ تک خاموش غور و فکر کرنے کے بعد لڑکوں کی قوت برداشت کا امتحان لیا گیا۔ لڑکوں نے اپنے کپڑے اُتار پھینکے اور ایک قطار بنا کر جھونپڑے میں پچھے کے دروازے سے داخل ہوئے۔ اندر ایک کنارے کی طرف معلموں نے ڈالیوں سے ایک طرح کا پنجرا بنا رکھا تھا جس میں دو دروازے تھے۔ ہر دروازے پر دو دو جنگجو کھڑے تھے۔ اُن کے ایک ہاتھ میں ''ادبوبو'' (افریقیہ کا بچھو کا درخت جس کا ہر ایک جو بچھو کی طرح ہوتا ہے، ہندوستانی بچھو سے کوئی دس گنا زہریلا ہوتا ہے) کی ایک شاخ تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کدو تھا جس کے منہ پر ذرا سا چمڑا تھا جو انگوٹھے سے دبا ہوا تھا۔

اب سب لڑکے ہاتھوں اور گھٹنوں سے چلنے لگے اور اس پنجرے میں سے گذرنے لگے۔ جوں ہی وہ ایک دروازے میں سے گزر کر دوسرے سے نکلنے لگے، اُن جنگجویوں نے لڑکوں کے موہنوں پر بچھو کی شاخوں سے مارنا شروع کیا اور ان کدوؤں کو ہلا کر کھول دیا جن سے زندہ اور غصہ میں بھرے ہوئے زنبور نکل نکل کر لڑکوں کی ننگی پیٹھوں پر کاٹنے لگے۔ کیپٹن ہیچنسن لکھتے ہیں کہ زنبوروں نے ان جنگجویوں کو بھی نہ چھوڑا اور نہ خود کیپٹن موصوف کو لیکن کیا مجال جو ان لڑکوں میں سے کسی ایک نے چیں بھی کی ہو بلکہ وہ ایک دروازے میں سے داخل ہو کر دوسرے دروازے میں سے نکل گئے گویا کہ وہ متمدن لڑکے تھے جو کسی بازی گاہ میں کھیل کود میں مصروف تھے۔ اس میں شک نہیں کہ متی

اور تیل کی مکرر سہ کرر مالش سے نندی لڑکوں کی جلد ہمارے لڑکوں کی جلدوں کے مقابلے میں سخت تر ہو جاتی ہے۔ پھر بھی قوت برداشت کی یہ ایک زبردست آزمائش تھی۔

جھونپڑے کے دوسرے کنارے پر سمور کا لبادہ پہنے اور سر پر شیر دھان نقاب ڈالے نہایت شان کے ساتھ ایک معلم چوبی اسٹول پر بیٹھا تھا۔ پنجرے سے نکلنے کے بعد ہی ہر لڑکا اس معتر رونق کے سامنے آکر کھڑا ہوتا۔ اور اپنی زندگی میں جو کچھ وہ کر چکا ہوتا ہے سب کا اقرار کرتا ہے معتر رونق کو لڑکے کے والدین اور گاؤں والوں سے پہلے ہی سے لڑکے کے بہت سے حالات معلوم ہو جاتے ہیں اس لئے اس کے سامنے لڑکے کو جھوٹ بولنے یا سچ کو چھپانے کا بہت کم موقع رہتا ہے۔ ایک لڑکے نے ذرا سرکشی اختیار کی اور خاموش ہو گیا۔ اس پر ایک اسٹول لایا گیا، اس کی نشست پر اوبوبو کی شاخیں ڈال دی گئیں اور لڑکے کو اس پر بٹھلایا گیا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ اس کو برداشت کر گیا، حالانکہ اس پر بیٹھنا آگ پر بیٹھنے سے کم نہ ہوگا لیکن آخر اس سے نہ رہا گیا اور اس نے قبول دیا کہ ایک مرتبہ چوری کی تھی جبکہ ایک بڑھیا کی جھونپڑی سے وہ ایک بکرا چرا لایا تھا۔ دوسرے دن صبح کے وقت ان "معلمین" کو ایک دوسری آزمائش سے گزرنا پڑا۔ جب جا کر وہ کبھی کامیاب ہوئی۔ یہ گویا اس صحرائی مدرسہ کی آخری میقات کا امتحان داخلہ تھا۔

مدرسہ کا ضابطہ ہمارے مدرسوں کی طرح ان کے یہاں بھی ایک ضابطہ قوانین مقرر ہے جن کی پابندی سختی سے کرائی جاتی ہے پہلے چار روز تو لڑکے گویا "مقید" کر دئے جاتے ہیں اور ان کو کسی دوست سے ملنے یا بات کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ایک خاص قاعدہ یہ بھی ہے کہ ان کو کھانے کے لئے جو برتن دیا جاتا ہے وہ چھوٹی سی شہد کی کپی ہوتی ہے حالانکہ عام طور پر نندی کھال کی پلیٹ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح لڑکے ایک مہینہ تک پابند رکھے جاتے ہیں اور ان کو شکار اور نشانہ بازی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ قبیلہ کی روایتوں اور علمی مشاغل کے درس کے علاوہ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، نندی لڑکوں کی تعلیم میں والدین بزرگوں، اور سرداروں کے آداب بھی شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی لڑکے کے لئے جائز نہیں کہ اپنے باپ کے سامنے بلا اجازت بیٹھ جائے، اور نہ یہ درست ہے کہ

گفتگو میں ابتدا کرے۔ سب کے سامنے اُسے نہ تو تھوکنا چاہیئے اور نہ کوئی ناموزوں حرکت کرنا چاہیئے۔ جب اس کی شادی ہوتی ہے تو بیوی کے ساتھ پیش آنے کے جو سخت قواعد ہیں اُن کی اُسے پابندی کرنا پڑتی ہے۔ اور پھر اس کو صحرائی ملاقات کے آداب بھی بتلائے جاتے ہیں۔

قبیلہ کے جتنے قاعدے قانون ہوتے ہیں اُن کی سختی سے پابندی کرنا پڑتی ہے بعض اوقات ترغیب و تحریص کے مقابلے میں ان قوانین پر عمل بہت دشوار ہوجاتا ہے چنانچہ کیپجن شاخ کے نندی لڑکے کو گورخر کا گوشت کبھی نہ کھانا چاہیئے خواہ وہ کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہو۔ حالانکہ گورخر کا شکار بہت آسان ہے۔ اس کو نہ تو زمین میں کوئی گڑھا کھودنا چاہیئے۔ نہ شکار کے لئے کوئی جال بچھانا چاہیئے اور نہ کسی جانور کی کھال میں پہننی چاہیئے بجز خرگوش کی کھال کے، حالانکہ اس کا شکار بہت دشوار ہے۔ ایک قبیلہ میں یہ دستور ہے کہ لڑکے کے لئے گدھے کو چھونا جائز نہیں۔ ایک دوسرے قبیلہ میں لڑکوں کو یہ اختیار خاص دیا گیا ہے کہ جھگڑوں کے فیصلہ کرنے کے لئے حکم وہ مقرر کریں۔ ایک اور قبیلہ میں ان کو چشموں کی تلاش اور چشمہ کے پانی کے استعمال کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ان سب پیچ در پیچ قوانین کو لڑکے صحرائی مدرسہ میں مزید تین مہینے کی مدت میں سیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اُن کو ایک دوسری آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ دریا میں ایک جھونپڑی زیر آب بنائی جاتی ہے اور ہر لڑکے کو دھارے میں غوطہ مار کر جھونپڑی میں سے چار دفعہ گزرنا پڑتا ہے۔ قبیلہ والوں کی نظروں میں اس طرح "آسیں" کے سامنے لڑکے "پاک وصاف" ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد آٹھ ہفتے کی تعلیم ہوتی ہے اور پھر وہ "کامیاب" سمجھے جاتے ہیں۔

یہ دن اُن کے لئے انتہائی فخر و مباہات کا دن ہوتا ہے۔ اب وہ اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں ہر لڑکا اپنے باپ کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے۔ اگر اس کی کوئی بہن ہوتی تو وہی ہمیشہ اس کے لئے دروازہ کھولتی ہے۔ پھر وہ باپ کو نہیں بلکہ ماں کو سلام کرتا ہے اور ماں ہی کے ہاتھوں وہ انعام پاتا ہے۔ اور ماں نہایت خوش خوش اس کو سات فٹ کا نیزہ، بھینس کی کھال کی ایک زبردست ڈھال جس پر اس کے قبیلہ کا نشان بنا ہوتا ہے، سرخ میان میں ایک تلوار کانوں میں پہننے کے چھلے اور ایک گرز حوالہ کر دیتی ہے۔ آج کا دن نندی قبیلہ کی بوڑھی عورتوں کے

لئے بڑے ہی فخر کا ہوتا ہے، کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ اب خوف، بزدلی، کاہلی اور مکاری اُن کے لڑکے کے پاس تک پھٹک نہیں سکتیں۔ اور اب اُن کا لڑکا قبیلہ کے جرگوں میں شریک ہونے اور رائے دینے کا اہل ہوگیا ہے، اب وہ اپنا رعب داب بھی قائم رکھ سکتا ہے اور اپنے قبیلہ کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے قابل ہوگیا ہے۔

نوجوانوں کو اپنی طاقت دکھلانے کے لئے نیزوں کو "خون آلود" کرنے کا موقع دیا جاتا ہے یعنی کسی دشمن قبیلہ پر حملہ کرنے اس کے آدمیوں کو قتل کرنے اور اُن کے مویشی چھین لانے کے لئے اُن کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ اگرچہ یہہ کوئی امر پسندیدہ نہیں لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی لوگ جو چند ہفتہ پیشتر لڑکوں میں شمار کئے جاتے تھے، اپنے "مدرسہ" کی تربیت کی وجہ سے کس قدر بے خوف ہوگئے ہیں۔

نوخیزوں کو جوانمرد بنانے کا جو طریقہ ان وحشیوں کے یہاں جاری ہے وہ اگرچہ کلیتہً پسندیدہ نہیں تاہم اس میں بعض امور ایسے ہیں جن سے ہم بھی سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ ان لڑکوں کی معلومات کافی ہوجاتی ہیں قانون کے احترام کا جذبہ ان میں پیدا ہوجاتا ہے۔ اور وہ اپنی قوم پر فخر کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ اور پھر یہہ کہ والدین کے ساتھ عزت کا برتاؤ اس وقت اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے جبکہ ننڈی بوڑھی عورت اپنے لڑکے کو "پروانہ جوانمردی" عطا کرتی ہے۔ یہہ باتیں ایسی ہیں کہ ہر شخص ان کی تعریف کرے گا۔ اُن کے غلط عقیدے اور توہم پرستی سے ہم کو سروکار نہیں۔

روداد ذیلی کمیٹی متعلق تعلیم جغرافیہ

جغرافیہ کی تعلیم کو جو روز بروز اہمیت دی جا رہی ہے اس کا ثبوت جغرافیہ کے شعبوں کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد سے ملتا ہے جو دنیا کی مختلف جامعات میں قائم کئے جا رہے ہیں اور نیز ان مساعی سے جو پچھلے چند سال میں اس کو مدارس کے نصاب میں نمایاں جگہ دینے کے بارہ میں کی گئی ہیں۔

جغرافیہ کی تعلیم کے فوائد: جغرافیہ کی تعلیم سے بچہ کو اپنے قریبی ماحول کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے جس سے ذاتی تجربہ کے بہت سے حقائق اس کے سامنے آجاتے ہیں جب وہ اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑاتا ہے اس کا تخیل بھڑک اُٹھتا ہے اور جب وہ اپنے ملک کے جغرافیہ کا مطالعہ کرتا ہے اس کی حب وطنی جاگ جاتی ہے اگر وہ جغرافیہ کا مطالعہ صحیح طریقہ سے کرے تو اس میں اصابت رائے اور استدلال کی قوت پیدا ہوگی بلکہ ان سے زیادہ گہرے سبق بھی حاصل ہوں گے بڑی عمر کے طلبہ کو اگر ٹھیک طور پر جغرافیہ کی تعلیم دی جائے تو اس سے ان میں تنگ نظر حب وطنی نہیں پیدا ہوگی بلکہ اس کا ثمرہ سچی معاشرتی ہمدردی اور بین الاقوامی نیک اندیشی ہوگا اور اس کے ساتھ شہریت کے فرائض کا خیال بھی پیدا ہوگا جو عمدہ شہری بننے میں مدد دیتا ہے دنیا کی قوموں کا باہمی تعلق معاشی حیثیت سے بڑھتا جا رہا ہے اور روز بروز اس شعر کی صداقت واضح ہوتی جا رہی ہے

چو عضوے بدرد آورد روزگار　　دگر عضوہا را نماند قرار

عمدہ مرتب کئے ہوئے نصاب کے ذریعہ سے بچے جغرافیہ کے بعض اہم مسائل سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے لیکن اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ اس کی تعلیم میں وہ نچ کے خاص کر تجربے قوت فیصلہ تجسس اور ذاتی مطالعہ کو کام میں لائیں۔ ان سے اس کی بھی مشق کرائی جائے کہ وہ ان اصول کو اپنے ضلع اور ملک کے حالات پر منطبق کریں۔ نقشوں کا مطلب سمجھنا اور ان کو کام میں لانا خصوصاً کسی خطہ کی خصوصیات کی توضیح میں (یعنی طبعی خصوصیات آب و ہوا و پیداوار ہر قسم کے

مفید معلومات کے حصول کے ساتھ ساتھ جاری رہے۔ نصاب کے ختم پر بچے محض حقیقت کے اظہار پر اکتفا کریں گے بلکہ اس قانون کو معلوم کرنے کی خواہش کریں گے جس کے وہ تابع ہیں۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کس طرح اور کہاں سے اُسی چیز کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں جس سے ان کو خاص طور پر دلچسپی ہے۔

دوسرے مضامین سے جغرافیہ کا تعلق جغرافیہ کے اس پہلو پر حیدرآباد ٹیچر کے ماہ جون سنہ رواں کی اشاعت میں بحث ہو چکی ہے۔ اس وقت صرف اتنی توجہ دلانی ہے کہ نصاب تعلیم کے مضامین میں سے کسی ایک کے باہمی تعلق کی اتنی اہمیت نہیں جتنی کہ جغرافیہ کی اس میں کچھ شک نہیں کہ جغرافیہ کے بعض مسائل کی تعلیم دوسرے علوم مثلاً سائنس کے اُصول سے واقفیت کے بغیر نہیں دی جاسکتی۔ عملی اور ٹھیک ٹھیک ناپ جوکھ جتنا کہ ریاضی کے لئے ضروری ہے جغرافیہ کے لئے بھی لازمی ہے اور مطالعہ فطرت سے اس کا ربط بھی مساوی طور پر قریب ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بغیر جغرافیہ کی طرف رجوع کئے ہوئے نہیں ہوسکتا اسی طرح جغرافیہ کا بہت کچھ مطلب بغیر تاریخ کی طرف وقتاً فوقتاً رجوع کئے ہوئے فوت ہو جاتا ہے۔ نمونے کا تیار کرنا اور ٹکڑوں کو جوڑ کر نقشہ بنانے کے لئے مختلف اشکال کا کاٹ کر نکالنا۔ دستی مشاغل کی مفید مشقیں ہیں۔ اسی طرح جغرافیہ کے بیانیہ تشریحی حصہ سے مضمون نگاری کی مشق کے لئے وافر مواد حاصل ہوتا ہے

جغرافیہ کی وسعت لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ چونکہ جغرافیہ کا تعلق دوسرے مضامین سے اتنا قریبی ہے اس لئے اس کا کوئی مستقل وجود ہی نہیں۔ اس کا میدان وسیع ہے اور اسی سبب سے نہایت احتیاط کے ساتھ اس کے مواد کا انتخاب کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اس کا نصاب باہر کی ذی اقتدار جماعت مقرر کرتی ہے مدرس کا کام صرف اس کا پورا کرانا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مقررہ نصاب پر نظر ڈالنے سے یہ بات بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اس کی حیثیت محض سفارشی ہے ہندوستان کے ایک مستند شخص نے کہا ہے "کہ تحتانیہ وسطانیہ اور فوقانیہ کا مقرر کردہ نصاب طالب علم ان مدارج سے علی الترتیب فارغ ہونے سے پہلے پورا کرلے تو مدارس کے مقتدر اشخاص کو اس امر کی آزادی حاصل ہے کہ ہر طبقہ کے مختلف جماعتوں کے کام کی تقسیم میں الٹ پھیر اپنی صوابدید سے کرلیں۔"

نصاب کی غرض صرف رہ تمائی ہے دیکھا جاتا ہے کہ مدرس جو کسی جماعت کو بیرونی امتحان کے لئے تیار کرتا ہے اکثر اپنے درس کو مقررہ نصاب پر ڈھالتا ہے۔ پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے ہی ایک مکمل واضح اسکیم تیار کر لی جائے جو بچے کی زندگی کے سارے مدارج پر حاوی ہو اور جس میں ہر جماعت کے سہ ماہی کام کی تفصیل درج ہو۔ اور پھر اس پر کماحقہ عمل ہو۔

الٹ پھیر کرنے کی آزادی نہایت اہم حق کے لئے دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نصاب کو اس طرح مناسب بنا لیا جائے کہ اس میں مدارس کے خصوصی حالات کا پورا پورا لحاظ رہے خواہ یہ خصوصی حالات بچوں سے متعلق ہوں خواہ مدرس سے جس کے ذمے ان کی صحیح رہبری ہے۔

ان عام امور پر نظر ڈالنے کے بعد جن کا ابھی اوپر ذکر آیا ہے ہم ان نہایت نمایاں نقائص میں سے بعض پر غور کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں جن کے اثرات گذشتہ تعلیم پر بہت بری طرح رہے ہیں اور قبل اس کے کہ ہم ایسے عام اصول بتلائیں جن کے تحت بچوں کے مدرسہ کی زندگی کے مدارج سہ گانہ کے کام کی مجوزہ اسکیم ترتیب دی جائے بعض بڑے بڑے نقائص اور ان کے رفع کرنے کی تدبیر پر غور کرتے ہیں۔

تعلیم جغرافیہ کے نقائص تعلیم جغرافیہ کے نقائص کی تعداد ہماری نظر میں پانچ ہے۔

۱۔ اکثر صورتوں میں مدرس کے جغرافیائی معلومات محدود ہوتے ہیں۔ مدارس فوقانیہ کی جماعتوں میں بھی جغرافیہ کی تعلیم ایسے مدرسین کے سپرد ہوتی ہے جن کا مبلغ علم اس مضمون میں بھی اتنا ہوتا ہے جتنا کہ انھوں نے اس کا مطالعہ میٹریکولیشن یا ہائی اسکول لیونگ سرٹفکیٹ کے امتحان کے لئے کیا تھا۔ جغرافیہ میں مہارت رکھنے والے مدرسین کے فقدان کی وجہ یہ ہے کہ اب تک بہت کم ہندوستانی جامعات نے جغرافیہ کے مضمون کو انٹرمیڈیٹ یا بی۔ اے کے امتحان میں داخل کیا ہے۔

۲۔ ٹریننگ کا فقدان۔ بہت سے مدرسین یک قلم اپنے پیشے کی تعلیم سے (ٹریننگ) کورے ہوتے ہیں ایسے مدرسین کے دماغ میں عام اصول بھی نہیں ہوتے جن سے وہ

یہ فیصلہ کرسکیں کہ کیا پڑھانا چاہیئے اور کیا نہ پڑھانا چاہیئے۔ پیشے کی تعلیم پاتے ہی مدرسین بھی اپنے تعلیمی مرکزوں کے ناقص تعلیم کی وجہ سے یہ نہیں جانتے کہ جغرافیہ کی تعلیم میں سب سے بہتر طریقہ کو کس طرح کام میں لائے۔ جغرافیہ سے بڑھ کر شاید ہی کسی دوسرے مضمون کے وسیع اور گوناگون معلومات کی مدرس کو ضرورت ہو۔ یہی سبب ہے کہ اس مضمون کے کم سواد لوگ جب تعلیمی مرکزوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی خامی کا دور کرنا ناممکن ہوتا ہے وقت کی تنگی زیر تربیت مدرسین کو اس کا موقع نہیں دیتی کہ اس مضمون کا خاطر خواہ مطالعہ کریں۔

۳۔ فنی آلات سے تعلیم گاہوں کا اچھی طرح آراستہ نہ ہونا۔ بدقسمتی سے یہ حال تقریباً سارے مدارس کا ہے۔

۴۔ عملی کام سے یک لخت غفلت۔

عملی کام کی اہمیت کا کافی اندازہ تربیت یافتہ مدرسین بھی نہیں کرتے۔

۵۔ دوسرے علوم سے بے تعلقی۔

جن مضامین کو بچے ساتھ ساتھ پڑھتے ہیں ان میں باہمی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح مضامین میں برابری بھی قائم نہیں رہتی اس کا اندازہ اس کام سے ہوتا ہے جو بچے مختلف مضامین میں نیچے کی جماعتوں میں کر چکے ہیں۔

نقائص دور کرنے کی تدبیریں یہ تدبیریں دو قسم کی ہیں۔ بعض نقائص ایسے ہیں جن کا تدارک مدرس کی انفرادی طاقت سے باہر ہے۔ ان کی اصلاح کے لئے ضرورت ہے کہ ہم ملکر عوام کے مقتدر اشخاص پر اثر ڈالیں اور رفتہ رفتہ رائے عامہ کو درست کریں۔ لیکن دوسرے نقائص کا دور کرنا ہمارے بس کی بات ہے۔

جہل۔ اس دیو سے کسطرح نبرد آزمائی کی جائے؟

جو لوگ انگریزی جانتے ہیں ان کے لئے آسان ہے کہ بازار سے عمدہ درسی کتابیں لے کر اپنے معلومات کو مکمل رکھیں۔ طریقہ تعلیم پر کسی اچھی درسی کتاب کا پڑھنا اور بتائے ہوئے اصول کو عملاً جاری کرنا اور ساتھ ہی نفس موضوع پر مطالعہ کو وسعت دینا اچھی خاصی بنیاد کا کام دے گا۔ طریقہ تعلیم پر آسٹرے بر اور رنورس ڈرودی کی کتاب "درس[۵۱] کس طرح دیا جائے" اچھی ہے

---

[۵۱] یہ کتاب کتب خانۂ انجمن اساتذۂ بلدہ کے لئے خریدی گئی ہے۔

اس کے آگے مضمون کی دلچسپی اور کام کی سرگرمی سے رہی سہی باتیں بھی دور ہو جائیں گی۔ دوسری نہایت مفید چیز مضمون کی تعلیمی حیثیت سے متعلق عام غلطیوں کا علم ہے۔

ان کی تعداد سات ہے۔

۱۔ یہ مضمون نصاب تعلیم کے دوسرے مضامین سے باہمی تعلق نہیں رکھتا۔

۲۔ اکثر اوقات خود جغرافیہ کی مختلف شاخوں کو نہایت سختی کے ساتھ بے تعلق رکھا جاتا ہے۔ طبعی۔ سیاسی۔ اور تجارتی جغرافیہ حقیقت میں ایک ہی ہے۔ چاہیئے کہ ان کو ایک ہی سمجھا بھی جائے۔

۳۔ تیسری نہایت صریح غلطی بے ڈھرک تعلیم ہے۔ بچوں سے اصول نکلوانے کی بجائے اس کا بتلا دینا بہت آسان کام ہے۔ لیکن یہ صورت تعلیمی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس بات کو خود بچوں سے نکلوانے میں کہ بنگال میں چاول پیدا ہونے کے کیا اسباب ہیں۔ اور پنجاب میں گیہوں اور دکن میں کپاس پیدا ہونے کے کیا۔ تقریباً ہر ایک کے لیے چھ سے بارہ سبق کا وقت صرف ہو گا۔ لیکن یہ باتیں کبھی فراموش نہ ہوں گی۔ دوسرے اس طریقہ سے اور باتوں کے اسی طرح معلوم کرنے کی بنیاد پڑے گی۔ یہ نہایت ضروری امر ہے کہ بچے ابتدا ہی سے جان لیں کہ جغرافیہ بے ربط تفصیلات کے ذخیرہ کا نام نہیں ہے۔

۴۔ چوتھی نہایت عام غلطی مضمون کے تعلیم کی سختی ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب بچہ مدرسے سے فارغ ہونے کو ہوتا ہے تو اس سے محض زیادہ سے زیادہ تفصیلات کے ذخیرہ کی خواہش کی جاتی ہے اور اس کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی کہ درس اس طریقہ سے دیا جائے کہ بچہ نفسیاتی حیثیت سے بھی ترقی کرے۔

۵۔ سائنٹفک حیثیت سے اس مضمون پر توجہ نہ کرنے سے مندرجہ ذیل خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

الف۔ طبعی قطعات ارضی کو اپنے کام کی بنیاد قرار دینے سے غفلت برتی گئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کو زبانی یاد کرنے کا بھاری بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ جس کا کوئی دیرپا ثمرہ حاصل نہیں ہوتا۔

ب۔ اس بات کی جستجو نہیں کی جاتی کہ فلاں نتیجہ کس علت سے مرتب ہوا ہے۔ بچوں کے دماغ میں، یہ بات بٹھا دینی چاہیئے کہ دنیا کے سارے واقعات قانون کے تابع ہوتے ہیں ان کو یہ نہ سمجھنے دینا چاہیئے کہ چونکہ قانون فوراً نظر نہیں آتا اس لئے اس کا وجود بھی نہیں۔ (مثلاً معاشیات کے قانون سے نہ صرف مدرسین بے پرواہی برتتے ہیں بلکہ ایسے لوگ بھی جو دوسرے معاملات میں خود کو سمجھدار اور دوراندیش ظاہر کرتے ہیں)۔

۶۔ طبقۂ تحتانیہ کی تعلیم کے مواد کا دائرہ نہایت تنگ ہوتا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ ایسا کرنا غلطی ہے کیونکہ

ا۔ اگرچہ طالب علم کا اڑوس پڑوس ہمیشہ تعلیم کا ابتدائی موضوع ہوتا ہے اور آئندہ بار بار اس کا حوالہ بھی آنا چاہیئے تاہم جس مناسب صورت میں کہ چھوٹے بچوں کے سامنے توضیح ہونی چاہیئے اور جتنے خیالات پیش کرنے چاہئیں وہ ایک ملک کے حالات سے فراہم نہیں ہو سکتے۔

ب۔ کسی خاص رقبہ کا تفصیلی مطالعہ طبقۂ تحتانیہ کے لئے قبل از وقت ہے۔

۷۔ ساتویں غلطی جو نہایت عام ہے وہ عملی کام سے غفلت ہے۔ ہر طبقہ کے لئے اس کے متعلق جداگانہ تفصیلی ہدایات بعد میں آئیں گی لیکن تینوں طبقوں میں مندرجہ ذیل اصول کی پابندی بالالتزام ہونی چاہیئے۔

(الف)۔ بچوں کو حقیقی طور پر مشاہدہ کرنا سیکھنا چاہیئے۔

(ب) ان کو کوئی ایسی چیز نہیں بتلانی چاہیئے جو مناسب حد تک وہ خود معلوم کر سکتے ہیں۔

(ج)۔ ترسیمات کا کھینچنا اور اعداد و شمار کے جدول کا تیار کرنا اس وقت تک بے سود ہے۔ جب تک کہ لڑکا خود اپنے مشاہدہ سے ان کو نہ تیار کر سکے۔

(د)۔ جب کسی طے شدہ امر کے مطالعہ کے لئے تعلیمی سفر پر جانے کا فیصلہ کر لیا جائے تو چاہیئے کہ پہلے مدرس تنہا یہ سفر کرے اور اپنے ذہن میں صاف صاف معین کر لے کہ وہ جماعت سے کسی چیز کا مشاہدہ کرانا چاہتا ہے اسے چاہیئے دو ایک تمہیدی درس بھی جماعت

میں دے تاکہ لڑکے جان جائیں کہ انھیں کونسی چیز خاص طور پر غور سے دیکھنی چاہیئے سب سے آخر بات یہ ہے کہ اس سفر میں جو جو باتیں دریافت کی جائیں ان کو اختتام پر جمع کرے۔

۸۔ آٹھویں غلطی جو نہایت سخت ہے وہ نقشوں کی کتاب۔ دیوار کے نقشوں اور تختۂ سیاہ پر کے سادے خاکوں سے غفلت برتنا ہے۔ نقشے اس مضمون کے لوازم میں سے ناگزیر چیز ہیں۔ لیکن ان کی جو قدر ہوتی ہے اس کا اندازہ مدرسوں میں جس حالت میں یہ رکھے جاتے ہیں اس سے ہو سکتا ہے۔

الف۔ اکثر دیوار پر لٹکانے کے نقشے پرانے متروک ہوتے ہیں۔

ب۔ دیوار پر لٹکانے کے طبعی نقشے کی تعداد دوسروں کے مقابل میں بہت زیادہ ہوتی ہے اس میں کلام نہیں کہ فی الحقیقت ان کا ہونا از بس کہ ضروری ہے۔

ج۔ بجائے اس کے کہ ان نقشوں میں چند نام ہوں یا سرے سے کوئی نام نہ ہو ان میں سے اکثر نام سے پٹے ہوتے ہیں۔

د۔ ان نقشوں کو بے پروائی سے بری حالت میں ڈال دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مدرس کو خود اس کا احساس نہیں یہ ایسا طرز عمل ہے جس کی نقل پوری جماعت جلد کرنے لگتی ہے

ہ۔ موٹے بھورے کاغذ پر یا نقش کاری کے کاغذ پر مدرس کے نکالے ہوئے خاکے جن کی غرض وقتاً فوقتاً اسباق کی توضیح ہوتی ہے سرے سے مفقود ہوتے ہیں۔ نقشہ کی غایت وہ ہوتی ہے۔ محل وقوع کے متعلق متعین واقعات کا صحیح اندراج ہوتا ہے۔ پیداوار وغیرہ ظاہر کی جاتی ہیں۔ اور اس قسم کے واقعات اس انداز سے بتلائے جاتے ہیں کہ بچے اپنی ذہنی آنکھوں سے انھیں تصور کر لیں۔ لیکن دیواری نقشہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو ضرورت اس کی بھی ہے کہ ہر لڑکے کے ڈیکس پر نقشوں کی کتاب ہو۔ عملی طور پر جب جانچے جاتے ہیں تو حقیقت کھلتی ہے کہ جغرافیہ کی ابتدائی تعلیم کے وقت نقشوں کے استعمال کی عادت نہ رکھنے سے ان کا کیا حال رہتا ہے۔ وہ اپنے نقشوں میں نہ تو کوئی شہر بنا سکتے ہیں نہ ندی اور نہ کوئی بات حالانکہ دیوار کے نقشہ پر یہ چیزیں انھیں معلوم کرا دی جاتی ہیں۔

عمدہ اٹلس کی قدر و قیمت درسی کتاب سے زیادہ ہوتی ہے اگر دونوں میں سے صرف ایک کو منتخب کرنا پڑے کیونکہ۔

۱۔ اٹلس کی مدد سے بچہ ان رسمی رنگوں سے واقف ہو جائے گا جن سے پہاڑ۔ میدان گرم معتدل اور سرد۔ ٹمپریچر وغیرہ ظاہر کئے جاتے ہیں۔ اور یہہ باتیں نہایت پختہ طور پر اس کے ذہن میں بیٹھ جائے گی۔

۲۔ کسی ایک قطعہ ارضی کا علم ان رنگوں کی مدد سے حاصل ہونے کے بعد دوسرے قطعہ کا علم آسانی سے ہوگا۔

۳۔ نقشوں کی کتاب (اٹلس) کی مدد سے بچے سادے خاکے کھینچنے میں مشاق ہو جائیں گے۔

۴۔ نقشہ سے بچے کسی وسیع رقبہ کے مخصوص خطوط عرض بلد اور طول بلد کو آسانی سے یاد کرلے گا۔ اس سے یہہ فائدہ ہوگا کہ دنیا کے مختلف حصوں کی آب و ہوا کے متعلق جو دھندلا سا مبہم خیال رہا کرتا ہے اس کے ذہن میں اچھی طرح معین ہو جائے گا۔

۵۔ جن لڑکوں کے پاس نقشوں کی کتاب ہوتی ہے ان سے آسان برعظم اور ہندوستان کے نقشوں کے بے دیکھے کھینچنے کی بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے خطوط عرض بلد اور طول بلد سے چوکھٹا بن جائے گا۔ اگر مدرس تختہ سیاہ پر خاکہ میں رقبہ کے نقاط تقاطع کو رنگین کھریا سے ہمیشہ ظاہر کرتا رہا ہے تو جماعت جلد برعظم کا صحیح نقشہ کھینچنا سیکھ لے گی۔ (عموماً درمیانی خط نصف النہار اور شمالی متوازی ڈھانچہ کا کام دیتے ہیں۔ اس پر نقشہ کا خاکہ بنایا جاسکتا ہے)

۶۔ خالص حافظہ کے کام کی جتنی ضرورت کسی امتحان کے لئے ہوگی وہ سب کی سب اٹلس سے پوری ہوسکتی ہے۔ ہم نے نقشہ کے استعمال کی بحث کسی قدر تفصیل سے کی ہے اس کی وجہ کچھ تو اس کی اہمیت ہے اور کچھ وہ غفلت ہے جو مدرسوں میں اس سے برتی جاتی ہے۔ جغرافیہ کے اکثر اسباق کو بغیر نقشہ کی مدد کے ذہن نشین کرنا ایسی ہی ناممکن ہے جیسے بے دانتوں کے معمولی غذا کو ہضم کرنا۔

ہماری روداد کا دوسرا حصہ نصاب کی ترتیب سے متعلق ہے۔ اس وقت جغرافیہ کی تعلیم جماعت دوم سے لے کر ساتویں درجہ یعنی عثمانیہ میٹرک تک دی جاتی ہے۔ انگریزی فوقانیہ مدارس میں جغرافیہ پر اُس وقت تک کافی توجہ نہیں دی گئی جب تک وہ ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کے امتحان کے نصاب میں گروپ ب میں داخل رہا۔ ہم ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ بورڈ کے

حالیہ فیصلہ کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ اس نے جغرافیہ کو فوقانیہ مدارس میں اوپر کی جماعتوں میں امتحانی مضمون قرار دیا ہے۔ مدراس کی جامعہ نے فوقانیہ جماعتوں کے لئے جو نصاب تجویز کیا ہے اسے ہم نے دیکھا ہے ہماری رائے ہے کہ مقامی ضروریات کے تحت معمولی سے ردوبدل کے بعد وہی نصاب نہ صرف انگریزی فوقانیہ مدارس کے لئے بلکہ فوقانیہ عثمانیہ کے لئے بھی اختیار کرلیا جائے۔ قیاس ہے کہ مفید ثابت ہوگا۔ یہہ کہدینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نصاب میں جس طریقہ پر چلنے کی ہدایت کی گئی ہے وہ تمام مدرسین کے لئے مناسب نہ ہوگا۔

تحتانیہ اور وسطانیہ کے لئے جو جغرافیہ کا نصاب مقرر ہے ہماری رائے میں ناقص ہے۔ پہلی بات یہہ ہے کہ خطہ واری تعلیم کے طریقہ کو اکثر بالکل فراموش کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے یہہ کہ مختلف جماعتوں میں نصاب کی تقسیم ٹھیک طور پر نہیں کی گئی ہے۔ مملکت آصفیہ کا جغرافیہ جماعت سوم و چہارم و فارم اول کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ جو مسلسل تین سال تک پڑھایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ جماعت چہارم کے طلبہ کو جماعت سوم کے نصاب سے کچھ ہی زیادہ پڑھنا پڑتا ہے۔ یہہ قریب قریب وہی ہوتا ہے جو وہ پچھلی جماعت میں پڑھ چکے ہیں اسی طرح فارم اوّل کے طلبہ جماعت چہارم کی بہت سی باتوں کو مکرر پڑھتے ہیں۔ اس کا دوسرا اثر یہہ ہوتا ہے کہ چونکہ فوقانیہ کی شرکت سے پہلے وسطانیہ کی تعلیم کے ختم تک طلبہ کے لئے جغرافیہ عالم کا مجمل طور پر پورا کرنا ضروری ہے اس لئے ان پر فارم دوم و سوم میں غیر معمولی بوجھ پڑجاتا ہے اور ان کو اتنا وقت اور موقع نہیں ملتا کہ جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کو اچھی طرح ضبط کرلیں۔ ہماری رائے میں یہہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قبل اس کے کہ طالب علم طبقہ تحتانیہ سے فارغ ہو وہ نہ صرف مملکت آصفیہ کے جغرافیہ سے واقف ہو بلکہ دنیا کے جغرافیہ سے بھی بالخصوص ہندوستان کے جغرافیہ سے کسی قدر آشنا ہو۔

مختلف جماعتوں کے لئے ہم نے جو نصاب تجویز کیا ہے وہ ایک ضمیمہ میں شامل ہے ہم یہاں پر ان اصولوں کے متعلق چند ابتدائی باتیں بیان کریں گے جن پر اس نصاب کی بنیاد ہے۔

عموماً نصاب تین طبقوں پر یعنی تحتانیہ۔ وسطانیہ اور فوقانیہ پر منقسم ہوتا ہے۔ ان تینوں

طبقوں کے مدرس کے مقاصد حسب ذیل ہونے چاہئیں۔

طبقہ تحتانیہ۔ جماعت دوم میں پہونچنے سے پہلے ہی بچوں میں اپنے گرد و پیش سے دلچسپی پیدا کرادی جائے۔ تحتانیہ کے اوپر کی جماعتوں میں اس دلچسپی کو اور اُبھارا جائے۔ بچہ کا خود سے کسی کام میں لگے رہنا خصوصاً تعلیم کے کمرے سے باہر نہایت ضروری ہے اگر ہم یہہ چاہتے ہیں کہ تعلیم بارآور ہو تو مشاہدہ۔ تجربہ۔ اور ناپ جوکھ کو پس پشت نہ ڈالیں۔ اسی طبقہ میں بچوں کو مختلف ماحول میں رہنے والوں کی عادات اور زندگی کے حالات سے واقف ہونا چاہیئے۔

طبقہ وسطانیہ | اس طبقہ میں یہہ مقصد پیش نظر رہے کہ ہندوستان کے جغرافیہ سے رابطہ قائم رکھتے ہوئے بالخصوص ریاست محروسہ سرکار عالی سے جغرافیہ عالم کے عام معلومات کا اجمالی و سیع خاکہ طلبہ کے ذہن میں جمایا جائے۔ طلبہ کو خشکی اور تری کے حصے زمین کی سطح کے اہم حالات آب و ہوا کی کیفیات اور دنیا کے اہم خطوں کی نسبت صحیح معلومات سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ نصاب کے ختم تک طلبہ جغرافیہ کے ابتدائی عام باتوں سے اچھی طرح واقف ہوجائیں دنیا کے محل وقوع۔ زمین کی سطحی شکل وصورت۔ آب و ہوا۔ اور روئیدگی کا جو اثر انسان کے پیشے اور مشاغل پر پڑتا ہے اُس کو معلوم کرلیں۔ ان کے دماغ میں اس کا صحیح تصور رہے کہ طبعی قطعات ارضی کا کیا مطلب ہے۔ وہ اس لائق ہوں کہ ان کو اپنے نقشوں میں صحیح طور پر دکھلائیں۔ اور ان کے محل وقوع اور خصوصیات کا سبب بتلائیں۔ اپنے ملک کا مطالعہ جس کی ابتدا تحتانیہ میں ہوچکی ہے مزید تفصیل کے ساتھ جاری رکھیں۔ اس طبقہ میں صرف نمایاں باتوں پر زور دیا جائے اور تفصیل کے طومار سے ذہن پر بیجا بوجھ نہ ڈالا جائے۔

طبقہ فوقانیہ | اس طبقہ میں تعلیم کی یہہ غایت رہے کہ دنیا کا صاف نقش بہ حیثیت مجموعی ذہن میں مرتسم ہوجائے۔ ان اہم خطوں کے صحیح معلومات حاصل ہوں جن پر وسطانیہ میں سرسری نظر ڈالی گئی تھی۔ جن رقبوں کو نیچے کی جماعتوں میں چھوڑ دیا گیا تھا ان کا مطالعہ خصوصیت سے کیا جائے آگے چل کر یہہ بات بتائی جائے گی کہ فوقانیہ میں مطالعہ کا طریقہ تحتانیہ اور وسطانیہ سے بہت کچھ مختلف ہوگا۔ اس طبقہ میں نقشوں کے استعمال کو زیادہ وسعت دینا چاہیئے۔

متذکرۂ بالا تینوں طبقوں کی نمایاں خصوصیات پر نظر ڈالنے کے بعد یہہ کہا جاسکتا ہے کہ طبقۂ تحتانیہ کا مقصد دلوں میں ولولہ پیدا کرنا اور تخیل کو بلند کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تھوڑی بہت مشق اس بات کی بھی کرائی جائے کہ بچے اپنی قوت تمیز سے آسان علت و معلول کے تعلقات بھی سمجھنے لگیں۔

طبقۂ وسطانیہ کا مقصد عام جغرافیہ میں جو مناظر قدرت سے بحث ہوتی ہے ان کے باہمی تعلقات کو صحیح سمجھنے کی قوت کو ترقی دینا رہے۔ اس سے کامل مرکب یا مختلف ٹکڑوں سے بنی ہوئی کام کی تصویر حاصل ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ بار بار اپنے ملک کے حالات سے مقابلہ کیا جائے اور ان حالات کے علم کے ساتھ اپنے ملک کا مطالعہ کیا جائے۔

طبقۂ فوقانیہ کی تعلیم سے اپنے اور اجنبی ممالک کی وسعت اور وقوع کے متعلق واضح تصور حاصل ہو۔ اور طلبہ یہہ دیکھیں کہ ہر سلطنت اسی ماحول سے جکڑی ہوئی ہے جس کے زیر اثر وہ ترقی کر کے اس درجہ کو پہونچی ہے۔ ایسی تعلیم سے ضرور حب وطنی اور رواداری پیدا ہوگی۔

مختصر یہہ کہ طبقہ تحتانیہ۔ وسطانیہ اور فوقانیہ کے مقاصد حسب ذیل ہونے چاہئیں۔

تحتانیہ۔ ولولہ پیدا کرنا اور تخیل کو بلند کرنا۔

وسطانیہ۔ قوت تمیز کو ترقی دینا۔

فوقانیہ۔ حب وطنی اور رواداری کا جذبہ پیدا کرنا۔

تعلیم کے طریقے | طبقہ تحتانیہ۔ مختلف طریقے کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ بعض مدارس میں جبکہ دوسرے ممالک کے بچوں کی زندگی کا حال بتایا جاتا ہے۔ طریقۂ تقابل استعمال کیا جاتا ہے اسکیمو کو گھروں میں رہنے والا ظاہر کیا جاتا ہے اور ماہی گیر کی زندگی میدان کے رہنے والے کی زندگی سے ملتی جلتی بتلائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے جنگل کا یورپ کے جنگلوں اور کوتاہ قامت لوگوں کے مسکنوں سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ سیاحوں اور اہم چیز کی کھوج نکالنے والوں کے قصے سناتے ہیں یا ایسے واقعات بیان کرتے ہیں جو اپنے ملک میں سننے میں نہیں آتے۔ زلزلے۔ برف کے بہتے ہوئے تودے یا جنگل کی آتش زدگی کے خطرات کو سر کرنے والے لوگوں کی بہادری کے قصے بھی سنائے جاتے ہیں۔

مدرس کا بلند آواز سے بہادر کے ہفت خوانی کے ایسے قصے کا بلند آواز سے پڑھنا جو جماعت کو پسند آئے اگر چہ یہ قصہ بڑی حد تک خیالی ہی کیوں نہ ہو۔ بہت فائدہ بخش ہوتا ہے مثلاً فن بھیڑیا پکڑنے والے کتے کا قصہ جو نہایت اچھا قصہ ہے۔ اور اگر چہ کتوں کے بارے میں جو لکھے ہوئے قصے ہیں ان سب سے اچھا نہیں ہے۔ انگلستان کے کھلے پہاڑی میدانوں کی اور وہاں کے رہنے والوں کی عام روزمرہ کی زندگی کی ناقابل فراموش تصویر آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ وہاں سے یہ منظر ہٹ کر آسٹریلیا جا پہونچتا ہے۔ جہاں ہم سرحد پر رہنے والے گھوڑے سوار کی تنہائی کی زندگی میں شریک ہوتے ہیں اور اس ملک کے عام حیوانوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اور خرگوش سے نفرت کرتے ہیں۔ بہادر فن کا اپنے آقا سے "جسکی وہ پرستش کرتا تھا"، اور جس سے دو سال سے بچھڑا ہوا تھا۔ دوبارہ گرم جوشی سے ہم کنار ہونا ان خطرات کی ناقابل محو تصویر کھینچ دیتا ہے جو قدیم زمانہ کے سونے کی کان تلاش کرنے والوں کو جھیلنے پڑتے تھے اور جن کا انجام اکثر ہلاکت ہوتا تھا۔ مسٹر سے ٹن بھوسپ سن کی کتابیں بھی چھوٹے لڑکے پسند کرتے ہیں۔ وحاب کا قصہ ایک گھنٹے میں بلند آواز سے پورا پڑھا جا سکتا ہے۔ اس اختصار پر بھی اس میں اتنا مواد ہے کہ جس سے نصف میقات تک کام لیا جا سکتا ہے ہم ولیسی زبانوں میں ان کتابوں کے ترجمہ کرنے کی سفارش کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ ان زبانوں میں اس قسم کی اور کتابوں کے نکلنے کی کوشش کی جائے گی۔ اوپر جو باتیں بتائی گئی ہیں ان کو مدرسین دوسرے ممالک کے متعلق قصہ سناتے وقت کام میں لائیں اور ان کو واضح اور دلچسپ بنائیں۔ جو لوگ سائنس جانتے ہیں وہ انسان کے کارخانہ عالم کے فتوحات کا ذکر کریں۔ اُن اختراعات کو گنائیں جن کی مدد سے قدرتی رکاوٹیں دور کی گئی ہیں۔ ان کوششوں سے واقف کرائیں جو سخت امراض کی بیخ کنی پر صرف کی گئی ہیں۔ گورگس اور اس کی جماعت کا قصہ سنائیں جنہوں نے جان بوجھ کر خود کو تپ زرد کے خطرات کے سامنے سینہ سپر کیا ڈاکٹر شوائٹزر کا واقعہ بتلائے جو یورپ کے مغنی اور مذہب دان ہونے کی شہرت کو چھوڑ کر کانگو کے بخار کے پنجہ میں گرفتار شدہ علاقوں کو مرض سے نجات دینے کی فکر میں لگ گئے۔ اگر وقت صرف کر کے ان میں سے ہر قصہ کو سادگی اور بغیر بناوٹ کے پورے طور پر بیان

کیا جائے تو یقیناً ساری جماعت ہمہ تن گوش ہو کر دلچسپی لے گی۔

اپنے وطن کا جغرافیہ | وطن کے جغرافیہ کی تعلیم کو تحتانیہ کے نصاب کا ضروری جزہونا چاہیئے اس کی ابتدا ارد گرد کے مقامات کے عملی اور مشاہدہ سے تعلق رکھنے والے کام سے ہونی چاہیئے۔ مظاہر قدرت سے متعلق جو سبق پڑھائے جائیں اُن سے آفتاب کی ظاہری حرکت کی طرف توجہ دلائی جائے۔

موسم۔ بہتے ہوئے پانی کے اثر (بارش کے زمانہ میں) بیج بونے اور فصل کاٹنے کا حال بتلایا جائے۔ مقامی دکانوں اور بازاروں میں جو کھانے پینے کی چیزیں اور پہننے کے کپڑے بکتے ہیں اُن کی صحیح جگہ اجنبی ممالک کی زندگی کے قصے ہیں۔ ان کا ذکر اسی سلسلے میں آنا چاہیئے مقامی سڑکوں اور ریل کے راستوں اور ان پر جو آمدورفت ہوتی رہتی ہے اس سے آسان مسائل پیدا ہوں گے جن کو بچے طبقہ تحتانیہ کی تعلیم کے ختم پر اپنی لیاقت سے حل کریں گے۔ غیر متعلق تفصیلات پر زور نہیں دینا چاہیئے لیکن بعض مشہور باتیں ضرور ٹھیک ٹھیک معلوم کی جائیں۔ دکن کی سطح مرتفع اور شمالی ہند کے وسیع میدان کا فرق اور پہاڑی بلند مقامات میں زیادہ بارش پڑنے کا سبب آسانی کے ساتھ نمونوں (ماڈل) سے معلوم ہو جائے گا۔ اس موقع پر اس کو پھیلائے اور مطلب کی توضیح کے لئے تقابل کی چیزوں کو ڈھونڈھ نکالنے کی ضرورت ہے صرف نہایت اہم طبعی خصوصیات۔ پیداوار اور ان کے انسانی زندگی سے متعلق اثرات پر زور دینا چاہیئے۔

طبقہ تحتانیہ میں عملی اور مشاہدہ سے تعلق رکھنے والے کام۔ | جس وقت مدرس آفتاب کے متعلق گفتگو کرنے لگے تو چاہیئے کہ چھوٹے بچوں سے آفتاب کی حرکت کا مشاہدہ بھی کرائے وہ ان کو قریب کے کسی چٹان یا پہاڑی پر لے جائے اور آس پاس کے میدان یا پہاڑی کے حصوں کی بلندی اور ناہمواری کا مشاہدہ کرائے۔ موقع سے کسی دن جب کہ بارش ہو رہی ہو ان کو چشموں ندیوں اور خشکی اور تری کی دوسرے مختلف شکلوں کو بنتے ہوئے بتلائے۔ کبھی کبھار کاشت کیے ہوئے کھیتوں کی بھی چھوٹی سی دوڑ لگائی جائے اس سے بچے مختلف مقامی فصلوں کو بڑھتے ہوئے دیکھ لیں گے۔ قصباتی مدارس میں اس کا انتظام کیا جائے

کہ لڑکے دوکانوں اور کارخانوں میں جاکر دیکھیں کہ ملکی پیداوار کی کیا کیا چیزیں یہاں آ کر تقسیم ہوئی ہیں۔

عمدہ منتخب تصاویر کا استعمال مسلسل جاری رہے تعلیم بذریعہ تصاویر، کو ہر مدرسہ میں ایک اہم امر سمجھا جائے کیونکہ نصاب میں جتنے مضامین داخل ہوئے ہیں ان سب کی تعلیم میں یہ طریقہ فائدہ بخش ہے۔ تصویروں کے دریافت طلب امور پر جماعت کے سامنے بحث و تمحیص کرنے سے بچوں میں خود سے معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔ اور ان کے ذریعے سے وہ غلطیاں بھی دور ہو جائیں گی جو نامعلوم مقامات کے مناظر کے متعلق ان کے دماغوں میں جاگزیں ہوتی ہیں۔

پہاڑ، دریا۔ اور جھیل جیسے عنوانات پر نہ مقررہ سبق ہوں گے نہ ان کی رسمی تعریفات لیکن ان اصطلاحات کے معانی آہستہ آہستہ ذہن میں قائم کئے جائیں گے یعنی مشاغل کا سبق کے موضوع کی توضیح کے لئے روزمرہ جاری رکھنا۔ طبقہ تحتانیہ میں کم از کم سال اول کے لئے نہایت عمدہ مظاہرہ ہوگا۔ ہر جماعت کے پاس ریت سے بھری بڑی لگن ہونی چاہئے سارے بچوں کی شرکت سے اسی ریت پر اس منظر کی نقل اُتروائی جائے جس کی تشریح اس سے پہلے ہو چکی ہے۔ بہت سی تبلیغی انجمنیں اپنی ضروریات کے لئے اس قسم کا نصاب اور اس کے آلات فراہم کرتی ہیں جو اسی طبقہ کے لئے نہایت کارآمد ہوتا ہے۔ ضروری منظر کے پائین کی تصویر مثلاً کسی جاپانی گھر اور باغ کی مقوے کے بڑے سخت تختہ پر نکلی ہوتی ہے جس کو رنگ چڑھانے کے بعد موڑ کر ریت کی لگن کے پشت پر لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح خاندان کے ارکان کی تراشی کر بنائی ہوئی تصویروں سے جن کو اپنے رہنے اور کام کے اعتبار سے پوشاک پہنا دیا جاتا ہے بچوں کے لئے مزید جداگانہ اشغال کا سامان پیدا ہوگا۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ تصویروں کی کافی تعداد جمع کی جا سکتی ہے جس سے شہریوں کی جماعت کا نہایت عمدہ انتخاب بن جائے گا۔ نوسال کی عمر میں مٹی کے نمونے اپنی ضرورت کے لئے تیار کرانے کے کام سے جن سے نہایت قابل قدر فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اتنی غفلت برتی جاتی ہے کہ ایسی کسی کو توقع نہیں ہو سکتی۔ کسی ملک کے ساخت کو پہلے نمونے کے ذریعہ سے

دکھایا جا سکتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ نمونہ کا استعمال محض نقشہ کو سمجھنے کے لئے ہے۔ جب یہ بات حاصل ہو جائے تو نمونہ کے استعمال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

طبقہ تحتانیہ میں نقشہ کا کام | جماعت دوم جن ہدایتوں کا تصوّر ذہن میں ڈالا گیا تھا اُن کو جماعت سوم میں اچھی طرح معین کر دیا جائے ایسی جماعت میں قریبی ماحول کی مادی شکلیں تیار کرائی جائیں۔ کرۂ ارضی کے مطالعہ سے بچوّں کے دماغ میں نقشہ کے متعلق ابتدائی تصورات ڈالے جائیں۔ اس کے بعد براعظم کے خاکے اُتروائے جائیں جن میں وہ سُنے سُنائے قصّے سے متعلق کسی نمایاں خیال کی سادہ شکل نکالیں۔ مثلاً دریائے نیل کے گذرگاہ کے مینارے کانگو کے باشندے کے پست جھونپڑے۔ امریکہ کے باشندوں کی ڈونگی وغیرہ۔

جماعت چہارم میں زیادہ وقت اٹلس کی مدد سے آسان مسائل کے جواب نکالنے پر صرف ہوگا۔ اس امر کے اسباب ڈھونڈھے جائیں کہ حیدرآباد کو پایۂ تخت کیوں منتخب کیا گیا۔ دکن کی آب و ہوا خشک کیوں ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوال غور سے نکال کر حل کئے جائیں۔

طبقہ وسطانیہ طریقۂ تعلیم | اس طبقہ میں اس مضمون کی تعلیم پہلے اسی نہج پر ہوگی جس کی طبقہ تحتانیہ کے متعلق ہدایت کی گئی ہے۔ صرف اتنی زیادتی کی جائے گی کہ دنیا کا جغرافیہ پورا کر دیا جائے گا اور مطالعہ زیادہ باقاعدہ رہے گا۔ مدرس کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خاص خاص اہم واقعات اور وسیع خاکے سے آگے نہ بڑھے اور بار بار اپنے ملک کے حالات سے مقابلہ کرتا جائے۔

جغرافیہ عالم۔ تشریحات معین ربط کے ساتھ رہیں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ مرتب کی جائیں۔ نباتات اور حیوانات کی زندگی کے مخصوص حالات بچّوں کو پہلے ہی معلوم کرائے جا چکے ہوں گے۔ اب آب و ہوا اور سرزمین سے ان کا جو تعلق ہوتا ہے اس کو واضح کیا جائے گا۔ دنیا معین خطّوں میں تقسیم کی جائے گی اور ہر خطّے کے قدرتی ذرائع پر انسانی زندگی کے دارومدار کو صاف طور بتلایا جائے گا۔ مختلف اقوام کے باہمی میل جول اور آمد و رفت پر زور دیا جائے گا۔ خصوصاً ہندوستان اور انگلستان کے تعلقات اچھی طرح دکھلائے

جائیں گے۔

اس نوبت پر پہنچ کر طلبہ اس لائق بن جائیں کہ زمین کی سطح پر خشکی اور تری کی جو عام تقسیمیں ہیں ان کا تصور جما لیں۔ بہت سے مدرسین اس کے لئے بڑے بڑے مفتشین مثلاً مارکو پولو۔ واسکوڈی گاما۔ فرینکلن وغیرہ کی سیاحت کے راستوں پر نظر دوڑاتے ہیں۔

وطن کا جغرافیہ۔ گہرے مطالعہ کے لئے بعض مضامین کا خاص کر ہندوستان کے جغرافیہ کا انتخاب کیا جائے۔ اور نصاب کے ختم تک تعلیم اتنی ترقی کرلے کہ لیاقت طبقہ فوقانیہ کے قابل ہو جائے۔ اپنے ملک کے حالات کا دوسرے کماثل ملکوں کے حالات سے مقابلہ کرنے لگیں۔ صحرائے اعظم کو ریگستان تھار۔ اور چین کے دریا کو گنگا کے گذرگاہ سے تشبیہ دے کر سمجھایا جائے۔ ہمالیہ کے فلک بوس دیوار کا فرق کناڈا یا اردبا سیل کے غیر محفوظ شمالی حصے سے مقابلہ کرکے بتایا جائے۔ شمالی ہند کے میدانوں کا مقابلہ دکن کے سطح مرتفع سے کیا جائے اس طرح اور باتیں بھی بتائی جائیں۔ طبقہ تحتانیہ کی سب سے اونچی جماعت میں جو سوال حل کرائے جاتے ہیں ان سے زیادہ دشوار سوال یہاں حل کرائے جائیں۔

عملی اور مشاہدے کے کام۔ سال کے مختلف حصوں میں آفتاب کے حقیقی مدار کا مشاہدہ کرایا جائے تاکہ یہ معلوم ہو کہ مختلف موسموں میں اس کا ارتفاع کیا ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف موسموں میں لیل و نہار کی درازی پر بھی غور کیا جائے۔ طلبہ سے اس کی مشق کرائی جائے کہ وہ مختلف اعتدال لیل و نہار کے وقت آفتاب کے سایہ پر غور کرکے عرض بلد معلوم کرلیں تعلیمی سیر کے دوران میں طلبہ کو گرد و پیش کا محل وقوع۔ کاشت۔ اور آب رسانی کے طریقے۔ مختلف قسم کی زمین۔ پانی کے بڑے بڑے تالاب مثلاً عثمان ساگر حمایت ساگر اور نظام ساگر دکھلائے جائیں۔ تمہیدی گفتگو اور تھوڑے بہت مطالعہ سے طلبہ ہر تعلیمی سیر کے لئے پہلے سے تیار کرلئے جائیں اور جب وہ واپس ہوں تو جو کچھ انھوں نے مشاہدہ کیا ہے ان سے لکھا کر اس کی تشریح کرائی جائے۔ اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے وہ سکیں۔ نقشے۔ خاکے استعمال کریں طبقہ وسطانیہ کے عملی کام میں موسمی حالات کا نقشہ تیار کرنا تپش پیما سے کام لینا اور کسی ملک کے زراعتی پیداوار معدنیات۔ آبادی

اور درآمد و برآمد کی تفصیل کے چھوٹی جدولوں اور نقشوں کا تیار کرنا بھی شامل ہوگا۔

نقشوں کا کام۔ پہلے سے بڑھ کر اس طبقہ میں نقشوں کے مطالعہ پر توجہ کی جائے۔ نقشوں کے پیمانوں پر غور کیا جائے۔ زیادہ اہم ممالک کے محل وقوع کو عرض بلد اور طول بلد کے ذریعہ سے بتایا جائے۔

نصاب طبقہ فوقانیہ اس مضمون کی تعلیم گذشتہ طبقات میں تعلیم کا جو طریقہ رہا ہے اس سے بالکل علیحدہ طریقہ یہاں رہے گا۔ اس طبقہ میں طالب علم کی حیثیت تفحص و تجسس کرنے والے کی ہوگی اور مدرس کا کام سبق پڑھانا نہیں بلکہ ہدایت کرنا اور راہ بتانا ہوگا۔

جغرافیہ عالم۔ اس طبقہ میں زیادہ تفصیلی نظر جغرافیہ عالم پر ڈالی جائے گی اور بعض خاص مسائل کا زیادہ تفحص کے ساتھ مطالعہ کیا جائے گا۔ تلاش و جستجو کے ساتھ مطالعہ کے لئے خاص مضامین کے انتخاب کا دارومدار مدرس کی معلومات اور دلچسپی پر ہوگا۔ مدارس کی جامعہ کے نصاب میں جغرافیہ عالم پر نظر ڈالنے کا ایک نہایت اچھوتا طریقہ بتلایا گیا ہے۔ اس طریقہ کی رو سے اُن سمندروں کی آب و ہوا کے حالات کا مطالعہ پہلے کرنا چاہیئے جو براعظموں کو آپس میں ملاتے ہیں اور پھر اس کے بعد خود براعظموں کا یہ طریقہ بجائے خود غلط نہیں ہے لیکن ایسا مدرس جس کے سائنس کے معلومات محدود ہیں اس سے احتراز کرے تو بہتر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نئے مطالعہ کو وہ جیتا جاگتا نہیں بنا سکتا۔ وہ جغرافیہ کے معاشی اور تجارتی پہلو کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ اتنا ہے کہ اس طریقہ کو کام میں لانے کے لئے اُسے تجارتی روئدادوں اور سیاہوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا ضروری ہوگا۔

تاریخی طریقے کے موید بہت سے پیدا ہو جائیں گے۔ اور سائنس کی ترقی کی ابتدا جدید طرز کے علمی اکتشافات کے پیہم سے ہوگی۔ کلوں کی نت نئی ایجاد سے رقبہ کا رقبہ اور آبادی کے مرکز اس طرح متغیر ہوتے جا رہے ہیں کہ شناخت میں نہیں آتے۔ اسی طرح موٹر کے ذریعہ سے نقل و حرکت کا طریقہ ہزاروں آدمیوں کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کر رہا ہے۔

وطن کا جغرافیہ۔ وطن کے جغرافیہ کا تمام و کمال اعادہ طبقہ فوقانیہ کے نصاب کا ضروری حصہ نہ صرف اس وجہ سے ہوگا کہ وطن کے جغرافیہ کے مطالعہ میں معنوی اہمیت

پنہاں ہوتی ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اس میں دوسرے ممالک کے حالات سے مقابلہ کرنے اور فرق بتلانے کے لئے مواد ہوتا ہے۔ طلبہ سے مشق کرائی جائے کہ جغرافیہ عالم کے مطالعہ سے جو اُصول اس کو ہاتھ آئے ہیں ان کو اپنے وطن کے حالات پر منطبق کریں۔ مقامی جغرافیہ کی حیثیت بہت کچھ خانگی پیمائش کی ہوگی جس میں ان چیزوں کا مشاہدہ کیا جائے جو مکانات۔ سڑک جنگل۔ وغیرہ سے متعلق ہوں۔ اور اُن کا اندراج مقامی حکومت کے بندوبست کے نقشوں سے کیا جائے۔

علمی اور مشاہدہ سے متعلق کام۔ روزمرہ کا ٹمپریچر۔ دباؤ۔ اور نمی کی طبقہ فوقانیہ کے طلبہ معلوم کریں اور لکھ لیں۔ جماعت کا ہر لڑکا جو نتائج حاصل ہوئے ہیں اُن کا ایک نقشہ تیار کرے اسی زمانے میں لڑکے بلندی نما خطوط کے مطلب اور استعمال کو اچھی طرح سمجھیں گے۔ ظل اسطوانی بنائے جائیں۔ اور خاکے ہر سبق کے اشارے میں ضروری جزو سمجھے جائیں۔ (اس طبقہ میں نوٹ بک کا باقاعدہ معائنہ نہایت ضروری ہے کیونکہ اس نوبت کو پہونچنے تک اشارات لکھ لینے کی عادت پڑ گئی ہوگی جغرافیہ کے مدرس کو اس موقع پر یہ یاد رہے کہ کھُلے اوراق کی بیاض بہت کارآمد ہوتی ہے۔)

طلبہ کو قطب تارہ اور دُبِ اکبر کے مشاہدہ کرنے کا شوق دلایا جائے۔ جہاں کہیں رصدگاہ ہو جیسا کہ حیدرآباد دکن میں ہے اس امر کا انتظام کیا جائے کہ طلبہ دوربین سے اجرام فلکی کا مشاہدہ کریں۔ زمین کی بناوٹ کے سلسلے میں لڑکوں کو دکن کے آتش فشانی چٹان دکھائے جائیں۔ اُن کو اس کا بھی شوق دلایا جائے کہ مختلف اقسام کے قطعات حجری اپنے مدرسہ کے نمائش گاہ کے لئے جمع کریں۔

اس طبقہ کے لئے تعلیمی سفر کا اختیار کرنا ممکن ہوگا۔ سفر کی تیاری ضروری شے ہے۔ اس کے اختیار کرنے سے پہلے صحیح نقشوں اور سوال کے ذریعہ سے طلبہ کو تیار کرلیا جائے۔

ذریعہ تعلیم۔ ہماری تاریخ تعلیم کے اس منزل پر پہونچنے کے بعد اس کی ضرورت چنداں محسوس نہیں ہوتی کہ تعلیم بذریعہ زبان مادری کی اہمیت ظاہر کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم کو یہہ واقعات بھی مدنظر رکھنے چاہئیں کہ اردو ریاست اور جامعہ عثمانیہ کی زبان ہے اور انگریزی سلطنت برطانیہ اور غیر ملکی تبادلہ خیالات کا ذریعہ ہے۔ عملی سیاست کو ان تمام امور پر حاوی ہونا چاہیئے جو ہمارے طریقۂ تعلیم کی پیچیدگیوں میں شامل ہیں۔ ان تمام امور کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے

ہم اس کی سفارش کریں گے کہ جغرافیہ کی تعلیم طبقہ وسطانیہ تک طالب علم کی مادری زبان اُردو۔ تلنگی۔ مرہٹی یا کنڑی میں ہونی چاہیئے۔ اُردو اور انگریزی کی تعلیم اس منزل تک بطور زبان کے ہونی چاہیئے گو ہم یہہ مانتے ہیں کہ مادری زبان میں تعلیم کی تجویز اصولاً ہمیں فوقانیہ اور اس سے بھی آگے بڑہانے جائے گی۔ لیکن ہم یہہ تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ اس اصول کی عام پابندی کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ گو ہمارا یہہ مطمح نظر کتنا ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو فی الحال ہم یہہ سفارش کریں گے کہ باستثنائے حدود انگریزی جہاں موجودہ حالات کے تحت غیرادبی مضامین کے لئے انگریزی کو بطور ذریعہ زبان تعلیم جاری رکھنے کی ضرورت ہے طبقہ فوقانیہ میں جغرافیہ کی تعلیم اُردو ہی میں ہونی چاہیئے البتہ انگریزی نصاب میں بحیثیت مضمون لازمی جاری رکھی جائے ہم یہہ جانتے ہیں کہ بالکلیہ منطقی اصول پر چلنے والے اصحاب ہماری ان سفارشات پر بعید اعتراضات کریں گے لیکن ہم اس پر بھی یہی کہیں گے کہ اگر ہم کو عملی مشکلات کا مقابلہ کرنا ہے تو ہمارے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہے ہم کو انگریزی کا جو خالص غیرملکی زبان ہے ایک نعم البدل معلوم کرنا ہے اور وہ نعم البدل فی الحال اُردو ہے جو دوسری ملکی زبانوں کے لئے راستہ صاف کردے گی۔ اکثر موقعوں پر سفر کی بجائے کثیر التعداد کتب سے کام لینا پڑے گا اور اعلیٰ جماعتوں کو منتخب سوالات کے کرنے کا موقع دینا ہوگا۔ ان کتابوں کے پڑھنے میں بچوں کو تربیت کی ضرورت ہوگی کیونکہ ان کے مطالعہ سے صرف چند ہی کماحقہٗ مستفید ہوں گے باقی کو صرف سطحی معلومات ہوجائیں گے

سفارشات (۱) جامعہ عثمانیہ و دیگر ہندوستانی یونیورسٹیوں کی اقتداری مجالس کو مجبور کرنا چاہیئے کہ انٹرمیڈیٹ و بی۔اے کے نصاب میں جغرافیہ کو مضمون اختیاری کی حیثیت سے شریک کریں اور بعجلت ممکنہ شعبہ جغرافیہ قائم کریں۔

(۲) بعجلت ممکنہ موجودہ نصاب کی ترمیم کی جائے۔ اور طبقات تحتانیہ و وسطانیہ کے لئے خاص طور سے ملکی زبانوں میں جغرافیہ کی موزوں کتابوں کی تالیف کا انتظام کیا جائے۔

(۳) مختلف مدارس میں جغرافیہ کی تعلیم قابل ترین اساتذہ کے سپرد کی جائے۔ اور طبقہ فوقانیہ میں جہاں جہاں ممکن ہو اس مضمون کی تعلیم ایسے مدرسین کے تفویض کی جائے جنہوں نے اس کی خاص تعلیم حاصل کی ہو۔

(۴) ایسے اشخاص کی جنہوں نے جغرافیہ کا خاص مطالعہ کیا ہو زیادہ مشاہرہ یا الونس سے حوصلہ افزائی کی جائے۔

(۵) محکمۂ تعلیمات کو مجبور کیا جائے کہ عثمانیہ ٹریننگ کالج میں جغرافیہ کے ریفریشر کورس کا فوری انتظام کرے اور ان اساتذہ کو جو ایسے نصاب سے مستفید ہونا چاہتے ہوں ہر ممکنہ سہولت و ترغیب بہم پہونچائی جائے۔

(۶) عثمانیہ ٹریننگ کالج میں جغرافیہ کا ایک کمرہ قائم کیا جائے جو مدرسین کے لئے نمونہ ہو جہاں ان کو نئی کتاب اور آلات دیکھنے اور معلوم کرنے کا موقع حاصل ہو۔

(۷) مدارس اور خصوصاً فوقانیہ مدارس کے کتب خانوں میں طلبہ اور مدرسین کے لئے جغرافیہ کی موزوں کتابیں فراہم کی جائیں اور وقتاً فوقتاً جدید کتابوں کا اضافہ بھی ہوتا رہے۔

(۸) سرکار عالی سے بہ اصرار عرض کیا جائے کہ حیدرآباد میں بچوں کا ایک کتب خانہ ایسے شخص کے زیر انتظام قائم کیا جائے جس نے بچوں کے کتب خانوں کی نگرانی میں مہارت حاصل کی ہو۔

(۹) اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی میں دلچسپ مقامات پر ماہرین کے زیر انتظام تعلیمی تفریح کا انتظام کیا جائے۔ اور ایسی سیاحتوں کے لئے سرکار سے رقمی امداد کی درخواست کی جائے۔ نیز ذرائع آمد و رفت کی ایجنسیوں سے خاص نرخ مقرر کرایا جائے۔

انگلستان کے مدارس میں سیاحت عام ہے۔ اور براعظم میں بھی تعلیمی مشاہدات کی غرض سے سیاحت کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ جرمنی اور ممالک متحدہ امریکہ اور آسٹریلیا اس قسم کی سیر کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔

ضمیمہ

نصاب ۔ اس وقت جغرافیہ کی تعلیم جماعت دوم سے سکنڈ فارم یا عثمانیہ میٹرک تک دی جاتی ہے۔ مدارس فوقانیہ انگریزی میں جب تک یہ مضمون ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے نصاب گروپ (ب) میں شامل رہا اس کی طرف توجہ مبذول نہیں کی گئی۔ اس لئے ہم ایچ۔ ایس۔ ایل۔ سی بورڈ کے تصفیہ کو خوش آمدید کہتے ہیں کہ اس نے حال میں جغرافیہ کو مدارس انگریزی

کے فوقانیہ طبقہ میں ایک امتحانی مضمون قرار دیا۔ ہم نے مدراس یونیورسٹی کی فوقانی جماعتوں کا مجوزہ نصاب دیکھا ہے۔ اور ہماری رائے ہے کہ مقامی ضروریات کے مدنظر معمولی ترمیم کے بعد نہ صرف مدارس فوقانیہ انگریزی بلکہ فوقانیہ عثمانیہ کے لئے بھی بخوبی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے خیال میں طبقہ تحتانیہ و وسطانیہ کا مروجہ نصاب نہایت ہی ناقص ہے اور فوری نظرثانی کا محتاج ہے۔ اول تو قدرتی تقسیم کا بالکل لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ دوم نصاب کی جماعت واری تقسیم ناموزوں ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کا جغرافیہ جماعت ہائے سوم و چہارم اور پنجم میں تین سال تک مسلسل پڑھایا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ طلبار جو معلومات جماعت سوم میں حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے بیشتر حصے پر جماعت چہارم میں دوبارہ وقت صرف کرتے ہیں۔ اور اسی طرح جماعت پنجم کے طلبا اُن ہی اسباق کا پھر اعادہ کرتے ہیں۔ جن کو وہ جماعت چہارم میں پڑھ چکے ہیں۔ ایک دوسری خرابی یہہ پیدا ہوتی ہے کہ طالب علم کو وسطانیہ سے نکل کر فوقانیہ میں داخل ہونے کے قبل پورا جغرافیہ عالم سرسری طور پر ختم کرنا ناگزیر ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ جماعت ہائے ششم و ہفتم میں اس پر ضرورت سے زیادہ بار پڑ جاتا ہے اور اس کو اس بات کا موقع نہیں ملتا کہ وہ تمام باتیں ذہن نشین کرلے جو دونوں جماعتوں میں بتائی گئی ہیں۔ ہم یہہ ضروری تصور کرتے ہیں کہ قبل اس کے کہ طالب علم مدرسہ تحتانیہ سے نکلے اس کو نہ صرف ممالک محروسہ کے جغرافی معلومات حاصل ہونے چاہئیں بلکہ ممالک محروسہ کی بیرونی دنیا اور خاص کر ہندوستان کے جغرافیہ سے بھی کچھ واقفیت ہونی چاہیئے۔ تعلیم جغرافیہ کو ماہرانہ فنی اصول پر قائم کرنے کے لئے ہم حسب ذیل نصاب تجویز کرتے ہیں۔

(جدید نصاب مجوزہ)

طبقہ تحتانیہ۔ جماعت اول۔ اس جماعت میں جغرافیہ کی تعلیم ایک علیحدہ مضمون کی حیثیت سے نہیں ہونی چاہیئے بلکہ زبان ملکی۔ مشاہدہ قدرت اور قصہ گوئی کا جزو ہو۔

جماعت دوم۔ طلوع آفتاب کی مدد سے سمت کے متعلق ابتدائی معلومات۔ خاص خاص مقامی طبعی حالات کا مشاہدہ مثلاً دریا۔ کنٹہ۔ تالاب۔ پہاڑ۔ موسم وغیرہ۔

غیر ممالک کے بچوں کی کہانیاں (طرز زندگی۔ غذا۔ لباس۔ طریقہ بود و باش۔ ذرائع آمد و رفت وغیرہ)۔ بر اعظموں کا ذکر مروجہ طریقہ پر نہ کیا جائے بلکہ خاص خاص مناظر کے ذریعہ ان کا محل وقوع اور

طبیعی حالات ظاہر کئے جائیں۔

جماعت سوم۔ ملکی جغرافیہ۔

چوبی سمت نما کے سایہ سے شمالی و جنوبی خطوط کا معلوم کرنا۔ نقشہ کے متعلق ابتدائی معلومات جو قرب و جوار کی چیزوں سے حاصل کی جائیں۔ مثلاً مدرسہ۔ جماعت۔ بازیگاہ۔ گھر۔ نیز اسمات مکان پولیس کی چوکی۔ ڈاک خانہ و چمن۔ جاوڑی (بصورت مدارس دیہی) وغیرہ جغرافی اصطلاحات کی تعریف مقامی نظاروں اور نمونہ جات کی مدد سے۔ ضلع کا ابتدائی جغرافیہ (دیہی مدارس میں) اور شہر کا جغرافیہ (شہری مدارس میں) مطالعہ کرۂ ارض۔

زمین کی شکل اور خشکی اور تری کی تقسیم کے متعلق ابتدائی معلومات نیز بر اعظم و بحر اعظم کے نام۔ ممالک غیر اور اُن کے باشندوں کی کہانیاں مسلسل و مفصل دنیا کے انکشافی قصص اور فراہم کردہ نقشوں کے ذریعہ ان کی توضیح۔

جماعت چہارم (الف) ہندوستان کے جغرافیہ کا خاکہ۔ کرۂ ارض پر اُس کا محل وقوع حدود اربعہ۔ عام طبعی حالات۔ آب وہوا (ابتدائی معلومات) اور خاص خاص پیداوار مثلاً گیہوں کپاس۔ دھان۔

(ب) جغرافیہ ممالک محروسہ سرکار عالی۔

۱۔ قدرتی تقسیم۔

طبعی حالات آب وہوا۔ بارش۔ زمین۔ پیداوار۔ باشندوں کا پیشہ۔ درآمد و برآمد مشہور مقامات۔

۲۔ ملکی تقسیم۔

خطےّ۔ سڑکیں اور ریلیں۔ حکومت۔

(ج) غیر ممالک اور اُن کے باشندوں کے مزید قصہ جات بلحاظ مخصوص محل وقوع ہندوستان۔

طبقہ وسطانیہ۔ فرسٹ فارم (الف) یوریشیا کی عام قدرتی تقسیم۔ خاص خاص قدرتی خطےّ۔ آب وہوا۔ بارش۔ زمین۔ پیداوار۔

(ب) جغرافیہ ایشیاء
ایشیا کی ملکی تقسیم۔ خاص طبعی حالات مخصوص قدرتی خطے اور ان کی خصوصیات۔
(ج) جغرافیہ ہندوستان بحوالہ ممالک محروسہ۔ حتی الامکان قدرتی تقسیم ملحوظ رکھی جائے
سکنڈ فارم۔ (الف) شرقی کرۂ ارض کے قدرتی خطّوں کا عام جغرافیہ۔
(ب) مفصل اعادہ ایشیاء
(ج) شرقی کرۂ ارض کی موسمی ہواؤں کی تفصیل۔
(د) یورپ۔
ملکی تقسیم۔ خاص طبعی حالات، آب و ہوا۔ پیداوار صنعت و حرفت۔ قدرتی خطوں کے مشہور شہر مثلاً مغربی یورپ (جزائر برطانیہ و فرانس) بحیرۂ روم (اطالیہ) تری (جرمنی اور روس) پہاڑی (سوئٹزرلینڈ)
(ہ) یوریشیا کی تجارتی راہیں۔
(الف) بری راہیں۔
(ب) بحری راہیں۔
(ج) ہوائی راہیں۔
تھرڈ فارم۔ جغرافیہ عالم۔
(الف) اعادہ ایشیا و یورپ۔
(ب) جغرافیہ افریقہ۔
طبعی حالات و خاص ملکی تقسیم۔ آب و ہوا۔ پیداوار۔ قدرتی خطّوں کے مشہور شہر مثلاً وادئ نیل۔ وسطی و جنوبی افریقہ۔ ممالک بحیرۂ روم۔
(ج) جغرافیہ جنوبی امریکہ۔
ملکی تقسیم۔ طبعی حالات۔ آب و ہوا۔ پیداوار۔ قدرتی خطّوں کے مشہور شہر مثلاً مشرقی سطوح مرتفع۔ وسطی نشیبی مقامات۔ مغربی سطوح مرتفع۔
شمالی امریکہ۔

(۵) ملکی تقسیم۔ طبعی حالات۔ آب وہوا۔ پیداوار۔ قدرتی خطوں کے مشہور شہر مثلاً صحرائی خطے۔ گیہوں۔ مکائی۔ اور کپاس کے رقبے۔

انجمن اساتذہ بلدہ

رپورٹ شاخہائے انجمن اساتذہ بلدہ بابتہ میقات اول

کچھ عرصہ قبل عنوان بالا حیدرآباد ٹیچر کا مستقل عنوان قائم کیا گیا تھا۔ لیکن شاخہائے انجمن کی بے نیازی کی وجہ سے ہمیں وقت پر مواد نہ مل سکا۔ چنانچہ تھوڑے دنوں کے تلخ تجربہ کے بعد اس عنوان کو خارج کر دیا گیا۔ اب عالی جناب میر مجلس صاحب انجمن اساتذہ کی دلچسپی سے ہمیں پہلی میقات کی روئدادیں وصول ہوئی ہیں جو ذیل میں شائع کی جاتی ہیں۔ اس بات کا البتہ افسوس ہے کہ اس دفعہ میں بھی تمام شاخوں سے رپورٹیں وصول نہ ہو سکیں اُمید کی جاتی ہے کہ معتمد صاحبان مرکز اس ضمن میں خاص طور پر دلچسپی لیں گے اور نہ صرف ہر میقات کے جلسوں کی رپورٹ روانہ فرمائیں گے بلکہ جو دلچسپ تقریریں کی جائیں یا مضمون پڑھے جائیں وہ بھی بغرض اشاعت روانہ فرمائیں گے۔ فقط **ادارت**۔

مدرسہ فوقانیہ دار العلوم بلدہ | میقات اول میں تین جلسہ ہوئے۔ پہلا جلسہ مولوی سید ظہور علی صاحب کی زیر صدارت ہوا۔ اور اس میں "مدارس تحتانیہ میں مطالعہ فطرت کا تدریس" کے عنوان پر بحث و مباحثے ہوئے مطالعہ فطرت کے علمی قدر و قیمت پر روشنی ڈالی گئی اور اس کی کمل خاطر خواہ تعلیم کے لئے میجک لالٹین اور سینما کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ دوسرے جلسہ میں سائنس کا روزانہ عملی زندگی سے تعلق پر دلچسپ تقریریں ہوئیں تیسرے جلسہ میں عضویات اور علم الصحت کی اہمیت ثابت کی گئی اور یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ آج کل حفظان صحت کی تدریس نہ ہونے سے بیشمار خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ طبقہ تحتانیہ وسطانیہ اور فوقانیہ کے لئے مخصوص نصاب پر بھی روشنی ڈالی گئی۔

مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ | مدرسہ ہذا میں صرف دو جلسے ہوئے ایک شہریور ۳۹ ف اور دوسرا مہر ۳۹ ف میں مطالعہ قدرت کی تعلیم میں ذاتی مشاہدہ کی ضرورت بتائی گئی اور کہا گیا کہ اس مضمون کی تدریس کھلے میدان میں یا کسی باغ میں ہو تو زیادہ مفید ہوگا۔ عملی زندگی سے سائنس کا تعلق نئی ایجادوں اور اکتشافات کے ذکر سے ثابت کیا گیا۔

مدرسہ فوقانیہ نامپلی | "مطالعہ فطرت بجماعات تحتانیہ" کے سلسلہ میں مولوی وفادار خان صاحب نے طلبہ

تحتانیہ کو زندہ مچھلیوں کا سبق پڑھایا جو نہایت دلچسپ و سبق آموز تھا بہتر ہوتا اگر مچھلیوں کے نمونوں کی بجائے اصلی مچھلیاں طلباء کے سامنے پیش کی جاتیں۔ دوسرا جلسہ حبیب خاں صاحب کی زیر صدارت "عملی زندگی سے سائنس کا تعلق" کے عنوان پر ہوا اور صاحب موصوف نے نہایت واضح اور مدلل تقریر فرما کر ثابت کر دکھایا کہ ہماری روزانہ زندگی کس قدر سائنس کی رہین احسان ہے آخر میں یہ بھی واضح کیا گیا سائنس اور مذہب میں تصادم نہیں ہوسکتا کیونکہ سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوتے ہیں۔

مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج "مشاہدہ قدرت" پر مولوی کرم علی صاحب نے نمونہ کا سبق پڑھایا جو نہایت کامیاب رہا۔ مولوی غلام محمود صاحب نے نہایت پر مغز تقریر فرمائی اور کھلی ہوا میں تعلیم دینے پر زور دیا۔ جس کی جناب صدر نشین صاحب لفظاً بلفظاً تائید کی۔ مہر کے جلسہ میں سائنس کے عملی زندگی سے تعلق پر انگریزی میں تقریریں ہوئیں۔ اور آبان کے جلسہ میں انسانی پنجر کے پوست کنندہ حالات بیان کئے گئے لیکن علم الاجسام وعلم الصحت کی نصابی اہمیت وحیثیت کا مسئلہ تاریکی میں رہ گیا۔

مدرسہ وسطانیہ رزیڈنسی بازار ا شہریور ۱۳۴۱ ف کے جلسہ میں مولوی برہان الدین صاحب منشی فاضل نے "تعلیم مطالعہ فطرت" کے ضمن میں گلاب کے پھول پر طلباء چہارم کو نمونہ کا سبق دیکر حاضرین کو محظوظ و مستفید فرمایا۔ اس کے بعد مسٹر چندوار کر ایم اے صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ رزیڈنسی بازار نے اسباق الاشیاء و مشاہدات قدرت کا فرق بتلاتے ہوئے نتیجہ خیز مثالوں اور تجارب کا ذکر فرمایا۔ "سائنس کا تعلق روزانہ زندگی سے" کے عنوان پر خیالات کا اظہار تو نہیں کیا گیا لیکن ریڈی صاحب نے پورے دو گھنٹہ تک ٹھوس و مائع و گیسی اشیاء کی شناخت پر نمونہ کا سبق پڑھایا۔ بقیہ وقت اس سبق پر اعتراضوں میں صرف ہوگیا۔ آخر میں مسٹر ہارڈی کر صدر مدرس مدرسہ دویک دروھنی نے بگڑی بات بنائی اور اصل بحث پر اپنے قیمتی خیالات ظاہر فرمائے آخری جلسہ ۲۹ آبان ۱۳۴۱ ف کو بصدارت مولوی تجمل حسین صاحب بی اے۔ بی ٹی ہوا جس میں مسٹر جوشی مددگار پرائمری اسکول و کلفنڈنیا بازار مولوی برہان الدین صاحب نے بالاتفاق یہ خیال ظاہر فرمایا کہ حفظان صحت کی اہمیت کے اعتبار سے اس کو نصاب تعلیم میں لازماً جگہ دی جائے۔

مدرسہ وسطانیہ مستعد پورہ پہلے جلسہ میں جو ۳۰ شہریور ۱۳۴۱ ف کو بصدارت مولوی محمد صدیق صاحب بی اے بی ٹی منعقد ہوا تھا۔ مولوی زین العابدین صاحب نے طلباء جماعت سوم کو پودوں پر نمونہ کا سبق دیا جو بحیثیت مجموعی دلچسپ و کامیاب رہا۔ مسٹر جوالا پرشاد نے اپنی تقریر میں زور دیا کہ مطالعہ فطرت کی تعلیم

کے لئے بچوں کو کھلے میدانوں میں لے جائیں اور جہاں ممکن ہے وہاں عجائب گھروں کی سیر کرائیں۔
صاحب موصوف نے جماعات کے اسباق کی اسکیم تجویز کی اور فرمایا کہ جماعت اول کے طلباء کو گھریلو جانوروں
اور درختوں کا مشاہدہ کرایا جائے۔ جماعت دوم میں معیار تعلیم کو کسی قدر اونچا کیا جائے۔ سوم و چہارم
کے طلباء کو عام نباتات، حیوانات اور موسمی تغیرات وغیرہ کا مشاہدہ کرایا جائے۔ مسٹر منت راؤ نے
فرمایا کہ مطالعہ فطرت کی تعلیم سے حساب وغیرہ جیسے خشک و مجرد مضامین کی تعلیم میں بیحد مدد مل سکتی ہے
مدرسہ میں ایک چھوٹا سا باغ اور عجائب گھر کا قیام نہایت ضروری ہے۔ مسٹر انجیا، مسٹر شیشا دری اور
مولوی کریم الدین صاحبان کی دلچسپ تقریروں کے بعد مولوی محبوب علی صاحب اول مددگار مدرسہ نے
فرمایا کہ مطالعہ فطرت سے انسان اپنے حقیقی معبود کو پہچانتا ہے اس کے علاوہ اس سے ادبی قابلیت
بڑھتی ہے اور دنیاوی کاروبار میں مدد ملتی ہے۔ مختصر یہ کہ مطالعہ قدرت ایک ایسا مرکز ہے جسکے گرد مدرسہ
کے جملہ مضامین متداولہ اکٹھا ہو سکتے ہیں۔ مولوی سید جمیل الدین صاحب نے مشاہدہ فطرت کے لئے
برسات کا موسم مناسب بتلایا اور جناب صدر نے اپنی اختتامی تقریر میں یہ خیال ظاہر فرمایا کہ سبق کی
کامیابی کا دارومدار مدرس کی ذاتی کوشش اور مشاہدہ پر موقوف ہوتی ہے بچوں کو کھلے میدان میں
لیجا کر مناظر قدرت کا مشاہدہ کرائیں لیکن اسباق بچوں کی عمر اور استعداد سے باہر نہ ہوں۔ مدرس مشاہدہ کے
اسباق زیادہ وضاحت سے نہ دے بلکہ طلباء کو اپنی ذاتی کوشش سے معلومات حاصل کرنے کا طریقہ
سکھائے۔ دوسرے جلسہ میں بھی "روزمرہ زندگی سے سائنس کا تعلق" کے عنوان پر متعدد تقریریں ہوئیں
مسٹر شیشا دری نے انگریزی میں فرمایا کہ سائنس کی ایجادات سے روزمرہ زندگی میں بیحد سہولت پیدا
ہوگئی ہے۔ مولوی محبوب علی صاحب نے اپنی پر مغز تقریر میں فرمایا کہ انسان حفظان صحت کے اصول کی
پابندی نہ کر کے سخت نقصان اٹھاتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے تربیت اطفال کے نقائص بیان فرمائے
اور اس امر پر روشنی ڈالی کہ ہم کیونکر مہلک امراض کو سائنس کی ایجادات و اختراعات کی مدد سے
روک سکتے ہیں۔ اتنا کہنا تھا کہ بس غضب ہوگیا۔ اک صدائے دار و گیر بلند ہوئی اور مولوی عبدالعزیز
صاحب آستینیں چڑھائے میدان میں اتر آئے آپ نے فرمایا کہ مجھے اتفاق نہیں ہے کہ انسان سائنس
کے ذریعہ مہلک بیماریوں سے بچتا ہے کیا حفظان صحت کے اصول کی پابندی کرنے سے موت
لاحق نہ ہوگی۔ بھلا مذہبی اعتقاد کے خلاف ہم کیونکر تعلیم دے سکتے ہیں۔ مولوی محبوب علی صاحب نے

لاکھ دلائل و براہین پیش کئے لیکن بے سود۔ عزیز صاحب ایک انچ نہ ہٹے ابھی تو دو دو ہاتھ اور ہوتے لیکن صدر صاحب نے بیچ بچاؤ کر دیا اور فرمایا کہ مولوی محبوب علی صاحب کی تقریر کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ حفظان صحت کے اصول پر کاربند ہونے سے موت ہی ہوگی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان سائنس کے معلومات کے ذریعہ بہت سی مصیبتوں اور امراض سے بچا رہتا ہے جو نا واقفیت کا نتیجہ ہیں دنیا کے جملہ امور علت و معلول کے قانون میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر انسان اپنی جہالت کے سبب اپنی جان کی حفاظت میں ناکام رہے تو موت کا باعث خدا کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔

تیسرے جلسہ میں مولوی جمیل الدین صاحب نے افسوس ظاہر کیا کہ صحت کی طرف سے اس قدر غفلت برتی جاتی ہے اور مولوی زین العابدین صاحب نے فرمایا کہ صحیح دماغ صحیح جسم میں ہوتا ہے۔ اگر جسمانی صحت اچھی ہو تو دماغ ٹھیک طور سے کام کرتا ہے۔ آپ نے زور دیا کہ علم الاجسام و حفظان صحت کی باقاعدہ تعلیم ہونا چاہیئے اور یہ اس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ مضمون کو داخل نصاب کر لیا جائے۔

مدرسہ وسطانیہ جنچل گوڑہ | میقات اول میں انجمن کے صرف دو جلسے ہوئے پہلے جلسہ میں جماعات تحتانیہ میں مطالعہ فطرت پر اور دوسرے میں "سائنس کا تعلق روزانہ زندگی سے" پر تقریریں ہوئیں جماعات تحتانیہ میں مطالعہ فطرت" کے متعلق مولوی مرزا غلام حسین بیگ صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ الاوہ ٹیتیاں نے فرمایا کہ نیچر اسٹڈی کی تعلیم بہت دلچسپ اور آسان ہے۔ اس میں تمہید کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف مشاہدہ پر مبنی ہے۔ لیکن مشاہدہ کے بعد طلبا سے فرداً فرداً آسان آسان سوالات کے ذریعہ مختلف باتیں اخذ کی جائیں لیکن ہر سوال کے بعد ان کو مشاہدہ کا موقعہ دیا جائے۔ مدرس کو یہ بھی چاہیئے کہ اس چیز کی تصویر تختۂ سیاہ پر کھینچے۔ پھر فرمایا کہ نیچر اسٹڈی کی تعلیم ذریعہ سفر بھی دی جا سکتی ہے۔ اور اس کام کے لئے اچھا موقعہ برسات کے بعد اور فصل کٹنے سے پہلے اور بعد ہے۔

مولوی شیخ امان اللہ صاحب مددگار مدرس مدرسہ تحتانیہ الاوہ ٹیتیاں نے انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ مدرسہ میں ایک قطعہ آراضی باغ کے لئے ہونا چاہیئے اور استاد کی نگرانی میں طلبا سے اس باغ میں کام لینا چاہیئے طلبا کے پاس ایک نوٹ بک ہونی چاہیئے جس میں طلبا تمام واقعات جو مشاہدہ کی مدد سے ان کے سامنے آتے ہیں، درج کریں۔ جوں جوں پودے اُگتے رہیں گے اور طلبا روزانہ مشاہدہ کرتے رہیں گے، ان کو معلوم ہوگا کہ ان میں روزانہ کیا تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔

مولوی نصیرالدین حیدر صاحب اصغر مددگار مدرسہ تحتانیہ یاقوت پورہ نے فرمایا کہ نیچر اسٹڈی میں اسباق ایسی چیزوں پر ہونے چاہئیں، جن کو اصلی حالت میں طلبا کے سامنے پیش کیا جاسکے محض تصویر کے دیکھنے سے ایک طالب علم تمام معلومات حاصل نہیں کرسکتا۔ تصویر سے مدد لی جاسکتی ہے

مولوی سید علی محمدؐ صاحب اجلال مددگار مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ نے فرمایا کہ مدرس کا کام ہے کہ وہ طلبا کے سامنے مختلف اشیاء پیش کرکے طلبا کے حواس خمسہ کو کام میں لائے تاکہ طلبا اس سے کام لے کر مطالعہ قدرت میں ہمہ تن مصروف ہوجائیں۔

مولوی محمدؐ حنیف صاحب بی۔اے مددگار مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ نے فرمایا کہ غور و خوض عجیب و غریب امور کے انکشافات کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا بغور مطالعہ کریں۔ اگر طلبا میں ابتدا ہی سے نیچر اسٹڈی کا شوق پیدا کیا جائے گا تو وہ کل سائنس میں بہت ترقی کرسکیں گے۔

"سائنس کا تعلق روزانہ زندگی سے" کے متعلق مولوی محمدؐ حنیف صاحب مددگار مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ نے فرمایا کہ وہی ملک یا قوم ترقی کرسکتی ہے جو سائنس کے اصولات پر کاربند ہو۔ انگلستان میں زراعت بھی سائنس کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے اس میں ترقی کی ہے، یہ بھی فرمایا کہ ہمارے ہاں کی تمام پیداوار سستے داموں باہر چلی جاتی ہے اور وہاں سائنٹفک اصول کو کام میں لاکر ان کو ہمارے ہاتھ نہایت گراں داموں پر فروخت کیا جاتا ہے۔ اگر ان اصولات سے واقف ہوجائیں تو ہم اپنی خام پیداوار سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ سائنس کے اصول سے ناواقف ہونے کی وجہ سے معمولی سے معمولی چیزیں بھی جن سے ہم کو روزانہ کام پڑتا ہے تیار نہیں کرسکتے۔

مدرسہ وسطانیہ دارالشفاء | ماہ شہریور کا جلسہ بعنوان "تعلیم مطالعہ فطرت معہ سبق نمونہ" جس میں طے پایا کہ بچوں کو تعلیم بذریعہ تمثیل کھیل اور مشاہدہ فطرت دی جائے۔ نیز سورج چاند ستارہ و پھول وغیرہ کو بتلایا جائے۔ سابق میں محض کتابی تعلیم ہوتی تھی جس سے صرف ادبیت میں ترقی ہوتی تھی لیکن وہ مشاہدہ فطرت سے بہت کم مستفید ہوتے تھے۔ اس لئے یہ رائے پاس ہوئی کہ طریقہ تعلیم بذریعہ مشاہدہ فطرت جماعت سے باہر لیجاکر دی جائے۔ تو زیادہ بہتر مفید ثابت ہوگی۔

ماہ مہر و آبان میں بوجہ شیوع مرض طاعون جلسہ نہ ہو سکا۔

روئداد مرکزی انتظامی کمیٹی انجمن اساتذہ کی مرکزی انتظامی کمیٹی کے جلسہ منعقدہ ۱۸ آذر ۱۳۴۰ف میں جو قراردادیں منظور ہوئیں ان کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) یہ کہ مقامی معتمدین سے درخواست کی جائے کہ وہ تمام مدارس کو اطلاع دیدیں کہ پہلی آل ایشیا تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ۲۶ دسمبر ۱۹۳۰ء لغایۃ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء بمقام بنارس ہوگا جو حضرات کہ استقبالی کمیٹی کے رکن بننا چاہیں وہ مسٹر رام نرائن مسر بی اے ہیڈماسٹر سنٹرل ہندو اسکول بنارس سے مراسلت فرمائیں۔ استقبالیہ کمیٹی کی ممبری کی فیس مبلغ (عـ۵ـہ) کلدار ہے۔

(۲) مندرجہ ذیل حضرات آل ایشیا ایجوکیشنل کانفرنس میں انجمن ہذا کی نمائندگی کے لئے نامزد کئے گئے ہیں۔

(۱) مولوی سید ظہور علی صاحب بی اے بی ٹی پرنسپال دارالعلوم بلدہ۔
(۲) مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ
(۳) مولوی سید فخر الحسن صاحب ملابی اے بی ٹی۔ صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ بلدہ
(۴) مولوی عبد النور صاحب صدیقی بی۔اے بی ٹی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ دارالشفاء بلدہ

مولوی سید فخر الحسن و مولوی عبد النور صاحبان کے مصارف سفر وغیرہ کا نصف خود انجمن برداشت کرے گی اور بقیہ نصف کے لئے سرکار سے درخواست کرے گی۔

(۳) آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشن کی کونسل کی ممبری بابتہ ۱۹۳۱ء کے لئے مندرجہ ذیل حضرات منتخب کئے گئے۔

(۱) مولوی سید ظہور علی صاحب بی اے بی ٹی
(۲) مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب)
(۳) مولوی سید فخر الحسن صاحب ملابی اے بی ٹی (علیگ)
(۴) مولوی عبد النور صاحب صدیقی بی اے بی ٹی (علیگ)
(۵) مس اے۔ ای۔ ایم پوپ ایم اے پرنسپال زنانہ کالج نامپلی۔

(۴) آل ایشیا ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ ساتھ آل انڈیا تعلیمی نمائش بھی منعقد ہوگی تفصیل بلاتا

صدر مہتمم صاحب تعلیمات بلدہ شائع فرمائیں گے۔

(۵) مبلغ (۱۰۰) سکۂ مد محفوظ سے انجمن کے کتب خانہ کے لئے منظور کئے گئے اور کتب خانہ کی نگرانی واہتمام کے لئے حسب ذیل حضرات کی کمیٹی قائم کی گئی۔

(۱) مولوی سید ظہور علی صاحب بی اے بی ٹی۔

(۲) مسٹر چندوارکر ایم اے۔

(۳) مولوی سید فخرالحسن صاحب بی اے بی ٹی۔

(۶) ذیل میں ان زائد ارکان اور عہدہ داروں کی فہرست ہے جو ۱۳۴۰ف کے لئے منتخب کئے گئے

(الف) مولوی سید معین الدین ایم اے صدر مدرس مدرسہ آصفیہ اور فادر اسٹیفانی رکٹر آل سینٹس اسکول کو میر مجلس صاحب نے حسب دفعہ (۸) ب مرکزی انتظامی کمیٹی کا رکن نامزد فرمایا۔

(ب) مسٹر جی سندرم بی اے پرنسپال میتھوڈسٹ بوئز ہائی اسکول اور مسٹر تجمل حسین بی اے بی ٹی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ کاچی گوڑہ مرکزی انتظامی کمیٹی کے رکن حسب دفعہ (۸ ح) منتخب کئے گئے

(ج) نائبین میر مجلس۔

(۱) مسٹر سید ظہور علی بی اے بی ٹی۔

(۲) ریوانڈ ایف سی فلپس ایم اے وارڈن سینٹ جارجز گرامر اسکول۔

تختہ آمد خرچ انجمن اساتذہ بابتہ ۱۳۳۹ف

جمع	رقم	خرچ	رقم
سلک ۱۳۳۸ف	[illegible]	مصارف صادر سالتمام	[illegible]
آمدنی چندہ معمولی ۱۳۳۹ف	[illegible]	الونس چپراسیاں واہلکاران	[illegible]
آمدنی فیس نمائش تعلیمی ۱۳۳۹ف	[illegible]	امداد رسالہ	[illegible]
آمدنی قیمت فروخت روئداد کانفرنس اول	[illegible]	مصارف نمائندگان آل انڈیا کانفرنس منعقدہ مدراس	[illegible]
جملہ میزان	[illegible]	اخراجات کانفرنس و مجالس تعلیمی ۱۳۳۹ف	[illegible]
		میزان ([illegible]) سلک ختم آبان ۱۳۳۹ف	[illegible]
		جملہ میزان	[illegible]

جلسہ تقسیم اسناد مدرسہ تحتانیہ نسواں یادگیر | بتاریخ ۹ آذر ۱۳۴۰ف روز دوشنبہ سہ پہر سے مغرب تک مدرسہ تحتانیہ اُردو تعلقہ یادگیر کا جلسہ تقسیم اسناد زیر صدارت مسز ابو احمد صاحب بی اے بی ٹی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ تاریخ یادگیر میں اس نوعیت کا یہ پہلا جلسہ ہے۔ مدرسہ رنگ برنگ کے پھریروں اور مصنوعی کمانوں وغیرہ سے آراستہ کیا گیا تھا۔ مدرسہ کی تزئین کا تمام کام طالبات نے اپنے ہاتھوں سے انجام دیا تھا۔

جناب تحصیلدار صاحب تعلقہ یادگیر کی بیگم صاحبہ اور دیگر معزز خواتین اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والی بیگمات اور ساہوکاروں کی بیویاں سب جلسہ میں مدعو تھیں علاوہ ازیں تماشائیوں کے ہجوم سے مدرسہ میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔

کارروائی جلسہ کا آغاز حمد و نعت اور ترانۂ سلامتی اعلیحضرت حضور پرنور خلد اللہ ملکہٗ سے کیا گیا۔ اس کے بعد مدرسہ کی طالبات نے ایک دلچسپ مکالمہ کیا اور چند اشعار پڑھے۔ اس کے سوا دوسری طالبات نے بھی اخلاقی نظمیں خوش آوازی سے پڑھیں۔ آخر میں جناب صدر معلمہ صاحبہ نے ایک نصیحت خیز تقریر فرمائی۔ اور صدر جلسہ کو (جن کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے) پھولوں کے ہار پہنائے اور مبارک باد دی۔ اس کے بعد صاحبہ موصوفہ نے مولوی عبدالسلام صاحب ذکی کا ایک مضمون پڑھا جو نہایت سبق آموز تھا سب سے آخر میں صدر جلسہ نے جلسہ کی کامیابی پر جناب صدر معلمہ صاحبہ کو مبارک باد دی۔ اور اسناد تقسیم فرمائے۔ اور طالبات کے لئے پانچ روپیہ بغرض شیرینی عطا فرمائے۔ جلسہ کی کامیابی اور مدرسہ کا حسن انتظام اور تعلیم کے بہترین نتائج جناب صدر معلمہ صاحبہ کی مخلصانہ مساعی کا نتیجہ ہیں۔

مدرسہ وسطانیہ دیگلور کا سالانہ جلسہ | بتاریخ ۲۰ و ۲۱ آبان ۱۳۳۹ف دو دنوں پر منقسم تھا روز اول ۳ بجے دن سے اسپورٹس کا پروگرام تھا۔ اس لئے ٹھیک وقت پر کھیل شروع ہوئے۔ باقاعدہ طور پر کھیل ہوتے رہے مدرسہ کا تمام میدان مہمانوں سے اور تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ۶ بجے شام کو کھیل کا اختتام ہوا روز دیگر ۲۱ آبان ۱۳۳۹ف دوسرے پروگرام کا آغاز بہ صدارت عالی جناب مولوی شجاع الدین عباس طیب جی

صاحب دوم تعلقدار ڈویژن دیگلور ہوا۔" لڑکوں میں تعلیم کا اثر" اردو مکالمہ" مکان اور تیاری اسباق" مرہٹی ڈرامہ ہوا تقریر بر وٹس بزبان انگریزی عبدالجبار خاں متعلم تھرڈ فارم نے کی۔ اوینٹمارک انٹنی کی تقریر بزبان انگریزی یورپی لباس میں ملبوس ہو کر عبدالعزیز قریشی متعلم تھرڈ فارم نے کی۔ اسناد اور (۱۵۰) انعامات طلباء کو بدست صدر نشین صاحب تقسیم کئے گئے عالی جناب مسٹر بابو سنگھ صاحب بی اے۔ صدر مدرس مدرسہ نے مدرسہ سے متعلق ایک رپورٹ پڑھی۔ جو نہایت مؤثر تھی جس کے اختتام پر اعلیٰحضرت والا حشمت دارا شوکت سلطان العلوم نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ کی ترقی عمر و اقبال و جاہ و جلال و شہزادگانِ بلند اقبال و شہزادیانِ فرخندہ فال کے ازدیادِ عمر و اقبال کے لئے بارگاہِ ربّ العزت میں نہایت ادب کے ساتھ دعا مانگی گئی

جلسہ تقسیم انعامات مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ جالنہ مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ جالنہ کے اس سال کے نتائج امتحانات جس قدر شاندار رہے ہیں اسی شان و شوکت کے ساتھ بتاریخ ۱۳ و ۱۴ آبان ۲۹ ف مدرسہ کی جانب سے جلسہ تقسیم انعامات ترتیب دیا گیا تھا مدرسہ کی تاریخ میں یہ پہلا سال تھا کہ بہ مقابل سالہائے ماسبق بجائے بیس و تیس فیصدی کے نتائج امتحانات نوے فیصدی رہے۔ اس پر منجانب مدرسہ جس قدر بھی خوشی کا اظہار کیا جاتا بجا تھا۔ صدارت کے لئے اورنگ آباد سے جناب مولوی احمد حسین خاں صاحب صدر مہتمم تعلیمات کو مدعو کیا گیا تھا۔ مصارف کا سوال طلبہ کے والدین اور معززین مقامی کی فیاضی سے نے حل کر دیا۔ مدرسہ کی عمارت میں کوئی بڑا ہال نہ ہونے کی وجہ سے ۱۳ آبان کے شب کے جلسہ کے لئے مقامی سینما ہال مستعار لینا پڑا۔ پورا ہال طلبہ کے سرپرستوں، عہدہ داران مقامی اور معززین شہر سے پر ہو گیا تھا اور حاضرین کی تعداد سات سو سے متجاوز تھی۔ طلباء مدرسہ نے دو مختصر لیکن نہایت دلچسپ اُردو اور مرہٹی ڈرامے حاضرین کے سامنے انجام دئے۔ خوش الحانی، نظم خوانی، انگریزی مکالموں اور ترانہ جات نے جلسہ کی دلچسپی میں بے حد اضافہ کر دیا تھا۔ اس شب کا جلسہ تقریباً بارہ بجے نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ دوسرے روز کا پروگرام مدرسہ کے وسیع احاطہ میں ترتیب دیا گیا تھا جہاں قدرت نے گزشتہ ہفتہ کی کثیر بارش کے ذریعہ ایک زمردیں فرش بچھا دیا تھا۔ تین بجے سے اسپورٹس اور ورزش جسمانی کے مختلف کرتبوں میں طلبہ کا مقابلہ ہوتا رہا۔ اسکوٹس نے بھی اپنے مشاغل اور اپنی تربیت کا نمونہ نہایت کامیابی کے

ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیا۔ حاضرین کی میدان میں فواکہہ اور چاء سے نہایت سلیقہ کے ساتھ تواضع کی گئی۔ بعد نماز مغرب سب لوگ مدرسہ کے وسطی ہال میں جمع ہوئے جو تصاویر پھریروں اور پھولوں وغیرہ سے سجایا گیا تھا۔ مولوی غلام طاہر صاحب مددگار مدرسہ نے "ہماری زندگی" پر ایک بلیغ مضمون پڑھ کر سنایا اس کے بعد مولوی سالم بن سعید صاحب صدر مدرس مدرسہ نے ایک مختصر مگر جامع رپورٹ میں مدرسہ کی سال بھر کی تعلیمی اور کھیلوں کی کارگزاری پیش کی جس میں اس سال کا میٹرک کا شاندار نتیجہ اور تجارتی کی جماعت کا افتتاح قابل ذکر چیزیں تھیں۔

سالگرہ مدرسۂ فوقانیہ عثمانیہ بیدر شریف بصدارت جناب مولوی سید حسین صاحب بی اے بی ٹی صدر مہتمم تعلیمات گلبرگہ ۲۱ آذر ۱۳۴۸ف روز جمعہ ٹھیک دن کے چار بجے جلسہ سالگرہ کی کارروائی عملی جامہ میں نہایت آب و تاب کے ساتھ جلوہ آرا ہوئی مدرسہ کا کمپونڈ پھریروں اور رنگین بیرقوں سے نہایت حسن سلیقہ کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ مدرسہ کے وسیع ہال مختلف آرائشوں اور متعدد زیبائشوں سے سجے سجائے تھے۔ طلبہ کے تیار کردہ جغرافیہ کے نقشے جابجا آویزاں تھے اور ڈرائنگ کی تصاویر جس سے ناظرین کو ایک لطف خیز استعجاب ہوتا تھا۔ علاوہ اس کے بچوں کے دستی مشاغل کے نمونے اور خوش رنگ نفیس مٹی کے کھلونے حسن ترتیب کے ساتھ میزوں پر سجائے گئے تھے۔

قرأت و نظم خوانی کے بعد مولوی شاہ اسمٰعیل صاحب قادری مددگار مدرسہ نے مدرسہ کی تفصیلی رپورٹ انجمن اساتذہ کی جانب سے حاضرین جلسہ کو پڑھ کر سنائی جو جناب صدر مدرس صاحب کے ایک سال کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اختتام رپورٹ کے بعد جناب وفا صاحب نے ایک پُرزور نظم سے سامعین کو مسرور و محظوظ فرمایا۔ اختتام کارروائی تک بہت وقت منقضی ہو چکا تھا۔ نماز مغرب کا وقت قریب تھا بوجہ ضیق وقت جناب صدر نشین صاحب نے مختصر، جامع، مفید و معنی خیز تقریر فرمائی جس کے لفظ لفظ سے اظہار تحسین و خوشنودی اور حوصلہ افزائی مترشح ہے۔

تقریر صدارت کے اختتام پر جناب وفا نے مدرسہ کی جانب سے معزز مہمانوں کا جن کی تعداد قریباً سات سو تھی شکریہ ادا کیا۔ منجملہ حکام مقامی عالیجناب نواب ظہیر یار جنگ بہادر اول تعلقدار ضلع بیدر اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں جن کے الطاف کریمانہ کا مدرسہ ہمیشہ ممنون ہے

نیز نواب عباس حسین خان صاحب بزم ناظم عدالت ضلع بیدر قابل تشکر ہیں کہ ان کی رونق افروزی مدرسہ کے تعلیمی جلسوں کے لئے سرمایۂ ناز ہے۔ عالی جناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات کے دستِ مبارک سے بیش قیمت انعامات ان طلبہ کو تقسیم کئے گئے جن کے نتائج ذہنی اور جسمانی تعلیم کے معیار سے بہترین ثابت ہوئے حاضرین کی شیرینی و نمکنہ اور چائے سے مدارات کی گئی۔ اور یہ شاندار جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ اعلیحضرت سلطان العلوم بندگانعالی متعالی مدظلہم العالی اور شہزادگان بلند اقبال کی دعا ترقی عمر و اقبال پر ختم ہوا۔

اسی تقریب کے سلسلہ میں ۱۴ آذر سنہ ۱۳۴۱ف شب کے ۸½ بجے سکوٹ بائز کا شاندار کیمپ فائر بصدارت عالی جناب صدر مہتمم صاحب بالقابہ وقوع پزیر ہوا۔ حاضرین کی ایک کثیر تعداد میں حکام مقام کی رونق افروزی کے علاوہ معززین و وکلاء تشریف لائے تھے۔ سکوٹ بائز نے دو گھنٹے تک اپنے عملی کام کے جوہر شائستہ طور پر دکھائے۔ مثلاً مشتعل زدہ مقام کی حفاظت اور مجروحین کی فوری امداد۔ مختلف ورزشی کرتب وغیرہ اور نیز ظرافت آمیز مکالمے ڈرامے طلبہ نے نہایت تہذیب و شائستگی سے عملی اسٹیج پر پیش کئے جن سے حاضرین بیحد متاثر و محظوظ ہوئے اور جناب صدر ممدوح نے اختتام کیمپ فائر پر طلبیہ اطفال کے متعلق پر موعظت تقریر فرمائی۔ اور ان کے عملی کاموں کے متعلق کمال جوشِ مسرت کے ساتھ تحسین وخوشنودی کا اظہار فرمایا اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اکثر کیمپ فائر دیکھنے کا اتفاق ہوا لیکن اس کیمپ فائر میں جو ذہانت اور جدت پائی گئی وہ کہیں نہیں دیکھی۔

ذیل میں وفا صاحب کی نظم کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جس کو پڑھ کر شاید جنم جلے مدرسین کے جلے پھپھولے پھوٹ جائیں۔

نہیں منظور مجھ کو آج کچھ دادِ سخندانی — یہ اظہارِ حقیقت ہے یا انداز غزلخوانی

طلبیوں اور اُستادوں کا یکساں کام ہے لیکن — وہ جسمانی اطبا ہیں تو یہ حذاقِ روحانی

صلاحِ جسم ہے موقوف تشخیصِ اطبا پر — ہے تعلیمِ معلم پر فلاحِ روحِ انسانی

فضیلت روح کو اس پیکرِ خاکی پہ حاصل ہے — وہ جوہر یہ عرض ٹھیرا وہ نورانی یہ ظلمانی

صلہ اُن کا ہے ناممکن عوض ان کا ہے ناممکن — یہی ذاتیں ہیں وقفِ خدمتِ مخلوقِ ربانی

بڑی مشکل سے سر کرتے ہیں میدانِ عمل دونوں — ملامت کے برس پڑتے ہیں سر پہ تیر بارانی

وہ بیماروں کے ہاتھوں میں تو یہ نادان بچوں کے — اُدھر بھی ہے پریشانی اِدھر بھی ہے پریشانی

جو سچ پوچھو معلم سے طبیب اچھے ہیں قسمت کے — بگڑتا ہے جو کام ان کا تو بنتا ہے بآسانی
نہ ہو بیمار اگر جینگا تو پھر قسمت کے شکوے ہیں — اسی حیلے سے مِٹ جاتی ہے کچھ اُن کی پشیمانی
اگر بیمار مر جائے تو یہ ارشاد ہوتا ہے — قضا کے سامنے چلتی نہیں تدبیر انسانی
بڑی مشکل جو پڑتی ہے معلم ہی کو پڑتی ہے — بحقِ حضرتِ مشکل کشا یا رب ہو آسانی
ہے مرگِ ناگہاں کا پیش خیمہ امتحان کیا ہے — کہ جس کے نام سے ہے شہ سواروں کا جگر پانی
سلامت آج کل اُستاد کی ہے اس میں اُستادی — کہ شاگردان کے وقتِ امتحاں دیں داد لسانی
کبھی نسیاں کے غلبہ سے کبھی کچھ رعب و دہشت سے — غلط پڑھ دے غلط لکھ دے پشیمانی پشیمانی
معلم کی کچھ ایسی گت بنی توبہ معاذ اللہ — غضب کی گر پڑی بجلی اُمیدوں پر پھرا پانی
نہ کوئی عذر اُس کا قابلِ تسلیم ٹھیرا ہے — لگا الزام غفلت کا اور اُس پر جرم نادانی
"ہوئی برباد محنت اور گنہ لازم" مثل ٹھیری — عجب یہ انقلاب دور ہے اے چرخ گردانی
مدرس بن کے یوں مثل وفا کوئی نہ پچھتائے — چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

فرسٹ ایشیا ایجوکیشنل کانفرنس آل ایشیا تعلیمی کانفرنس کا پہلا اجلاس بمقام بنارس بتواریخ ۲۶ تا ۳۰ دسمبر سنہ ۳۰ء منعقد ہوگا۔ کانفرنس کی کارروائی (۱۴) مختلف گروپوں (شعبوں) میں تقسیم ہوگی اور ہر شعبہ کا معتمد الگ ہوگا۔

شعبہ (۱) صحت و حفظان صحت اور تعلیم جسمانی۔
معتمد رام نرائن مسرا بی اے ہیڈ ماسٹر سنٹرل ہندو ہائی اسکول بنارس۔

(۲) بے علمی۔ معتمد گردیبوک اُو پادھیائے بی اے مددگار سکریٹری انجمن ہائے اتحادی صوبہ آگرہ و اودھ۔ لکھنؤ۔

(۳) تعلیم بالغاں۔ معتمد ایس کے یگنا نارائن ایم اے۔ ۱۰ کوئل اسٹریٹ میلاپور مدراس۔

(۴) کتب خانہ معتمد ایس آر رنگنا تھن ایم اے۔ مہتمم کتب خانہ جامعہ مدراس۔

(۵) کنڈرگارٹن اور مانٹی سوری طریقہ تعلیم۔
معتمد کالی داس کپور ایم اے ایل ٹی ہیڈ ماسٹر کالی چرن ہائی اسکول لکھنؤ۔

(۶) تعلیم دیہی۔ معتمد کے ایس وکیل ایم اے ایڈ مہتمم تعلیمات حلقہ جنوبی۔ دھرواڑ۔

(۷) تعلیم کردار و اخلاقیات و دینیات۔
معتمد جی این گوکھلے بی ایس سی ایل سی ای۔ پرنسپال سیول انجینرنگ کالج کراچی۔
(۸) اتحاد اولیاء طلبہ معتمد آر کے کلکارنی ایم اے پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار۔
(۹) انجمن ہائے اساتذہ معتمد ڈی پی کھتری بی اے ایل ٹی ہیڈ ماسٹر پنڈت پرتھی ناتھ ہائی اسکول کانپور
(۱۰) تعلیم المعلمین معتمد ایس ایس چترویدی ایم اے ڈپلوما ایجوکیشن زائد مددگار ناظم تعلیمات صوبہ آگرہ و اودھ۔ الہ آباد۔
(۱۱) تحتانی تعلیم معتمد اُداین شر گھابی اے ایل ٹی مددگار مہتمم تعلیمات قسمت جھانسی۔
(۱۲) ثانوی تعلیم معتمد ایم آر پارنجپے ایم اے بی ایس سی نیو نارائن پیٹھ پونا۔
(۱۳) تعلیم جامعہ معتمد پی سیتاوری ایم اے پرنسپال سناتن دھرم کالج کانپور۔
(۱۴) تعلیم نسوان معتمد مسز مارگیرٹ کوزنس بی میوزک بینتیمین کالج۔ اگمور۔ مدراس۔

یہ کانفرنس اتحاد انجمن ہائے تعلیم عالم کی زیر پرستی اور آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ہوگی۔

بے علمی پر یورش (روس میں) روسی حکومت کو پوری توقع ہے کہ وہ ۱۹۳۵ء تک اپنی ۵ اکروڑکی آبادی میں بے علمی کا قلع قمع کر دے گی۔ روس میں جبری تعلیم کا جو نیا قانون نافذ ہوا ہے اس کے متعلق ازوِسٹیا کی رائے ہے کہ روس نے جس سرعت کے ساتھ بے علمی کو گھٹایا ہے اس کی نظیر دنیا کا کوئی ملک پیش نہیں کرسکتا۔ اب کوئی روس کی بربریت، پس افتادگی اور جہالت کا نام نہیں لے سکتا۔ جنگ عظیم کے قبل روس کی دو تہائی آبادی ناخواندہ تھی۔ گذشتہ دو سال میں ایک کروڑ تیس لاکھ ان پڑھ سیانوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھایا گیا۔

(چین میں) نانکن کی قومی تعلیمی کانفرنس نے ایک پروگرام مرتب کیا ہے جس کے ذریعہ چین کے ان پڑھ سیانوں کی تعداد چھ سال میں صفر رہ جائے گی۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ چین کی تقریباً ۴۰ کروڑ کی آبادی میں سے تخمیناً ۸۰ فیصدی لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ اب ملک بھر میں اجتماعی تعلیم والے مدارس کھولے جائیں گے اور ساتھ ساتھ گھروں، گوداموں اور کارخانوں، فوجوں، جیلخانوں اور دوسرے اداروں میں لکھنے پڑھنے کی جماعتیں کھولی جائیں گی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس چھ سالہ بزرآزمائی کے لئے

ایک لاکھ تیس ہزار مدرسین، ایک لاکھ سولہ ہزار چار سو ستر مدارس اور اٹھائیس کروڑ بتیس لاکھ ڈالر یعنی کچھ اوپر پچھتر کروڑ روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ یہ تحریک جبری نوعیت کی ہوگی غرہ جولائی کو مرکزی حکومت نے ایک فرمان جاری کیا تھا جس کی رو سے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ۱۹۳۵ء کے آخر تک ہر چینی ہزار حرفی رسالے پڑھ لے۔ اس کے بعد کسی حکومت یا مدارس یا کارخانہ یا گودام کسی ایسے شخص کو ملازم رکھنے کے مجاز نہ ہوں گے جو اٹھارہ سال سے اوپر ہو لیکن لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔

(حیدر آباد دکن) حیدر آباد میں کچھ عرصہ ہوا مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ نے جبری تعلیم کی سلسلہ جنبانی کی تھی سررشتہ تعلیمات کی طرف سے صاحب موصوف ریاست میسور میں جبری تعلیم کے طریقۂ عمل کے مطالعہ کے لئے روانہ کئے گئے تھے اور واپسی پر آپ نے ایک جامع رپورٹ مرتب فرمائی اور اسکیم پیش فرمائی لیکن ابھی تک اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا لیکن صاحب مکرم کی تقریروں اور تحریروں نے بہت سے دلوں کو گرما دیا جن میں سے ایک ہمارے لائق دوست مولوی احمد سعدی صاحب نظامی ہیں جن کے سینہ میں ملک و قوم کی ہمدردی کی آگ بھڑک رہی ہے چنانچہ آپ کے زیر اہتمام کئی مدارس ہیں جن میں اچھوت اقوام کو تعلیم دی جاتی ہے سعدی صاحب کا خیال ہے کہ ملک سے ناخواندگی اور بے علمی دور کرنے کے لئے چند باتیں بہت ضروری ہیں۔

(۱) جرائم پیشہ اقوام کو تعلیم دینے میں سبقت کی جائے۔

(۲) ان کے نصاب میں ایک آدھ ایسی کتاب ضرور شریک رہے جو انھیں اپنے آبائی پیشہ کو ترقی دینے میں مفید معلومات بہم پہونچا سکے۔

(۳) ان کو عام تعلیم کے ساتھ فنی تعلیم بھی دی جائے۔

اگر مجوزہ طریقہ پر ان اقوام کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تو یقین دلایا جاتا ہے کہ جبری تعلیم کی کوئی اسکیم نہایت آسانی اور عمدگی سے کامیاب ہوگی۔

احمد سعدی صاحب کے زیر اہتمام جو مدارس ہیں ان کی فہرست یہ ہے۔

(۱) تحتانیہ سعدیہ برائے طبقہ فاکروبان سلطان شاہی
(۲) " " پارڈیاں شکر گنج
(۳) " " فاکروبان پٹیلہ برج

(۴) تحتانیہ سعدیہ طبقہ پارڈیاں بل قدیم

ان کے علاوہ دوسری اقوام کے لئے تین مدرسے تلنگی کے ایک اُردو کا ہے۔ اس چھوٹے سے پیمانے پر ملک کا ایک سپوت یکہ و تنہا بے علمی سے سرگرم پیکار ہے لیکن نہ تہی مائگی اس کا دم توڑتی ہے نہ لوگوں کا تمسخر اس کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کرتا ہے۔ اور ایک جفاکش و گمنام مزدور کی طرح نیو کی گہرائیوں میں سنگریزوں اور کنکروں کو کوٹ کوٹ کر جمارہا ہے اور انہیں ناچیز سنگریزوں کے اوپر تعلیم عامہ کی شاندار و مستحکم عمارت کھڑی ہوگی۔

رپورٹ انجمن ترقی تعلیم نسواں حیدرآباد دکن

انجمن ترقی تعلیم نسواں کی رپورٹ برائے سال تمام سنہ ۲۹-۱۳۲۸ء ہمیں وصول ہوئی ہے جس کے لئے ہم انجمن کی لائق اعزازی معتمد مسز حسین علی خان کے رہین منت ہیں۔ رپورٹ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن مذکورہ نے اپنی زندگی کے تین سال بیگم صاحبہ ولی الدولہ بہادر کی زیر صدارت نہایت اطمینان بخش طریقہ پر ختم کئے۔ اس قلیل عرصہ میں انجمن نے تعلیم نسواں کو ترقی دینے کی بیحد کوشش کی۔ ۱۰ مارچ سنہ ۳۰ء کے جلسہ میں مسز ٹاسکر نے اپنا نہایت قابل قدر گھریلو تعلیم کا اسکیم پیش کیا جس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں۔

(۱) ایسی لڑکیوں کی تعلیم جن کے نجی حالات شرکت مدرسہ میں مانع ہیں۔

(۲) ایسی لڑکیوں کی تعلیم جن کو صغیر سنی میں شادی ہوجانے کی وجہ سے تعلیم چھوڑنی پڑی

(۳) سیانی عورتوں کی تعلیم۔

صحت افزا امکنہ مدارس کی اسکیم بھی انجمن کے زیر غور ہے مسز رستم جی فریدونجی کی صدارت میں ایک ذیلی کمیٹی قائم کی گئی تھی۔ اور ذیلی دفعات کے تحت ایک انجمن بنام انجمن اتحاد ممالک محروسہ سرکار عالی رجسٹر کرائی گئی ہے۔ اس انجمن کے بیس ہزار حصص بحساب (صہ) سکہ ع فی حصہ ہوں گے۔ پہلی عمارت خیرت آباد میں شروع ہوگی، سنگ بنیاد رکھا جاچکا ہے۔

انجمن مذکورہ کا مدرسہ نمبر ا بیجر نائیڈو کے بنگلہ میں تاہنوز قائم ہے لیکن کوشش ہورہی ہے کہ کوئی بہتر مکان دستیاب ہوجائے

جملہ تعداد ارکان (۲۷۵) ہے جو حیدرآباد کی آبادی کے لحاظ سے قطعی حوصلہ فرسا ہے۔

خطبہ صدارت جناب بیگم صاحبہ نواب مکرم الدولہ بہادر۔

انجمن ترقی تعلیم نسواں کی چوتھی سالانہ کانفرنس ۲۱ نومبر ۱۹۳۲ء کو منعقد ہوئی تھی اس کانفرنس میں جناب بیگم صاحبہ نواب مکرم الدولہ بہادر نے جو فاضلانہ اور پرمغز خطبہ صدارت پڑھا تھا اس کا جستہ جستہ اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے صاحبہ موصوفہ نے فرمایا :-

"آج کل میں دیکھتی ہوں کہ عام طور پر کیا لڑکوں کیا لڑکیوں کیلئے بالکل مغربی کی وضع کی اور نامانوس تعلیم کے رجحانات بڑھتے جارہے ہیں اور جس طرح دوسری چیزوں میں اپنے خاص حالات کا لحاظ کئے بغیر یورپ کی کورانہ تقلید کا شوق نظر آتا ہے تعلیم میں بھی یہی رجحان زیادہ معلوم ہوتا ہے یہ ظاہر بات ہے کہ مردوں اور عورتوں کے فرائض زندگی ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں مردوں کو جو تعلیم دی جانی چاہیئے وہ ان کی ضروریات اور حالات کے موافق ہو اور عورتوں کو جس قسم کی تعلیم و تربیت ہونی چاہیئے اس کا اُن کی خاص ضروریات اور فرائض زندگی کے موافق ہونا ضروری ہے ہمیں شرقیت و نسوانیت دونوں کو پیش نظر رکھ کر عورتوں کے لئے ایسی تعلیم کا اہتمام کرنا چاہیئے جو ایک طرف اُن کو اچھی بیویاں اور اچھی مائیں بنائے تو دوسری طرف اُن کے اپنے ماحول کے مُطابق اور مشرقی خصوصیات کے ساتھ انہیں نہ صرف ایک ترقی یافتہ طبقہ میں بدل دے بلکہ قومی زندگی میں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک اور ذمہ داریوں میں ہم دوش ہونے کی اہل بنادے۔

عورتوں کا نصاب تعلیم ہرگز اس کی نقل نہ ہونا چاہیئے جو مردوں کے لئے ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے تعلیم نصاب میں تفریق سے یہ مراد نہیں ہے کہ لڑکیوں کو اُن تمام علوم سے محروم رکھا جائے جن کے دروازے لڑکوں پر کھلے ہوئے ہیں بلکہ کالجوں اور فوقانیہ مدرسوں میں صرف تھوڑے سے فرق کے ساتھ علمی تعلیم کا نصاب وہی ہونا چاہیئے جو لڑکوں کے لئے ہے۔ البتہ عام نصاب تعلیم جس کا تعلق کسی جامعہ سے نہیں، بالکل ایسا ہونا ضروری ہے جو ہماری تہذیب و روایات کے بموجب بھی ہو اور جس کی تکمیل سے عام طبقہ اُناث اپنے فرائض زندگی کو زیادہ خوش اسلوبی سے انجام دے سکے اور نصاب میں متعدد مفید مضامین جیسے فنون لطیفہ، پکوان، سلائی سوزن کاری حفظان صحت، طبی امداد، تیمارداری وغیرہ داخل کئے جاسکتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ کچھ پیشہ ورانہ رجحان بھی پیدا کیا جاسکتا ہے اور کار چوب کو رسازی، کروشیا، پارچہ بافی سکھائے جاسکتے ہیں ہماری علم پرور سرکار تعلیم نسواں کی طرف سے غافل نہیں اور اس کی طرف سے اس خصوص میں قابل لحاظ کام

ہو رہا ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ موجودہ رفتار سے ہماری ترقی اس قدر دشوار ہے کہ ہم صدیوں میں جا کر اس درجے کو پہنچیں گے جہاں آج ترقی یافتہ ملکوں کی عورتیں فائز ہیں تعلیم نسواں کا دائرہ وسیع ہونا نہایت ضروری ہے اور اس کی واحد صورت لڑکیوں کے لئے کم از کم چار سالہ جبریہ تعلیم کا تدریجی نفاذ ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ پختہ عمر عورتوں کو جو یا تو سرے سے ان پڑھ ہیں یا بچپن میں چند سال تعلیم پائی تھیں جہالت سے نکال لینے اور ان کی خواندگی کو برقرار رکھنے کے لئے باقاعدہ انتظام ہونا چاہیئے۔

تعلیم کے بارے میں حیدرآباد کے طبقہ خواتین کی پس اُفتادگی مسلمہ ہے۔ ہمارے ملک میں بھی عورتوں کے لئے کئی طرح کی تعلیمی سہولتوں کی ضرورت ہے اور ہمارا طبقہ اپنی موجودہ پس اُفتادگی کی وجہ سے ہر طرح کی رعایت کا مستحق ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ متوسط اور کم معاش خاندانوں میں تعلیم نسواں کی نشر و اشاعت میں ایک بڑی رکاوٹ اخراجات تعلیمی کی کمی ہے اگر ان کا بوجھ کسی قدر ہلکا کر دیا جائے تو میں توقع کرتی ہوں کہ تعلیم نسواں کی خاطر خواہ ترقی ہونے لگے گی۔

اس سلسلہ میں ہمیں یہ بھی درخواست لازمی طور پر کرنی پڑے گی کہ نہ صرف طالبات کی فیس معاف کر دی جائے بلکہ ان میں ذہین اور ہونہار لڑکیوں کو فراغ دلی کے ساتھ ایک خاص اسکیم کے تحت وظائف تعلیمی بھی عطا کئے جائیں تاکہ یہ غریب بہ طیب خاطر حصول تعلیم میں چند سال کوشاں رہیں۔ اچھی تعلیم کے لئے جہاں اور کئی باتوں کی ضرورت ہے پڑھانے والے کا بہ ہمہ صفت متصف ہونا بھی ضروری ہے۔ موجودہ مدارس نسواں میں جو استانیاں مامور ہیں وہ بہت کم تعلیم و تربیت یافتہ ہیں اور پڑھنے والی لڑکیوں کی ہر طرح کی ترقی اور فلاح میں کافی مدد پہنچانے کی قابل نہیں ہیں۔ اُستانیاں ایسی نیک صفات شفیق اور لڑکیوں کی ہر طرح نگران ہونی چاہئیں جیسی کہ مائیں ہوتی ہیں تاکہ اُن کی تعلیمی، اخلاقی، جسمانی اور ذہنی ہر طرح کی درستی و شائستگی میں روز بروز اضافہ ہو۔

عام طور پر ہمارے ملک میں طلبہ کی صحت اتنی اچھی نہیں ہوتی جتنی کہ دوسرے ملکوں کے طلبہ کی صحت سُنی جاتی ہے اور خصوصاً عورتیں جن کی دنیا محدود ہوتی ہے اور جو اکثر کھلی ہوا سے محروم رہتی ہیں صحت کے معاملے میں بہت ہی کمزور ہیں۔ مدارس نسواں میں ہم اس کی طرف خاص توجہ کر سکتے ہیں۔ ایسی صحت بخش ورزشیں جو عورتوں کے لئے آسانی سے ممکن ہیں مدارس نسواں میں رائج کی جائیں

اور تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی ترقی اور صحت کا لحاظ پیش نظر رکھا جائے اور باضابطہ طبی معائنہ وقتاً فوقتاً لازمی کر دیا جائے تو اس سے بہت ہی اچھے نتیجے برآمد ہوں گے اور آئندہ ہم ایسی نسلیں دیکھ سکیں گی جو ہر حیثیت سے ہم سے بہتر ہوں گی۔

تعلیم نسواں کے سلسلہ میں خیال ہو سکتا ہے کہ پردے کی نسبت بھی خیالات کا اظہار نہایت ضروری ہے۔ یہ مسئلہ آج کل ہر چھوٹے بڑے کے زیر غور ہے اور اس کی نسبت ہر طرح کی خیال آرائی اور عمل پیرائی ہو رہی ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ پردے کی وجہ سے طبقۂ خواتین کی ترقی میں ایک گونہ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی میری نظر میں یہ اتنی خراب چیز نہیں کہ فی الفور اسے نکال پھینکا جائے۔ جو لوگ پردے کے مخالف ہیں وہ اکثر ایسی غلط کارانہ کوششیں کرتے رہتے ہیں جو بجائے اس کے کہ عام لوگوں پر اچھا اثر ڈالیں اُن کے طریقہ ہی کو بُرا ثابت کرنے والی ہوتی ہیں اس بارے میں جو بھی قدم اُٹھایا جائے وہ سوچ بچار کر اور بڑی احتیاط کے ساتھ ہو تا کہ نہ لوگوں کے مذہبی احساسات کے خلاف کوئی بات ہو اور نہ ایسی کوششیں بے مطلب اور مضحکہ خیز ہو کر رہ جائیں۔"

نواب رستم جنگ بہادر کا گرانقدر عطیہ نواب رستم جنگ بہادر ناظم کروڑگیری نے انجمن اساتذہ بلدہ کے کتب خانہ کو انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کا مکمل سٹ عطا فرمایا جس سے صاحب موصوف کی تعلیمی شغف و دلچسپی کا ثبوت ملتا ہے ہمیں اُمید ہے کہ صاحب موصوف کی فیاضی دوسرے حضرات کے لئے نمونہ بنے گی۔

تنقید و تبصرہ

خونابۂ دل۔ یہ ایک چھوٹا سا تین نظموں کا مجموعہ ہے لکھنؤ کے مایۂ ناز شاعر سراج الحسن صاحب سراج نے اپنے لخت جگر کی ابدی جدائی سے مضطرب ہو کر لکھی ہیں۔ پہلی نظم مسدس کی صورت میں ہے اور اس کا عنوان بچے کی یاد ہے۔ اس کا حرف حرف غم و درد میں ڈوبا ہوا ہے اور ایک نقطہ نشتر کی طرح دل میں چبھتا ہے۔ بس سراج نے اپنا کلیجہ نکال کر کاغذ پر رکھ دیا ہے۔ دوسری نظم ہندی کی طویل بحر میں شاعر کے اندرونی ہیجان اور کشمکش جذبات کا پتہ دیتی ہے۔ اس کی سرخی "حیات کی نجی" ہے۔ آخر میں "صبر جمیل" نے بے تابی پر فتح پائی۔ اور کلام میں پھر سلاست و روانی آگئی اس (۱۲) صفحوں کی چھوٹی سی کتاب کو جس کی نظمیں نیچرل طرز پر لکھی گئی ہیں، پڑھنے کے بعد دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے اور بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ مطبوعہ یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ۔ قیمت ۱ر

حیدرآباد فرخندہ بنیاد

میں بہترین سامان اسپورٹس و ورزش کی قدیم شاپ جس میں ٹینس، بیڈمنٹن فٹ بال۔ ہاکی۔ پولو۔ گولف۔ اور انڈور گیمیں۔ پنگ پانگ۔ فنگر بلیرڈ بورڈ۔ جمناسٹک اور ورزش کے متعلق پیرلل بار۔ ہاری زنٹل بار۔ والٹنگ ہارس۔ ٹیرز کے سامان شلا رسٹ گرپ۔ چسٹ اکسپانڈر۔ ڈمبلس۔ وغیرہ وغیرہ کثیر تعداد میں

تازہ اسٹاک

موجود ہے اور جو بمقابلہ دیگران نہایت ارزان اور مضبوط ہونے کی حیثیت سے گیارنٹی پر مل سکتا ہے خاصکر ٹینس۔ بیڈمنٹن بیٹ کی ریگینگ نہایت خوش اسلوبی سے بہم پہونچائی جاتی ہے مکمل تفصیل کے لئے فہرست فریم ہذا طلب فرمائیے

کے ڈی عبدالغفور اینڈ سنس اسپورٹس ڈیلرز جیمس اسٹریٹ سکندرآباد

(برانچ)

متصل سینٹ جارجنز گرامر اسکول حیدرآباد دکن

انجمن امداد باہمی

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ

حیدرآباد دکن

امداد باہمی (   ) کے اصول پر دکن میں

اردو مطبوعات کا پہلا وسیع اور قابل اعتماد

کتب خانہ

ہر حصہ (۱۰) حالی چوبیس ماہ میں فی قسط (۱) کے حساب سے ادا شدنی ہیں منافع بعد ادائی زکوٰۃ دس فیصدی تقسیم ہو رہا ہے

تھوڑے حصے باقی رہ گئے ہیں

خریدار جلدی کریں

۱۔ فروخت کتب۔ اردو زبان کی تمام کتابیں ملسکتی ہیں کمیشن پر فروخت کی جاتی ہیں۔

۲۔ مطبع۔ بہترین ماہر فن لیتھوگرافر کی نگرانی میں کام کر رہا ہے ہر قسم کی طباعت بہترین۔

۳۔ دارالاشاعت۔ مولفین کی بیش سے زیادہ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

---

discoveries of science and spiritualism justify the need for religion. Religion is a short cut to those hidden laws and truths to which science and spiritutalism plod their weary way. It has from unknown times accepted the existence and immortality of the Soul. The Soul in the present and the future life has ever been and still is, the main concern of religion.

The author deals with the seven leading religions—Sanatan Dharam, Islam, Christianity, Sikhism, Zoroastrianism, Jainism, Budhism, to which list he adds his new "Scientific Religion," which is the subject of the last chapter.

The book is well written and makes interesting reading. We hope that it will make some contribution to the cause of religious toleration and national unity in India.

S. F. H.

---

by Mr. D. A. Rawat, and " Provident Fund *Versus* Pension " by Mr. Kanhaiya Lal. In the former article, it is pointed out that if the children are taught to discover and love things which are common in human nature and if the teacher sets the right kind of personal example, " the rank seed of prejudice will not find a fit soil in their minds ". There is also a poem entitled " Think Right " by Mr. David A. Bush. The editorial deals with the " Grave Wastage " involved in the annual migration of 800 Indian students to foreign countries for study.

The Bihar and Orissa Teachers' Journal. This journal is the official organ of the Bihar and Orissa Secondary Schools Teachers' Association, Bhagalpore and is published bi-monthly under the editorshipof Mr. B N. Mukerjee, M. A. The October number under review (Vol. II No. 5) contains an instructive article on "The English Public Schools " by Mr. Richard S. Chalk, B.A , (Oxon). Mr Chalk gives an interesting account of the part played by games and athletic sports in the life of the English Public Schools. The journal also contains other useful articles of educational interest. It is well got up. The annual subcription is Rs. 3.

S. A. A.

A. N. S.

Scientific Religion 'VOL 1' BY G. N. GOKHALE, B. SC., L.C.E., M I.E., INDIAN SERVICE OF ENGINEERS, PRINCIPAL, N. E. D. CIVIL ENGINEERING COLLEGE, KARACHI.

India is *par excellence* a land of religions varied in principles as well as in outward expressions. Yet no country in the world can show so many instances of noble efforts for assimilating and reconciling, if not amalgamating, the principal faiths pervading the land. The mystic Kabir in the 14th century and his more famous contemporary and disciple Guru Nanak, the founder of Sikhism, saw the same fundamental truths underlying the teachings of the different religions and attempted, each in his own way, to focus them in one cosmic religion. Later, Akbar's well-known experiment in Sunworship was nothing but a veiled attempt to pioneer a *via media* between Hinduism and Islam. This book " Scientific Religion " endeavours to trace a common source to ali faiths. Still more it is a bold attempt to harmonise Science and Religion, which have often been held to be antagonistic to each other. The author Mr. Gokhale has explained the tenets of the new faith. Religion, as he says, is a potent factor in human character, but there may be difference of opinion as to whether the

In conclusion, there would seem to be ample scope for experiment along the line of methods in regard to character education. The field has not been explored nearly as much as the more formal aspects of education and every teacher can be a contributor in this respect, for the use of empirical methods is a necessary step in the scientific study of an art, in this case the highest of all arts—the art of living; for the most baffling problem a teacher is called on to face in all his very varied work is the right development of character and personality. Failure in this respect means failure everywhere.

Reviews.

The Gramani. This is a monthly magazine devoted to the study of village self-government and village civics in India. It is edited by Messrs. Hirurka, M.A., LL.B. M.G. Deshmukh, B.A., LL.B., and J. S. Pahade, M.A., B.T., and is issued from Nagpur. The annual subscription is Rs. 5. In the first issue, May, 1930, the editors explain that the word "Gramani", which occurs in Vedic literature, means village councillor. According to them, "the extinction of the *Gramani* has meant practical extinction of Indian civilisation". It is therefore their aim to encourage the spread of village self-government of Gram-Panchayats all over India. We have seen nearly all the issues of the *Gramani* which have been issued so far, and have been pleased to find in them much useful information relating to the problems of rural reconstruction in British India as well as in the Indian States. While we think that the *Gramani* deserves the support of all those who have the cause of Indian rural uplift at heart, we cannot help observing that there is a greater need for journals of this kind in the vernaculars than in English.

The U. P. Education. This magazine is the official organ of the Non-gazetted Educational Officers' Association of Bulandshaher (U. P.) and is issued bi-monthly from Meerut under the editorship of Mr. M. N. Baikal, B.A., L.T. The annual subscription is Rs. 3 The September number under review contains an interesting article on "The Aim and Method of Teaching History in Schools", by Mr. K. N. Bhatta Charya, B.A., L.T. The writer points out the defects of history teaching in Indian schools and shows how a living interest can be created by the use of source books, historical maps, historical charts, pictures and lantern slides, by the organisation of excursions to historical places and by the enactment of historical dramas. The other articles in this issue are "Causes of Prejudice"

education, will not accomplish our purpose. Feelings cannot be aroused to order by exhortation or command. We should never dream of saying to a child "be angry," why then expect him to respond when we say "be loving" or "be good"? Life is developed through living, love through loving, firmness of purpose through facing difficulties and surmounting them and so on. It is true that games, scouting etc, provide scope for the expression of these things, but the school curriculum can also be made to provide the necessary "situations" if a teacher cares to think the matter through, and develop a unified and defined purpose for his moral teaching. It will be found also that the project method of teaching will lend itself with great advantage to a realisation of this purpose.

Another aspect of the subject which needs more consideration than it gets at present is the necessity of developing the social sympathies of the child, who often finishes school with a Leaving Certificate, but with a very imperfect adjustment to the complex social and civil relationships of life, and with very little altruistic bent to help him adapt himself aright to them. It is a strange modern phenomenon that school life should be so divorced from current social needs, seeing that in the beginning of educational effort social needs were the main factors that determined the kind of education to be imparted. If children are social beings, to be developed under social influences, employing social relationships and destined for social service, there must be a far greater emphasis on the ideals of mutual service and co-operation in our school organisation. The class unit can well be used to provide scope for the expression of social effort, and the house system is also a great training ground in social responsibility and loyalty. We cannot do better under this head than refer the reader to Mr. W. Turner's admirable article on "Education and Citizenship" appearing in this issue.

Editorial.

MORAL EDUCATION.

The advance of civilsation has meant a corresponding advance in ideals, and of late years character education seems to be coming into its rightful and central place in our educational systems. But a theoretical realisation of its importance is not sufficient; what is equally important is a right understanding of the methods and facilities for training pupils along these lines. The traditional method of this and other lands as regards moral and religious education is the memorising method. It is practised by all-Brahmin, Mohamedan, Christian and Buddist. Learning by rote has its value of course, as power is generally associated with beliefs and the conviction we have regarding them. But ultimately, it is not what is memorised but what is resulting in the pupil—what the child is becoming—that is the main thing and is the real criterion of efficacy as regards moral teaching.

Again, since life is a unity, it is obvious that the moral teaching should permeate the whole of the instruction given, and also find scope for its expression in every department of study, and not simply in the moral lesson period which is valueless unless linked with the rest of the curriculum. What would we think of the person who deliberately or carelessly omitted every grain of salt from the child's daily food, and then to make up for the omission, administered a large formal dose by itself once or twice a week? What must be provided is a programme for the pupils' own experience so that through it the pupils may express their own lives, and face and solve their own life situations in the light of the ideals inculcated. Thus alone is character achieved. Mere moralising, which along with memorising constitutes the twin dangers of religious

of all castes and creeds. "In fact, the Hyderabad State itself is in a way unique, and the society here in its capital is certainly so. In no place that I know do Mohamedan nobles and officials, Hindu nobles and merchants, British officers and the domiciled British and Anglo-Indian community meet on such intimate social terms". He was glad, he said, to see in this State, "a rapid growth of the desire for education among all classes", and he hoped it was not the pecuniary value of certificates causing this, but rather a "will to acquire real knowledge". He was particularly struck with the increasing attention paid to the education of girls, and he hoped the pupils of St. George's would do their part "in the slaying of those dragons of ignorance and misunderstanding which are hampering the growth of unity in India".

A vote of thanks to the Chairman was then proposed by Nawab Mirza Yar Jung, B A., LL B., in which, after an expression of his personal satisfaction with regard to his own son's six years in the School, and his final direct admission to Trinity College, Cambridge, this year, he declared that such possibilities being open to all, "this School has really been doing a great service to the public". Concluding, he thanked the Hon'ble the Resident, crowded as he was with engagements, for nevertheless finding time for the cause of education, as indicated by his presence then.

The function concluded with the playing of "God Save the Nizam", and "God Save the King".

Gift to the Teachers' Library.

Nawab Rustom Jung Bahadur (Mr. Rustomjee Furidonjee) has kindly presented a complete set of the Encyclopaedia Brittannica (9th edition), to the Library of the Hyderabad Teachers' Association. This gift is much appreciated by the members of the Association.

The Annual Prize Distribution of St. George's took place on the 20th. November, 1930, in the school Gymnasium hall, under the chairmanship of the Hon. the Resident, Lt.-Col. T. H. KEYES, C. S. I., C. M. G., C. I. E., who was received by a Guard of Honour of the school Scout Troop.

Annual Prize Distribution of St. George's Grammar School.

Short items were rendered respectively by the pupils of the Girls' School, Boys' School, and the Preparatory School, including a selection of gymnastic displays, representing some of the work done during the year on the physical side. The Chairman expressed himself as being delighted with the Preparatory School item. The children, both boys and girls, arrayed in festive dress, resembled a living flower garden, full of bright blossoms, and skipping about the stage with childhood's characteristic carefreeness, they finally garlanded the Chairman.

The business part of the programme then commenced with the School Foundation Prayer, followed by the Warden's Report, indicating another successful year, especially in the matter of Cambridge passes. Reference was made to the satisfactory Inspection and Medical Reports; cups won in the Annual Inter-school Sports and Debating Contest and the work of the Scout Troop. In dealing with the ideals of the school, the Warden indicated that no racial problems appear to exist in this small school world, where all races "meet and fraternise in the most friendly way". This is not accomplished by the giving and hearing of lectures on the subject of racial unity, but through living contact with all, and by trying to understand them, always employing a sense of fair play, tempered with humour. The Report concluded with a note of welcome to the Chairman, who then proceeded to distribute the prizes.

In his remarks which followed, the Chairman drew attention to the unique position of St. George's as a common meeting ground for sons and daughters of leading men

Notes and News.

The Annual Inter-School and Inter-College Athletic Sport.

The finals of the Annual Hyderabad Inter-School and Inter-College Athletic Sports were held at the Fateh Maidan on the 28th November, 1930. The following are the results:—

College Section.

Nizam College : Athletic Championship, Individual Championship, Relay Race and Hurdle Race.

Osmania College : Tug of War.

High School Section

Methodist Boys' High School : Athletic Championship, Individual Championship A and B, and Relay Race.

Govt. High School Chaderghat : Hurdle Race.

Madrasai Asafia : Tug of War.

Middle School Section.

Jagirdars' College : Athletic Championship, Individual Championship B and Relay Race.

St. George's Grammar School : Individual Championship A.

Primary School Section.

Jagirdars' College . Athletic Championship and Individual Championship A.

City College : Shuttle Relay A.

Residency Middle School : Individual Championship B.

Goshamahal Middle School : Shuttle Relay B.

At the conclusion of the Sports, Nawab Lutfud-Dowla Bahadur, Member of the Executive Council, gave away the prizes to the winners. Mr. S. M. Hadi, Hon. Secretary of the Hyderabad Athletic Association, deserves much credit for the excellent manner in which he had organised the Sports.

College of Physical Education.

A College of Physical Education for the training of physical instructors has been recently opened at Hyderabad Deccan by H. E. H. the Nizam's Government. Mr. F. Weber, M.A., B.P.E., has been appointed Principal of the College. Details about the period of training, course of studies and programme of practical work will be published in our next issue.

Principal physical features.
Chief natural regions and their characteristics.

C. Geography of India with special reference to the Dominions. Regional treatment to be followed as far as possible.

Form 2. A. Broad regional Geography of the Eastern Hemisphere.

B. Revision of Asia in greater detail.

C. Monsoon lands of the Eastern hemisphere in greater detail.

D. Europe.
Chief political divisions and principal physical features.
Climate, products, industries, and chief towns of typical regions such as :
The West European type, (British Isles and France).
Mediterranean type, (Italy).
Continental type (Germany and Russia).
Mountain type (Switzerland).

E. Trade routes of Eurasia.
a. Land routes.
b. Sea ,,
c. Air ,,

Form 3. General World Geography.

The Three Southen Continents.

A. Revision of Asia and Europe.

B. Geography of Africa.
Physical featurers and chief political divisions. Climate, products, and chief towns of typical areas such as the Nile Basin, Central and South Africa, Mediterranean Lands.

C. Geography of South America.
Chief political divisions, and physical features. Climate, products and chief towns of typical areas such as the Amazon basin, the grass lands and Chile.

D. Australia.
Political divisions and broad physical features. Climate, products and chief towns of typical areas such as the Eastern Highlands, the Central Lowlands the Western Plateau.

E. North America: Chief political divisions and physical features. Climate, products and chief towns of typical areas such as the Forest Region, Wheat Belt, the Corn belt, the Cotton Belt.

(*N.B.*—The comparative method to be a marked feature of the revision course in Form III.)

a separate subject, but should form part of the vernacular, Nature study and story telling lessons.

Standard 2 : Simple ideas of direction from the observation of the sun. Observation of the chief local features such as rivers, ponds, tanks, mountains, etc. Observation of weather, seasons.

Stories of children of other lands. (Daily life, food, clothing, homes, means of transport etc.) Continents not treated conventionally, but scenes given definite topographical setting.

Standard 3 : *Home Geography.*—

Finding of the North and South lines by a shadow stick, Simple ideas of a map, working from immediate surroundings such as the School, class room, playground and the home. Direction of home, police chowki, post office, park, Chawri (in village schools) etc. Explanation of Geographical terms with the aid of local observation and models. Simple Geography of the district (in village schools) and of the town (in urban schools).

Study of the Globe.—Elementary notions about the shape of the earth, and about divisions of land and water, with names of the continents and oceans.

Stories of other lands and peoples in more definite sequence, and treated in greater detail.

Stories of the world's discoverers. Visual representation of the story lessons on maps supplied.

Standard 4 : A. General outline of the Geography of India. World position, boundaries, broad physical features, climate (elementary notions) and principal products such as wheat, cotton, and rice.

B. Geography of H. E. H. the Nizam's Dominions.

1. Natural Regions.—
   Physical features, climate, rainfall, soil, vegetation, products. Occupations of the people. Imports and exports. Important towns.
2. Political.
   Political divisions, roads and railways, administration.

C. Further stories of other lands and peoples with special reference to the world position of India.

Middle Division.—

Form 1. A, Broad Regional Geography of Eurasia.

Chief natural divisions: climate, rainfall, soil and vegetation.

B. Geography of Asia.
Political divisions of Asia.

Training College, and to give every facility and encouragement to teachers who wish to avail themselves of such courses.

6. That a Geography Room be established in the Osmania Training College to serve as a sample Room for teachers, where they may have an opportunity of seeing and examining new books and apparatus.

7. That school libraries and especially High School libraries should be provided with suitable books in geography for teachers as well as pupils and that additions of recent geography books be made regularly.

8. That Government be urged to establish a Children's library in Hyderabad in charge of a librarian who has specialised in the work of children's libraries.

9. That educational journeys be organised under the leadership of experts to places of interest in and outside the Dominions; that Government be requested to give financial assistance for meeting the cost of such journeys; and that transport agencies be asked to allow special rates for such parties.

(School journeys are common in England, and educational visits to the Continent are becoming more popular. Germany, United States of America, and Australia also attach great importance to such trips).

Members of the Geography Sub-Committee.

Mr. S. Ali Akbar, M. A. (Cantab), Chairman; Miss F. N. Wookey, B.A., M.R.S.T., Secretary; Rev. F. C. Philip, Messrs. P. V. R. Sebastian, B.A., Gulam Kadir, B.A., Mohamed Yusuf, B.A., B.T., Abdul Noor Siddiqi, B.A., D. V. Ramana Rao, S. Abdul Kadir, Gulam Dastagir, B.A., Yusuf Husain, B.A., B.T., V. R. Kalyansundaram Iyer, B.A., C. H. Krishnaswami, B.A., L.T., Mohamed Siddiq, B.A., B.T.

APPENDIX

SUGGESTED NEW CURRICULUM.

Primary Section.—

Standard 1 : In this standard Geography should be taught, not as

the time for the wholesale application of this principle is not just yet, however desirable it may be as an ideal towards which we may work; and for the present our recommendation is, that except in the Administered Areas, where the conditions may need the continuance of the present practice of using English as the medium of instruction for non-language subjects, Geography should be taught in Urdu in the post—middle stage, English, of course, continuing as a compulsory subject in the curriculum. We are aware that this recommendation will be subjected to adverse criticism at the hands of those who proceed on the stand-point of strict logic, but we maintain that if we face practical issues, we have no immediate alternative. We have to find an alternative to English, which is purely a foreign language, and that alternative at present is Urdu. Urdu will pave the way for other vernaculars.

Recommendations.

1. That pressure should be brought to bear on the governing bodies of the Osmania and other Indian Universities so that Geography may immediately be included as an optional subject for the Intermediate and B. A. Examinations and Schools of Geography be founded as soon as possible.

2. That the present curriculum should be revised as early as possible and steps should be taken for the preparation of suitable Geography text-books for Primary and Middle Schools, especially in the vernaculars.

3. That the teaching of Geography in the various schools should be entrusted to better qualified teachers, and that in the High school, wherever possible, the teaching of this subject should be placed in the hands of specialist teachers.

4. That special encouragement in the shape of higher salaries or allowances be given to those who have made a special study of geography.

5. That the Education Department be urged to organise Refresher courses in Geography in the Osmania

inspection of notebooks will be most important, as the stage of free note taking will have been reached. And the teachers of geography may be reminded that a loose leaf note book is the most valuable).

Students should be encouraged to observe the Pole Star and the Great Bear. Where there is an observatory, as at Hyderabad Deccan, an opportunity should be given to the pupils to observe the celestial bodies through a telescope. In connection with the structure of the earth, the boys should be made to examine the igneous rocks of the Deccan. They should also be encouraged to make collections of different kinds of rocks for the school museum.

A school journey may be possible at this stage, but careful preparation for it is necessary, and definite maps and problems should be given before the start is made.

A very great use of books will in many cases have to take the place of the actual journey, and a choice of questions be allowed to the senior classes. The children will need training in the reading of these books, for some will repay careful reading, while others will only be dipped into.

Medium of Instruction. There seems no need at this stage of our educational history to stress the value of education through the mother tongue. At the same time, we should take note of other facts: that Urdu is the language of the State and of the University, and English is the language of the Empire and of foreign intercourse. Practical statesmanship should take account of all these elements that enter into the complexity of our educational system. Bearing the several factors in our mind, we would recommend that the subject of Geography should be taught in the mother tongue of the pupil—Urdu, Telugu, Marathi, or Canarese, up to the middle stage, Urdu and English being taught as languages during this stage. While we recognize that strict logic would carry forward into the High school stage and farther our suggestion for teaching in the mother tongue, we are constrained to admit that

interests of the teacher. The syllabus of the Madras University, for example, suggests a novel method of approach to the survey of world Geography, the study of the continents proceeding from the study of the climatic conditions in the oceans which unite them. This method is not unsound, but it is one which the teacher whose knowledge of science was limited would do well not to imitate. But that does not mean that he cannot make the fresh study a living one. He may be attracted by the economic or commercial aspect of Geography, though for this method access to trade reports and returns is essential.

The historical method will find many advocates, and modern expeditions for furthering the cause of Science will form a starting point. Recent mechanical inventions are also altering whole areas and population centres beyond recognition, while motor transport is revolutionizing the mentality of vast numbers.

Home Geography.—The thorough revision of the home country will be an essential part of the High School course not only because of the intrinsic importance of the study of the homeland, but because of the material which it provides for comparison and contrast. The students should be trained to apply to the home country the principles learned by them from the study of the world.

Local Geography will assume more the form of the Domesday survey, with the facts observed (houses, roads, crops, jungle, etc.) recorded on tracings of the local Government survey map.

Practical and Observational Work.—Daily temperature, pressure, and humidity readings should be recorded during the High school stage, and each member of a class required to plot the results obtained.

The meaning and use of contour lines will be thoroughly grasped during this period. Transverse sections will be made, and sketch maps will be regarded as an essential in the notes of nearly every lesson. (In this stage the regular

India will be contrasted with the Deccan. Rather more difficult problems than those attempted by the highest standard of the Primary division will be set and solved.

Practical and Observational Work.—The pupils should be made to observe the actual course of the sun in the sky during the different parts of the year with a view to showing the different altitudes of the sun in the different seasons. They should also notice the length of days and nights in the different seasons. They should further be trained to find out the latitude by observing the sun's shadow during the equinoxes. In the course of excursions, the pupils should be shown the topography of the surroundings, processes of irrigation and cultivation, different kinds of soils, and storage of water, as in the Osmansagar, Himayetsagar and Nizamsagar tanks. By means of preliminary talks and preliminary study, the pupils should be well prepared for each excursion, and on their return they should be made to give a description of what they have observed and to prepare plans, maps and sketches. Practical work in the Middle stage should also include the making of weather charts, the reading of the thermometer and preparing small statistical tables and charts to show the agricultural and mineral products of a country, its population, and its imports and exports.

Map Work.—Even more attention at his stage should be given to the study of maps, the scales should be noted, and the position of the most important countries defined in terms of latitude and longitude.

High School Stage.

Treatment of the subject.—The method of approach will be markedly different from that used in the preceding stages. The pupil will be the research student, and the teacher the director and guide, not the instructor.

World Geography.—The survey of the world is done in greater detail, and some particular aspects are selected for closer investigation. The choice of the particular subjects for closer investigation will depend upon the knowledge or

working out with the aid of the atlas the answers to simple problems. Reasons may be found for the choice of Hyderabad, Deccan, as a capital, or for the dryness of the Deccan. These and many others are of the type, which, carefully approached, should be attempted.

Middle School Stage.

The method of treatment of the subject at this stage will follow, at first, much the same lines as those suggested for the Primary stage, except that the study of the world will be completed and will be more systematic, though the teacher will remember always to confine himself to the more important facts and broad outlines and to draw frequent comparisons with the home country.

World Geography.—The descriptions will be in more definite sequence, and arranged in greater detail. The characteristic features of plant and animal life will be known to the children, and the connection of these with climate will now be made explicit. The world will be divided into definite regions, and the dependence of man upon the natural resources of each will be clearly brought out. The intercourse between one nation and another, especially between India and England, will be emphasized.

At this stage the pupils should be able to visualise the general distribution of land and water over the earth's surface. Many teachers for this follow the journeys of such great explorers as Marco Polo, Vasco De Gama, Franklin and so on.

Home Geography.—Some subjects will be chosen for closer study, especially the geography of India, and the treatment will develop at the end of the course into that suitable for the High School stage. The children will be led to examine and compare conditions in their own land with those of similar areas elsewhere. The Sahara will be likened to the Thar Desert, the rivers of China to the Ganges basin, the Himalayan barrier will be contrasted with the unprotected north of Canada or Eurasia, the plains of

There will be no set lessons on any topics such as mountains, rivers, lakes and no formal definitions, but an understanding of the meaning of all the terms used will be gradually built up. The daily use of handwork to illustrate the subject of the lesson is, for the first year at least, the best expression work for the Primary course. Each class should have a large sand tray, and the children should be encouraged to do a great deal of co-operative work in building up on this a representation of the scene described. Many Missionary Societies provide, for their own needs, a course and apparatus which is invaluable at this stage. The necessary back-ground, *e. g.*, a Japanese home and garden is drawn on a large sheet of stiff cardboard which is, after painting, folded and mounted at the back of the sand tray. Cut-outs of the members of a family, over which can be slipped dresses varying with the rank and work of each, will give further varied occupations, and by degrees enough figures can be collected to give a most representative group of citizens.

The value of clay modelling, at its maximum (for our needs) at about the age of nine, is more neglected than one would expect. The build of a country can be shown first by means of models, but it must be remembered that the use of a model is to interpret a map and once this power has been acquired the use of the model is unnecessary.

Map work in the Primary Stage.—Elementary ideas of direction given in Standard II will be made much more definite in Standard III in which very simple plans of the immediate environment will be made, and the children will be given their first ideas of a map from the study of the globe, passing then to outline maps of the continents, on which they will show by simple drawings any outstanding idea connected with the stories read to them, such as the pyramids of the Nile basin, the pygmy huts of the Congo, the canœ of the American Indian, and so on.

In Standard IV considerable time will be given to

and the sowing and reaping of crops. The foods sold in local shops and markets, and articles of clothing will be connected with stories of life in other lands. The local roads and railways and the traffic seen upon them will lead to easy problems which should be within their power to solve at the end of the Primary stage.

Unconnected details should not be emphasized, but certain *Leading* facts should be known accurately. The difference between the Deccan plateau and the great plain of the north and the connection between high land and heavy rainfall will easily be seen from models. Breadth of treatment, and the seeking of contrasts is essential. Only the most important physical features, products, and the effect of these things upon the life of man should be emphasized.

Practical and Observational work in the Primary stage. In connection with his preliminary talk on the sun, the teacher should make the young pupils observe the actual movement of the sun in the sky. They should be taken to the nearest rock or hill and made to observe the elevation and unevenness of the surrounding parts, a plain near by or the parts of a mountain. Opportunity should be taken of a rainy day to show them the formation of streams, rivers and other land and water forms. Short rambles to cultivated fields will help the boys to understand the actual growth of the various local crops. In town schools visits to shops and workshops should be organised to give the boys an idea of production and distribution.

Constant use should be made of well selected pictures. "Pictorial Education" should be considered an essential in any school, for it is invaluable for the teaching of every subject on the curriculum. Picture post-cards, lantern slides of real scenery, and a full discussion with the class of the points to be learnt from each picture will encourage the children to find out for themselves, and will remove many misconceptions which scenes of unknown phenomena must present.

Reading aloud by the teacher of a continued story of the adventures of a hero that will appeal to the class, even if the story is largely imaginary, is very valuable.

For instance, the story of Finn the Wolfhound, one of the best, if not the best of dog stories ever written, gives unforgettable pictures of the English Downs, and the ordinary everyday life of the people. From there the scene changes to Australia, and we share the isolation of a boundary rider's life and the common animals of the country are known, and in the case of the rabbit, despised. The dramatic reunion of the hero, Finn, with the Master whom he worshipped, and from whom he had been separated for over two years, portrays indelibly the perils braved by the early gold seekers, with their often fatal ending. Mr. Seton-Thompson's books are also loved by Juniors. The story of Whab could be read aloud and finished in the course of one hour, and yet it gives matter for half a term of work.

We recommend the translation of books into the vernaculars and hope that the writing of similar books in the vernaculars will be attempted.

The suggestions given will indicate one line of approach which teachers will adopt to make their stories of life in other lands vivid and interesting. Those who are scientists will tell of man's conquest of nature, of inventions which have surmounted natural obstacles, or of his fight against disease.

The story of Gorgas and of his band who deliberately exposed themselves to Yellow fever; of Dr. Schweitzer who left a European reputation as a musician and theologian to work in the fever stricken lands of the Congo, must hold the interest of the class, if time be taken to work up the story of each life simply and naturally.

Home Geography in the Primary Stage.—The study of the home country will form an important part of the Primary course.

It will begin with practical and observational work on the immediate local surroundings. Nature lessons will direct attention to the apparent movement of the sun, the seasons, the action (during the monsoon) of running water,

Considering the salient characteristics of the three stages—Primary, Middle and High—the aim of the Primary stage should be to develop the emotions and the imagination, though the training of the judgment in discovering simple causal relationships must be given even in this stage.

The aim of the Middle Section should be to train the children to reach accurate judgments concerning the relationships of the phenomena treated in general geography. A composite and a patch work picture is obtained, and the constant comparison and study of the homeland is essential.

The High School Stage must give clear notions of the size and position of one's own country and of foreign countries, and the pupils should see that each state is *bound* by the environment in which it has developed. The study should lead to true patriotism and tolerance.

In brief, the aims of the Primary, Middle and High sections should be as follows:—

Primary : Training the emotions and imagination.
Middle : ,, in judgment.
High : ,, in patriotism and tolerance.

Methods of Treatment.

Primary Stage.—Various methods have proved successful.

In some schools the method of contrast is always used when telling of the life of children of other lands. The Eskimo is compared with the home dweller, the life of a fisherman with that of a plainsman. The Indian jungle is compared with the forests of Europe, and with those of the Pygmie dwellers. Others read stories by travellers or explorers or tell of all sorts of conditions unlike those at home, and of the heroism of those who have surmounted the dangers encountered, such as earthquakes, icebergs, and forest fires.

they reach Standard II, and this interest will be still further stimulated in the upper stages of the Primary Section. Self-activity, especially outside the schoolroom, is vitally important. Observation, experiments and measurements cannot be dispensed with if the instruction is to be fruitful. At this stage too the children will learn of the lives and habits of people living in different surroundings.

The Middle Stage.—The aim here will be, while maintaining contact with the geography of India, and especially with the geography of the Dominions, to impart a general knowledge in broad outline of the geography of the world. The pupils should know the distribution of land and water, the important types of land relief and climate, and have some definite knowledge of its most important regions. By the end of the course the pupils should have a firm grasp of the main elementary generalisations of geography, the effects of world position, land relief, climate and vegetation upon the occupations and activities of mankind. They should have a clear idea in their minds of what is meant by natural regions, be able to insert them correctly on the map, and account for their position and characteristics. The study of the home country begun in the Primary stage will be continued with increasing detail. At this stage only the salient facts should be emphasised and no attempt should be made to burden the mind with an excess of detail.

The High School Stage.—In the High School stage the aim will be to give a clear impression of the world as a whole, and some definite knowledge of some important regions which have been done in a very simple way in the Middle School stage, together with some definite knowledge of areas which have been omitted in the lower divisions. It will be noted later that the method of approach during the High School stage will be markedly different from that for the Primary and Middle divisions. The use of the map will be very greatly extended.

only for the English High Schools but also for the Osmania High Schools, though, as we shall point out elsewhere, the method of treatment suggested in that syllabus may not suit all teachers.

As regards the courses of study in geography prescribed for the Primary and Middle classes, we are of the opinion that the existing curriculum is defective. In the first place, the regional treatment is almost entirely ignored. Secondly, the distribution of the course in the various classes has not been made carefully. Geography of H. E. H. the Nizam's Dominions is prescribed for three successive years in Standards III and IV and Form I. The result is that the pupils of Standard IV are required to cover in that class little more than the ground which they have already covered in Standard III, and likewise the pupils of Form I are taught many of the things which they have already learnt in Standard IV. Another consequence is that, since the whole geography of the world, in outline, has to be finished before a pupil completes the Middle course and joins a High School, he is overburdened in Forms II and III and does not get enough time and opportunity to assimilate all that is attempted to be taught in these two classes. We consider it necessary that before a boy leaves the primary school, he should have acquired not only a knowledge of the Geography of the Dominions, but also some acquaintance with the geography of the world outside the Dominions, and especially with the Geography of India.

The syllabus proposed by us for the various classes is given in an appendix. Here we shall merely make some preliminary observations on the principles which form the basis of that syllabus.

A course is usually divided into three stages, Primary, Middle and High school, and the general aims of the teacher in the three stages should be as follows:—

The Primary Stage.—The children's interest in their immediate surroundings will have been awakened before

4. A map only will allow of the easy memorising of the chief lines of latitude and longitude of a large area. This memorising will serve to make much more definite the usually very vague notions as to climate in different parts of the world.

5. The drawing of easy continents and India from memory can reasonably be expected from pupils who own good atlases. The lines of latitude and longitude will give the framework, and if the teacher always marks the intersection points of the area on the framework in coloured chalk on his own black-board maps, the class will soon learn to draw in the continent accurately.

(Generally the central meridian and northern parallel serve as the skeleton on which to build up the framework).

6. An atlas will give all the "pure" memory work that will be required for any examination.

We have dealt at length with the use of maps, because of its importance, and because of its general neglect in our schools. To digest the vast majority of geography lessons without the aid of a map is no more possible than to digest an ordinary meal if one has lost one's teeth.

The curriculum.—The second main section of our report is concerned with the arrangements of the course. Geography is at present taught from Standard II to Form VI or Osmania Matriculation class. In the English High Schools geography did not receive adequate attention so long as it was a subject under Group B of the courses of study prescribed for the the High School Leaving Certificate Examination. We therefore welcome the recent decision of the H. S. L. C. Board to make geography an examination subject in the High School section of English High Schools. We have seen the syllabus suggested by the Madras University for the High School classes and consider that, with slight modifications made in accordance with the local requirements, it may be adopted with advantage not

(*a*) That many wall maps are seriously out of date.

(*b*) That physical wall maps—the only really essential type are far outnumbered by those of other kinds.

(*c*) That most of the maps are those with names, instead of with very few, or none.

(*d*) That the arrangements for storing, and the ragged condition of the maps, prove the disregard in which they are held by the teacher, an attitude which is only too readily copied by the class.

(*e*) That clear sketch maps made from time to time by the teacher on heavy brown paper or drawing paper to illustrate his lessons are non-existent.

A map serves a two-fold purpose. It not only records the facts to be taught such as position, elevation, distribution etc., but also by its method of presentation visualises the facts for the student.

But the wall map, no matter how good, must have as its companion an atlas on the desk of each pupil. Only a practical test will reveal how helpless are pupils, not conversant with a map from the very beginning of geography, in finding on their own atlases a town, a river, or other feature pointed out on the wall map.

A good atlas is of more value than a text book—if a choice of one or the other must be made,—for :

1. An atlas will familiarise the child with the conventional colouring used to denote mountains and plains, hot, moderate, and cold temperatures, and so on, and the facts will become much more indelibly fixed.

2. Knowledge of one land mass thus coloured will make it easier for the knowledge of another to be gained.

3. The children with the aid of a good atlas will become experts at drawing simple sketch maps.

often disregarded, not only by teachers but by those who in other matters show themselves thoughtful and farsighted).

6. Material for instruction for the Primary stage is often drawn from too small a field. Experience has shown this to be a mistake, for

(*a*) Although the learner's own neighbourhood is the starting point of instruction—always—and reference must constantly be made to it, yet one country will not give enough ideas and illustration *in a form suitable for young children*.

(*b*) A detailed study of a particular area is premature at the Primary stage.

7. A seventh most common error is the neglect of practical work. Detailed suggestions for this at each stage will follow, but for all stages the following principles must be observed :—

(*a*) The children must really learn to observe.

(*b*) They should be told nothing that they can reasonably find out for themselves.

(*c*) The drawing of graphs and statistical tables is valueless unless such drawing is the outcome of the boy's own observation.

(*d*) When an expedition to study some one feature is decided upon, the teacher must first make the trip alone, and be very clear in his own mind what he wants the class to observe. He must also have had one or more preparatory lessons in class, so that the children know clearly what they are to notice particularly. Lastly, he must sum up afterwards the facts discovered from the expedition.

8. The eighth and a most serious error is the neglect of atlases and wall maps, and simple black-board sketch maps. Maps are one of the absolute essentials of equipment, but the esteem in which they are held can often be seen by a mere examination of the maps in a school when it will generally be found :—

Another most useful aid is a knowledge of the most common errors of treatment.

These are seven in number.

1. The subject is not correlated with other subjects of the curriculum.

2. The various aspects of geography itself too often are treated in watertight compartments. Physical, Political, and Commercial Geography are one and must be treated as such.

3. Too hasty generalization is a third most glaring fault. To give the generalization, instead of making the children find it out for themselves, is so much easier. But it is not educative. To lead a class to discover for themselves what factors are responsible for rice growing in Bengal, or wheat growing in the Punjab or cotton growing in the Deccan, will take anything from *six* to *twelve* lesson periods each, but the facts will not be forgotten and the method will form the basis for other facts to be gained in the same way. It is all important that a class realise early that geography is not a mass of unconnected details.

4. The fourth most common errcr is rigidity of treatment. A mere mass of greater and greater detail is too often demanded from the child as he passes up the school, and no attempt is made to adapt the method of treatment to his psychological development.

5. The lack of a scientific approach has led to

(*a*) Neglect of the Natural Regions as the best basis from which to work, with the result that the children have been burdened with much memory work of no lasting value.

(*b*) Lack of search for the cause which has brought about a certain effect. The children must be steeped in the thought that all conditions of life are governed by law. They must not think that because a law is not immediately evident it does not exist. (Laws of economics are most

what should or should not be taught. Even where a teacher is trained, owing to lack of proper training in the training centres, he does not know how to employ the best method in the teaching of geography. No subject demands a more varied knowledge on the part of the teacher than geography, and with the poor grounding in it with which many join the training centres, it is impossible for the loss to be made good. Time does not allow of a thorough study of the "contents" by the teachers under training.

3. Lack of suitable equipment.

This is true, unfortunately, of nearly all schools.

4. The great neglect of practical work.

The importance of practical work is not sufficiently realised even by trained teachers.

5. The lack of correlation and co-ordination.

There is lack of correlation in the subjects which the children are learning simultaneously, while lack of co-ordination is shown in disregard of the work which has been covered in the lower classes.

Remedies.—These fall into two main classes. Some defects are beyond the individual teacher's power to remedy. These we should endeavour to rectify by bringing pressure to bear as a body upon public authorities, and by gradually educating public opinion, but others are well within our power to remove.

Ignorance, how can it be combated ?

For those who know English, the number of excellent text-books on the market provides the means of bringing their knowledge up to date. The careful reading and application of the principles set forth in any good text book of method, such as Strayer and Norsworthy "How to Teach" will, in conjunction with matter reading, give an excellent basis. Interest in the subject and enthusiasm will do the rest.

leted by the pupil before he passes the Primary, Middle, or High School stage respectively, school authorities are at liberty to vary the division of the work among the different standards in each division".

The purpose of the syllabus is to serve as a guide. Too often does a teacher who is preparing a class for an external examination regulate his presentation by the syllabus laid down. A full scheme covering all the stages of the child's life, as well as the details of the work to be done quarterly in each class, must be clearly set forth, and followed for the maximum benefit to be obtained.

Liberty of variation is given for the all-important privilege of so adapting a curriculum that the special conditions prevalent in any of schools will have due weight given to them, whether those conditions concern particularly the children, or the teacher who is to guide them aright.

These general considerations which have just been mentioned, lead us at once to think of some of the most prominent defects which have characterised much teaching in the past, and before indicating the general principles which should influence a scheme of work for the three stages of a child's school life, we propose to considered the defects and some of the main remedies thereof.

Defects in the Teaching of Geography.—Defects in geographical teaching are five in number.—

1. In many cases the knowledge of geography possessed by the teachers is limited. Even in High School classes geography is entrusted to graduates whose only qualification for teaching the subject is that they studied it for the Matriculation or H. S. L. C. Examination. The lack of qualified teachers of geography is due to the fact that very few universities in India have yet made geography a subject of study either for the Intermediate or the B. A. Examination.

2. Lack of training.

Many teachers are totally untrained. Such teachers have not got even general principles to guide them in deciding

understanding and use of maps, especially in illustrating the characteristics of any region (physical features, climate or productions) will proceed equally with the gaining of all kinds of useful knowledge. By the end of the course the children will not be content with a mere statement of fact, but will want to know the law on which it is based, and all should have a good idea of how and where to obtain further information about any subject in which they are interested.

The Relation of Geography to other subjects.—This aspect of Geography has been discussed in the June issue of the *Hyderabad Teacher*, so that attention is simply drawn now to the fact that no other subject of the curriculum demands greater correlation, and indeed some aspects of Geography itself cannot be taught without a knowledge of the principles of other subjects, such as science. Practical and accurate measurement is as much an essential of Geography as of Arithmetic, and the link with Nature Study is almost equally close. The connection between History and Geography is self-evident, and each loses much of its value and significance unless frequent reference is made to the other. Geography also provides valuable exercises in hand-work, in the making of paper or plasticine models of countries and other forms of map-making. It is invaluable also in the way of supplying data and matter for all kinds of composition exercises, and especially for descriptive essays.

Scope of the work.—But it must not be thought that because geography has such a close connection with other subjects it has no existence of its own. Its range is wide and on that account a most careful selection of material is essential. But, it may be objected, a curriculum is laid down by an outside authority; all a teacher can do is to follow it. But careful reading of any syllabus will reveal the fact that it is a *recommendation* only. As one Indian authority states, " Provided that the courses prescribed in the Primary, Middle, or High School are comp-

Report of the Sub-Committee on The Teaching of Geography

Submitted to the Hyderabad Teachers' Association and adopted by the Fourth Annual Conference of the Association, held in July, 1930.

THE growing importance paid to the study of Geography is seen by the steadily increasing number of Schools of Geography which are being founded in various universities all over the world, and by the attempts which have been made in recent years to give it a more prominent place in the school curriculum.

Advantages of the study of Geography.—Geography helps a child to think about his immediate surroundings which offer so many facts within his own experience. His imagination is set on fire when he is led to think about the world in which he lives, and his patriotism is aroused when he learns the geography of his own country. His power of sound judgment and reasoning will be cultivated if he is led to approach the subject *in the right way.* But deeper lessons will also be learnt. For the older student the study of Geography, if properly guided, will not *end* in a narrow patriotism, but in a feeling of true social sympathy and international good will, with a sense of civic duty that helps towards good citizenship. The peoples of the world are becoming economically so linked together that it is daily more evident that "if one member suffer all the others suffer with it". A well planned school course should make the children thoroughly at home in some of the more important principles of geography, which they should acquire independently by observation, experiment, judgment, research and independent reading. They should also be trained to apply these principles to their own district and country. The

help apparatus. There were methods for learning the several branches of arithmetic, besides methods for various other subjects.

The Waldorf mechanical toys exhibition was a general attraction. They were amazing as samples of child expression in wood. It was interesting to watch the enthusiasm aroused amongst the children who visited this department.

Amongst the Polish exhibits was a well-designed painting method, books of fairy stories with movable figures in the pictures, and an interesting model of the Nativity in wooden toys.

Another interesting exhibit consisted of small sculptures in white soap exhibited by the National Small Sculpture Committee, New York. Soap sculpture has become an accepted part of the art courses in many public and private schools in America.

Besides the above-mentioned exhibitions, there was the Montessori Room with an entire set of Montessori material, and amongst the small exhibits was one by Miss Rudford to teach "Poetic expression as the foundation of reading". Each sentence made a complete story and pictures illustrated the thought contained in the sentences.

There was a most attractive exhibition of foodstuffs in which complete diets were exhibited for children of tender years and for those suffering from various illnesses where a prescribed diet is required. The foodstuffs did not include meat and fish, but consisted for the most part of dried fruits including dried bananas, salads, nuts, raisins, different vegetables, croquettes made of figs and nuts, and compounds of various cereals.

The Indian Delegates.

A meeting of the Indian Delegates was held in Hall No. IX with Mrs. Beatrice Ensor in the chair on August 19th. Shrimati Kamalabai Chattopadhyaya made an excellent speech on "General attempts in Educational Reform in India", with special reference to conditions in South India. Professor D. K. Karve elicited much admiration and sympathy by his speech on the "Education of Women in India", when he told the audience how he had succeeded in creating the Women's University in Poona. Pandit Ram Narayan Misra described the Benares Hindu University and its work along the modern lines of instruction in the Vernacular. Mr. A. P. Inamdar, Director of Education in the State of Aundh, told us what was being done in the way of New Education in his State. Pandit Shri Ram Bajpai took as his subject, "Extra-Mural Activities". Professor V. M. Metha dealt with "Education in the Indian States". Miss Lowe, Deputy Directress of Education, Madras, told us in a most interesting way what the British Government was doing for education, especially for girls, in the Madras Presidency. The writer spoke on the "Osmania University of Hyderabad".

The Exhibition.

The International Exhibition held at the Marienlyst-Allée School in connection with the Conference was really admirable from the educative point of view. It was exceedingly well arranged in two large buildings containing many rooms, and the exhibits were displayed to the best advantage.

One of the most interesting exhibits was the "Workshop" Bilthoven, Holland. It contained material designed by Kees Boeke showing (1) the general methods to enable a child to correct his own work, (2) general methods for enabling two children to correct one another, (3) new methods of reading and writing, (4) an elaborate and ingenious method for the teaching of language, and (5) reading

ren's interest in the subject, so that he may draw back while a general conversation arises on the matter in question. Instead of "Speak when you're spoken to", the rule now is: "If you've anything to say, say it by all means". The reason for this change of out look is this: formerly the methods to be adopted in the schools were ordered and regulated by the governing class. But now the people have the schools in their own hands, and they have realised that in a democratic state people must be trained for democracy".

Art Training.

Dr. Leo Weismantel, Principal of the State School of Popular Culture, Markbreit-am—Main Germany, in dealing with "Modern Tendencies in Art Training" in his lecture before the Conference said that the first task of the teacher was to set free the creative powers of the child, and to help them come to fruition. He further stated that both the reproductive and productive sides of the creative force are soul expressions, and that all such creations provide valuable material for psychological research.

Parental Co-operation.

One result of the Conference will be a world-wide *Parent-Teacher Movement.* The International Parent-Teacher organisation was started by Mrs. Reeve of Philadelphia, editor of "Child Welfare", and this body will be linked up with the International New Education Fellowship. This movement provides for the "whole child". The pupil in school is only another aspect of the boy or girl in the home and the child in the community. Mrs. Reeve urged that the practice of parents criticising teachers, and *vice versa,* should be substituted by a determination for all to co-operate for the good of the child. Parents should not be called together merely to be instructed, for they take no more kindly to instruction than teachers. Both parents and teachers, however, can learn from each other if rightly approached. It was announced that in England forty parent-teacher associations had been initiated and that a strong campaign was on foot to increase this number.

Psycho-Analysis.

Dr. Oskar Pfister of Zurich speaking of the "The Significance of the Unconscious in the Development of the Individual" showed us how Psycho-Analysis has given us entirely new insight into the spiritual development of a human being and emphasised the value of the teacher's application of the principles of Psycho-Analysis. He showed that with the help of psycho-analytical principles unconscious purpose may be discovered in many cases.

The Influence of the Cinema.

Dr. G. H. Green, Lecturer, University College, Wales, maintained that the cinema exercises far less influence upon children than is supposed. As the result of an inquiry as to the causes of widespread national or racial prejudices among school children, only 10 per cent of the opinions could be traced to the cinema. Dr. Green expressed the opinion that books were a much more powerful source of influence than cinemas, and urged the provision of good libraries as a means of fostering international good-will in schools.

The New System of Teaching in Austria.

Herr Gloeckel, President of the Board of Education, Vienna, explained the new system of teaching which has recently been introduced in Austria. He said:—

"The teacher makes the plan of work, and the subject is worked out by the pupils. Joyousness is the sign of the new school. Not only is the child's mind exercised, but all the faculties, and especially the hands, are brought into play. The fullest possible use is made of the child's desire to experiment and discover. The children are taught to be original, to use their initiative" ...." The classroom is decorated with flowers and pictures, often of the pupils' own work. The whole spirit of the thing is different. The children are being trained for democracy; discipline is imposed, not by the teacher, but by the children themselves. The teacher, from being a tyrant, has become a friend and helper. The teacher's object now becomes to stimulate the child-

In her public lecture in Kronborg Castle, Dr. Maria Montessori pointed out that whereas most educational reforms aimed at research with a view to finding better ways of guiding the child, her method aimed at ceasing the effort to guide him in order that he might guide and educate himself. This necessitated logically a child-environment, and a transformed teacher.

The Dalton Plan.

The Conference members generally greatly appreciated the opportunity of hearing Miss Parkhurst explain personally the Dalton Plan, now world-famous through her book, " Education on the Dalton Plan ". Miss Parkhurst in her lectures emphasised the need for making the whole school into a social community, so that co-operation would be possible not only between members of one class, but between older and younger children, each age having something to gain from the other. Living in this way the acquiring of fresh knowledge becomes a real experience and the children gain that balance and self-control which it is so important they should acquire in pre-adolescence.

The Project Method.

Mr. Burton P. Fowler, Head Master, Tower Hill School, Wilmington, U. S. A., a well-known believer in the Project Method, was the leader of a course of this method of Purposeful Activity. In his lecture, he declared that such external means of educational control as rewards and punishments fail to stir the child, and he advocated control " by purpose and by conscious interest arising from the nature of the situation ". Mr. Fowler said that the task undertaken should whole-heartedly be the pupil's own. He should share in the plan of doing it and have some choice in the actual performance. " Purposeful Activity " implies learning for the present life instead of learning in preparation for the future—*i. e*, one learns by a succession of discoveries and investigations rather than by a ready-made system of ideas, transmitted by medieval scholastic methods.

mously by the delegates, many of whom were of opinion that any real educational advance would be difficult, if not impossible, until existing examination systems were reformed or abolished. The following are some of the conclusions arrived at by the Committee :—

"The nations are more and more tending towards protection and education of children and youth up to 18 years of age for all the population, rather than for a selected few. For this reason an examination should not be the determining factor in the question of providing further education for children and youth after the first five or six years of schooling or at any other period in adolescence. Instead, a normal progress into secondary education should be provided for all children, the determining factor as to the kind of education to be the needs and the capacities of the individual, and the requirements of society. The imposition of an examination by a university or any other institution upon pupils not proceeding to the institution concerned is to be deprecated."

"As to examinations for entrance to universities and higher technical institutions, it will undoubtedly be necessary to devise more adequate methods of selection than we now have. University and other authorities should give careful consideration to the body of recent evidence indicating the unreliability, for determining intellectual fitness, of the traditional examination alone, and the desirability of the candidate's ability to profit by university study, such as the judgment of the teachers and the record of school work. Experiments that have been made in practically unrestricted admission to university study in several countries should also be examined for the light they may throw on the whole problem".

The Montessori Method.

An outstanding figure in the Conference and one who attracted a great deal of attention both as being the founder of one of the newest systems of education and through her charming personality was Dr. Montessori with whom I had a most interesting conversation in Italian at a dinner given by the Indian delegates to some of the well-known members of the Conference. During the Conference, she held a Montessori Congress which was attended by Montessori teachers from many countries.

The Groups and Study courses together with special lectures were presented by experts of international reputation and the leading issues discussed included such subjects as, Psychology, Schools in Action, Teacher and Parent Training, Philosophy and Social Conditions, Modern Developments in the Practice of Teaching, Psycho-analysis and Creative Self-expression through the Arts

In his opening address Mr. G. J. Arvin, Principal of La Cour Vejens School, Copenhagen, said that the aim of the Fellowship was to combine law with liberty. He further remarked that "the woman and the mother best understand the child. Woman's emancipation and the emancipation of the child therefore go hand in hand." Speaking on the importance of self-activity, he said, "If we can succeed, through the child's self-activity, in achieving firmness and proficiency in the elementary subjects—reading, writing and arthmetic, and through the living word, in awakening deep and strong interests in life—then the way lies open for the living work, that is, that which springs from the active child's desire to create; and then we have succeeded in solving the greatest problem of education, which, according to Rousseau, lies in arranging so that body and soul, through their mutual work, constantly bring to each other fresh powers".

Dr. Adophe Ferriere, Co-Director of the International Education Bureau of Geneva, followed with an illuminating speech on. "The necessity of directing psychology towards the study of individuality". He laid emphasis on the fact that this development would depend on the increased knowledge of the child as an individual, as distinct from the child as one of the crowd.

Examinations.

Reports on Examinations were submitted from twenty-two different countries. The existing examination system in their respective countries was condemned almost unani-

The following plan for the study of a plant or an animal (bird, fish etc.) is offered for what it is worth. It has, to be simplified, of course, in the standards and the lower forms and may be elaborated in the higher forms by the introduction of "How's" and "Why's":

1. Form, structure and growth with reference to "Struggle for life" and "Natural Selection".
2. Ways and means of securing food and drink.
3. Methods adopted for self-preservation.
4. History of life from birth to death.
5. Distribution on the earth's surface.
6. Comparison and contrast with reference to groups and families.

The Fifth International Conference OF THE New Education Fellowship

BY

MISS A. E. M. POPE, M. A., L. R. A. M., A. R. C. M., M. R. A. S.,

Principal, Zennana College, Nampalli. Hyderabad Deccan.

We thank Miss Pope for sending us, at our request, a copy of her illuminating report on the Elsinore Conference. We regret that owing to pressure on our space, we are publishing only a summary of the report, and not the whole of it.—Editor.

OVER 2,000 delegates, representing at least 45 countries of the world, were assembled at the Fifth International Conference on the New Education held at Elsinore, Denmark, in August, 1929.

The programme for the unfolding and consideration of the general theme of the Conference was ably planned.

clay-modelling, kindergarten classes right through the school to the highest class, Nature Study could be taught in well graded groups of lessons. In the Primary Standards the subject may start with the simple and practical lessons in the modelling of familiar vegetable products and animals, or their drawing on paper, followed by object-lessons with wall pictures selected with a view to teaching types of the higher orders in animals and plants. The Lower Forms in the school may continue the good work, elaborating and filling in details and getting to know that the apparent chaos in the living world is amenable to orderly classification. The Higher Forms are then ready to appreciate the romance of plant and animal biographies, to realise that every point in their structure has some special purpose and to be able to understand and explain such hidden purposes in the economy of nature.

Nature Study coming out, as it does, from two sciences, Botany and Zoology, brings along with it, though in a subdued form, the critical and rational method of inquiry which is called the *Scientific Method*, and which is based on *observation*, *experiment* and *inference*. The pure Naturalist has carefully and assiduously gathered by observation a multitude of facts and has effected a rough classification too. Thus he has divided the animals of the forest into those that hunt, those that are hunted and those that neither hunt nor are hunted; birds into village and town birds, water birds, birds of the hills and valleys and so on; and the plants into food plants, beauty plants, luxury plants, medicine plants. The Zoologist and the Botanist have used the facts, checked them where necessary by experiments, have readjusted certain classifications and thrown the rest overboard. The student of Nature Study follows, in his own less rigorous way, the methods of these scientists. Like theirs his "ambition is not merely fact-collecting, but the puzzling out of Nature's great philosophy of which facts are merely the symbols."

Nature Study skims over the surface of it, caressing here, wondering there and seeking and finding delight everywhere.

For the purposes of Nature Study, life may be divided into the stationary, and the moving. Trees and plants, herbs and shrubs constituting stationary life are studied in Botany (Gr. Botane=a plant) and animals (vertebrates), birds, fishes, insects and others are discussed in Zoology (Zoon=an animal). Each of these sciences has descriptive subdivisions from which Nature Study draws its matter with fastidious discrimination.

A teacher of Nature Study need not be a specialist in Botany and Zoology; but a nodding acquaintance with them, especially with the important generalisations in them will make all the difference between the dryasdust narration of facts and the inspired description of life. Comparisons and contrasts are the very spice of all study and nowhere is it more strongly indicated than in Nature Study; and a judicious, intelligent admixture of this spice in the teaching of this subject is, it is feared, not possible without a fair grasp of the fundamentals of Botany and Zoology.

Nature Study in our schools, it has to be admitted regretfully, has been leading a Cinderella-like life. Studiously ignored in some schools, treated with indifference in many and appreciated only in a few, she is clearly in need of the ministrations of a Fairy! In countries where education is a living, throbbing, growing factor in national life, Nature Study takes an honoured place in all curricula. It forms an essential part of liberal education; it gives that other interest in life which is not reckoned in terms of Rs. as. ps. A man who has not had this liberalising leaven in his education, leads only half-a-life: he goes into the Public Garden, sniffs, plucks and passes on; he goes into the Zoo and sees with unseeing eyes.

Where in our schools should we begin to teach this subject? Well, in the very lowest class. From the

Nature Study

BY

P. VENKATESULU, B. A.

Head-Master, Wesleyan High School, Secunderabad.

THE word *Nature* is ordinarily used to mean all that man perceives around him excluding what he himself has made and set up. To put it in the popular, picturesque manner, Nature stands for the world which the first man saw and forthwith began to take an interest in. The great and wonderful variety of animate and inanimate objects—the high, ice-capped mountains and the vast, heaving oceans; the wide, sandy deserts and the green, river-interlaced plains; the dense, gorgeous tropical forests and the wild, barren icy stretches; and above all, the prowling, scampering, waddling, creeping, wriggling and winging forms of life—must have cast a spell on our original man and urged him to take a closer stock of his heritage.

A comprehensive study of all that the word Nature signifies constitutes practically the whole of human experience and knowledge; and it is, obviously, impossible for a single man in a single span of life to master it. The subject has, therefore, been divided and subdivided under a bewildering array of scientific phrases. The main division of Nature is two-fold, the inanimate and the animate, the former being rolled in under the word Geology (Gr. Geo=earth; logos=discourse) and the latter falling in under the word Biology (Gr. Bio=life; logos=discourse). The scientific names of the many shoots that these main branches have thrown off have to be read to be appreciated.

"Nature" in *Nature Study*, as understood and taught in schools, implies one side of it, the animate side. Nature study is therefore Biology, but a very, very dilute form of it. While Biology runs through life, cutting, incising and probing in order to understand its origin and mystery,

with its " mould to stereotype " every child. It is conceded by all that this situation must be changed. Then how can we get the best for our school-going children in any respective area? In Hyderabad? One way would be to inaugurate a scheme of controlled experiments to determine the validity of the claims made for the new measures. Can children be made to "think straight" about individual and social problems by the newer methods? Do they make greater gain in power of self-control and self-direction? Can they actually perform life's duties and choose among life's wholesome leisure-time activities better than those who have not been subjected to the new regime? A school is wanted that will serve at once the demands of society that the immature shall be prepared for their responsibilities and the needs of the individual for opportunity to live and grow. This might well be the task of the educational innovators.

The task of the educational scientists might well be that of evaluating " progressive practices ". So many new ideas have been introduced into educational discussion and practice in the short preceding period of ten years that a stock-taking is in order. A scheme of controlled experiments to determine the validity of the claims made for the various new measures, in which both the innovator and the scientist work side by side would bring about an integration.

these two movements. On the contrary, there are all shades and degrees of variation from these central tendencies, but the line of cleavage is nevertheless clearly marked.

Everyone knows there is widespread popular belief in "science" as the instrument that shall finally answer all our questions and relieve us of all our woes. It has already so far transformed our ways of living and of satisfying our want that a general belief in its universal efficacy is not to be wondered at. That the findings of science should, therefore, appear to assume the indefinite continuance of the common school as we know it, with many minor changes making for the economy and efficiency but no fundamental reform, is of great importance. The impression that conventional practices are in the main justified tends to perpetuate them. Thus science, which once promised to be revolutionary in its effects on education, turns out to be a stabilising force.

Meanwhile, with certain exceptions, those responsible for new ventures in subject matter have gone their way with little regard for educational science, either in projecting plans or in estimating their results. Depending upon their own experience and observation and guided by certain ideals as to child life and growth, they have founded schools, developed programmes, and attained to a following with only empirical sanction.

As a principle it is generally accepted that, consistent with the range of experience and experiment in any given field, the best practices will eventually emerge as those most suitable and acceptable and will be preserved, while the other practices will be discarded. On this principle it would seem that the time is ripe for the two above movements to get together. Each would have its distinct contribution to make to the general field of education, losing nothing worthwhile preserving, and in this way make for an invaluable and indispensaible integration. Enough attempts have been made to break away from the old school

Suggestion for Integrating the Contributions of the Educational Innovator and the Educational Scientist

BY

F. WEBER, M. A., B. P. E.

Director of Physical Education for Colleges, Hyderabad Deccan.

A "high light" thinker in the field of education recently pointed out that, generally speaking, in every country where efforts were being made to bring into practice the tested best educational methods, devices, philosophies, and practices, there came into existence as a result two contemporary movements operating separately and independently of each other. The exponents of these two movements may be characterised roughly as the "innovators" and the "scientists". The former advocate the establishment of "experimental" schools, the abolishment of traditional subjects of study and these to be replaced by "centres of interest" to provide opportunity for spontaneous and creative expression. They stress the social organisation and the social life of the school. The latter give their attention to a search for facts upon which to base the selection of subjects of study for the curriculum, the classification and promotion of pupils, the arrangement of repetitive exercises, the judgment of the efficiency of teaching and the like. The innovators are much concerned with educational philosophy, the principles of progressiveness, the rights of the child, and the betterment of the social order. The scientists are often sceptical as to philosophy, rely rather upon such factual data as come out of mathematics and laboratory procedures, insist on the necessity of handing on the social inheritance, and in general would refine upon the school programme as it is rather than make radical changes in it. It is not suggested that all school men, and all school women, find themselves definitely in one or the other of

metals, and many other metallurgical problems, water raising, fuels, artificial seasoning of timber, etc.

Hostel Accommodation.— A scheme has already been placed before the Government with regard to the erection of a hostel to house a certain number of students who otherwise have to travel daily from a great distance. At present, due to lack of funds, this scheme is temporarily held up, but we have every reason to hope that, when the actual Institute buildings themselves are complete, the Government will be able to grant funds for this purpose. This, of course, opens up innumerable possibilities with regard to the extension of the Institute's social activities which are at present very restricted.

Conclusion.—The curriculum is designed to provide what is necessary for the various classes of men it sets forth to produce. Men who are going to advance must master the various elements of their trade, profession or calling.

Few men or nations have become truly great or prosperous all at once. Greatness and prosperity are generally the result of continuous steady effort.

The Osmania Central Technical Institute has nothing to offer to those who do not realize thoroughly that their rewards will only come through hard work, physical or mental or both. It stands for all that dispels atrophy and apathy and teaches that the state of motion is more natural than the state of rest.

Boys from many different classes will come to learn how to make their way in life and from these it is hoped that there will evolve many self reliant and able Engineers and fine specimens of manhood who will realise at all times how much the good in mankind counts, and who will be a credit to the Institute, to His Exalted Highness the Nizam's Government and to India.

grant bursaries in accordance with a certain scale to poor and needy students in accordance with the recommendations of the Institute authorities. In addition to this, the first two boys in each class are awarded scholarships for the ensuing year on the results of the annual examination. In order that each student at the completion of his course may have a small sum with which to face the world, one third of each scholarship and bursary is retained each month by the Government and paid over to the student on the completion of his course. The Government, however, does not pay over these savings unless the student completes his course to the satisfaction of the authorities.

Future Expansion.—Our immediate hope of future expansion lies in an application already before the Government for the extension of our buildings and for the granting of a large sum in order to purchase sufficient Mechanical and Electrical machinery to equip some very fine heat engines and electrical machine laboratories. These laboratories will enable our students to obtain practical experience with the machines quite equal to that obtainable in the largest Technical Colleges in England. From the point of view of knowledge, therefore, there is little need for any student in the State to go to England for ordinary Mechanical or Electrical Engineering training when practically as good a training can be had within the State. When our students are sufficiently advanced, we hope to be able to place the more intelligent ones on industrial research of a very practical and commercial nature. To give only a few examples, there is great scope for research in the investigation of the Foundry cupola and the reactions which take place in it, the various temperature effects produced, the most suitable fluxes required, etc. The chemistry of moulding sands and the reaction between them and hot metals is another suitable field. Again, other fields for investigation include the effects of Thermal treatment on steels and metallic alloys, electric deposition of metals, welding of

Accounting and in General Office and Administrative work, thus completing the training necessary for a High Grade Engineer, who will be fit to work his way quickly into a really good and responsible position in the Engineering World.

It is believed that in this way there will be produced good Workmen, good Designers, good Organizers, of strong personality, expounders of new ideas, quick, accurate, punctual and thrifty, who realize how very valuable five minutes can be, and who can always reconcile economy and efficiency.

At present, unfortunately, a large proportion of our students are drawn from the lower social classes and it is the strong desire of the Institute to encourage, as far as possible, a better class of student, although it will not, of course, close its doors to any suitable applicant from whatever class of society he may come. I would like to appeal, therefore, that more students seek admission from the better and intelligent classes in order that the Institute may give the benefit of its unique facilities to a larger number of students in the Higher Courses.

Age Limit.—It is essential that any Indian contemplating engineering should become used to an Engineering atmosphere at as early an age as possible. For this reason, the Institute will not accept for training any boy who is fourteen years of age or over, since it is a general, but regrettable, experience that boys over that age are not prepared to do the necessary manual work which a practical engineering training demands.

Remuneration.—All apprentices receive remuneration for the work done in the Workshops in accordance with a certain scale of pay, provided that their reports are satisfactory. Boys, therefore, obtain the added stimulus of earning pay for the work produced.

Scholarships.—In order that poor boys who badly need assistance may be able to continue their studies in the Institute, the Government has been graciously pleased to

(*b*) Blacksmiths (*e*) Fitters (f) Machinists, or (*g*) Electricians or Electrical fitters. It is hoped in the near future to develop special courses for these students beyond the Second Year Apprentice Class; these courses will be known as Trade Courses and will aim at giving a more technical instruction and insight into the theoretical considerations which surround the individual trade of each artisan. Thus boys in the Foundry will be given special instruction in the theory of Foundry practice and will be given explanations of many of the facts which they have learnt by practice to be correct, but for which they have not as yet had a technical explanation. Boys trained as carpenters will be given instruction with regard to the natural and artificial seasoning of timber, and so on, for the various trades.

(*B*) Those who after the 2nd year show signs of being able to take advantage of more education will be passed into the 3rd and 4th Apprentice Courses at the same time continuing Workshop Apprenticeship with a view to becoming (*a*) Foremen, (*b*) Designers and Engineers.

Those students who have passed through the whole of the Apprenticeship course as regards both school and Workshop Training, and who are likely to be of most use as Foremen, will be given additional practical training for a period of one or two years in the Drawing Office, on marking off work, etc. or, in the case of Foundrymen, cupola charging and general metallurgical work connected with the Foundry, the idea being to give insight into those matters which are not easily learned in practising the particular crafts but the knowledge of which is very necessary to a man who will have later to supervise and work in the capacity of a Foreman in his trade.

(*C*) Those students who have a capacity for mathematics and higher mechanical theory will be given higher technical training, corresponding to that given in Engineering Colleges, while they will spend five years in Drawing Office work, Estimating, Preparing Specifications, Cost

and later in the Electricity Department. In the latter department they obtain educational training in Power Station work such as Boiler House practice, Engine Driving, Turbo-Alternator operation, Switch Board operation etc., as well as practical testing and repairs of electrical machinery in the testing section such as the Stripping and Rewinding of Electrical Machines and Starters, examination and repair of electric contactor gear, examination and calibration of electrical service meters, etc.

The Electrical Engineering students are also given experience in transformer practice in sub-stations and are often allowed to accompany the men to breakdown jobs on the line.

Classes of Students.—According to the intelligence displayed by the students in their progress through the Institute, they will naturally fall into three groups according as they are fitted to be (*A*) Artisans, (*B*) Foremen or Chargehands and (*C*) Designers and Engineers.

The general policy of the Institute will be to give every student the opportunity to pursue studies and practical training to the full extent of his capabilities. It is not likely however that of those who start in the First Year Apprenticeship Course more than 10 per cent to 20 per cent will be able to continue through all the Apprenticeship classes.

(*A*) Attendance in the first two of the Apprenticeship Courses will be sufficient to give those who will be of most use in the world as artisans sufficient literary and general Technical Education to enable them to follow their trade which they will continue to learn in the capacity of Workshop Apprentices only, for four years more, *i. e*., 6 years in all—2 years combined Workshop and School, then 4 years in the Workshops. They will then be ready to take up employment as skilled Craftsmen in any part of India or elsewhere as (*a*) Pattern-makers (*b*) Moulders (*c*) Carpenters

The Apprenticeship Course of four years is a continuation of the Preparatory Course. The work done in this course is equal to that of a good Secondary School. The subjects taught include Urdu and English, Elementary Mathematics, Physics, Chemistry, Mechanical Drawing, Magnetism and Electricity. The final examination of this course is the entrance examination of the Diploma Course and is of a standard, especially in scientific subjects, slightly higher than Matriculation.

Diploma Course.—This Course extends for five years and is modelled on the Higher National Certificate and Diploma courses in Mechanical and Electrical Engineering organised by the Board of Education in England and the Chartered British Engineering Institutions. The standard required for this course is a very high one and therefore only the very best students are admitted to the course. The course is divided into two sections :—

(1) Mechanical Engineering Diploma

(2) Electrical Engineering Diploma

The first year of the course, however, is common to both Mechanical and Electrical Engineering students. At the successful completion of the five years' course, a diploma is awarded. The Institute is yet young, and no student so far has proceeded to the diploma, since, at present, only the first two years of the course are in operation. It is expected, however that after a short time the value of the diploma will be recognised on account of the ability of the students to whom it will be awarded.

Practical Training.

Mechanical Engineers.—This is carried out in His Exalted Highness the Nizam's Mint Workshops. The departments are—Carpentry, Painting and Polishing shops, Pattern shop, Foundry, Blacksmithy, Fitting shop, Engraving shop, Carriage and Motor Repair shop, Drawing Office and Progressing Department.

2. *Electrical Engineers.*—These students obtain practical training for a few years firstly in the Mint Workshops

Students spend half the day in Workshops or Electricity Departments, the other half in the school. The course is, therefore, run on what is known as the SANDWICH system where theoretical and practical training are interwoven, and diplomas and other awards are granted on the combined merits acquired during both trainings. It has been previously shown that both theory and practice are essential to the successful engineer, and there are several methods by which an engineer acquires this training. Some proceed straight to University and Technical College after leaving school thus acquiring a theoretical training before a practical one; some proceed to an Engineering Works for some years before entering University and Technical college, thus acquiring a practical training before a theoretical; and some, as in the case of students of the Institute, acquire Theoretical and Practical training simultaneously. Much discussion has arisen regarding the relative merits of these various systems and it would be too long to discuss them here. It is sufficient to say that the Institute authorities after very careful consideration thought it best adopt the last mentioned method, namely, that of the SANDWICH system.

The Institute courses in Theoretical Training are split into two main groups. (1) School Courses, (2) Diploma Courses. The School Courses are themselves split into two main groups; (*a*) Preparatory Course and (*b*) Apprenticeship Course.

The Preparatory Course starts from the very beginning of education and is divided into five classes known as Preliminary Classes. At the conclusion of this course the students should have attained a standard equal approximately to Form 3 of the Middle School in the Educational Department. The subjects taught are Urdu, English, Geography, History and Arithmetic.

The work of the Institute is confined, initially at east, to the mechanical and electrical sides of Engineering and one or two allied trades, the chief aim being to provide a training ground for those who are to become Fitters, Machinists, Blacksmiths, Foundrymen, Carpenters, Electricians, Electrical testers and operators, Draughtsmen, Designers, Superintendents, Managers and Owners of businesses. Every effort is being made to provide the most suitable training—practical and theoretical—for every individual student. How much the activities will be extended beyond Mechanical and Electrical Engineering will be a matter for future development.

Training Primarily to suit conditions in India.—No attempt has been made by the authorities of the Institute to follow the orthodox methods of training. It is very evident that a curriculum both practical and theoretical must be framed to suit India, not Europe or America. A short concentrated training is not considered to be the thing for youths of India, especially those who are to become properly qualified engineers, as distinguished from craftsmen. General mass production in India seems to be a thing of the future. For years to come the majority of the Indian engineers will have varied problems to deal with, and, therefore, the training must be of an all-round nature, hence necessarily protracted. The course provided will have the advantage of enabling the Osmania Central Technical Institute trained men to take up positions in more than one specific line, should trade fluctuations, etc., render this necessary.

Constitution.—The Institute comprises

(1) Technical College

(2) Commercial Engineering Workshop, Electricity Power House and Testing Departments.

If School or College and workshops are apart, the student rarely gets the opportunity while in training to make profitable application of theory, which in Engineering is so highly important. A student may "design" many things from nuts and bolts to electric generators, but if the design never materialises, it is of little value. Normally the student never knows whether his designs are good or bad, because they are never tried out. On the other hand, if he has to design for actual production he soon realizes the difference between good and bad design. A wrong analysis may go undetected in the laboratory, but if it is put to test in the Foundry, it will soon be found out, though probably not before lots of damage has been done and loss involved. Instances of this kind could be multiplied many times over. There seems little reason to contradict the contention that the best form of training for Engineers is that which gives a youth the opportunity of thinking out and then carrying out his work by up-to-date profitable commercial methods. Only those who actually manufacture know of the hundred and one little and big things which the Designer, Draughtsman, Estimator and others often overlook.

The question of the purely commercial side of business is rarely entertained either by student or professor in most training colleges unless in classes specially conducted for the purpose.

OSMANIA CENTRAL TECHNICAL INSTITUTE.

H. E. H. the Nizam Orders the Foundation of the Institute.—The consideration of such matters as have been briefly touched upon in the foregoing pages led His Exalted Highness the Nizam to exhibit his profound interest in the advancement and welfare of the State by establishing in Azoor 1332 Fasli (October 1922) the Osmania Central Technical Institute in Hyderabad which he was graciously pleased to order should be given the distinction of being called after himself.

The majority of Engineering Colleges and Institutes confine training almost entirely to the theoretical side, devoting only a small proportion of time to Drawing Office and Laboratory practice, students having to acquire their practical knowledge in some commercial workshops where interest may or may not be taken in their progress. Some Institutes have small workshops attached but few even attempt to make the workshops a commercially paying concern. If an Indian student is fortunate enough to be able to afford an all round works training in England, well and good, but obviously the majority of such young men cannot be supported through such a training.

Too much stress cannot be laid on the importance of the combination of theory and practice. On many an occasion one hears of a thing being all very well in theory, but no good in practice. But in practically every case the thing is really not very well in theory, as generally theorists base their hypotheses on ideal conditions which can never possibly actually exist. The ideal theorist overlooks many points which are exceedingly important in practice, just as the practical man very often to his own cost is either ignorant of or passes over points which are really essential and known very well to the theorist. Without doubt the man who combines theoretical and practical knowledge is the man who makes the successful engineer. The full significance of this matter is brought home more and more to the mind of a man as he progresses in his profession. In commercial workshops figures are computed and drawings are made and passed out to guide manufacture and if found to be wrong after much money has been spent, people are at once brought to book, learning a lesson thoroughly well even if perhaps paid for dearly. The need for absolute accuracy in every phase of planning and designing is manifest in every workshop. This is a point which is not often brought home fully to the young man in training.

raise the general status of the average Indian householder to anything approaching that of the European or American will mean a tremendous amount of industry and expenditure of energy. Progress, without that break-neck competition existent in countries which are perhaps for the time being over-industrialized, is natural and necessary in this world. India is always likely to be a country in which agriculture takes first place, but material betterment must be brought about by industrial and scientific activity and application. This advancement necessitates in the very first place able and trained men of all trades and professions. In the Engineering Industry, Workers, Supervisors, Designers, Administrators and Organisers are required.

Although the present demand is large, the turning out of technical scholars and high class craftsmen will not be all that is required to better India. Progress calls for a great increase in general industry and private enterprise.

Theory and Practi e.—In all parts of the world it has been demonstrated time and again that the demand for the purely theoretical engineer is strictly limited. So call-ed engineers have been turned out of colleges and found themselves unsuccessful in finding employment and have sought to express their grievances in many ways. The fault is not that their training has been wrong—it has not been complete. The thing aimed at is too often a degree or grade, instead of personality, creative progressive and business powers. It is no exaggeration to say that the practical is at least as important as the theoretical or technical side of engineering. A successful engineer must be thoroughly trained and experienced in both. No person capable of judging would ever attempt to disparage the importance of a University degree, in so far as it represents a certain amount of work done and standard attained. It or its equivalent is highly essential for those who are to advance in higher work, though it is not the be all and end all of training.

business courage to increase rapidly, resulting in an expansion generally of industry and thereby the enrichment of the country. The shortage of small and large capital will gradually cease to be so acute. A steady growth of financial strength will be the outcome of continuous effort.

Creating greater demand for all kinds of things should be very easy in India, the demand now being so small. The poorest of the poor is a strange person indeed if he does not feel that he wants to do or get more in the world. The blessing of contentedness is a great one, but contentment without ambition of any kind is unnatural. Of course, a nation cannot allow its poorest people to set its standard of living. India, like every other country, must let its ablest exponents decide what is best for its people. Any other policy must eventually mean retrogression and chaos.

When the ryots are convinced that iron ploughs give much better results than wooden ones, there should be a market for at least a million implements—ranging in price from say Rs. 10 to 60, the total cost being 200 lacs at an average price of Rs. 20 each. If one in every 40 persons in India procured a bicycle the overturn would be Rs. 10,000 lacs. (In America the proportion at present is one car for about 8 persons, while production continues at a prodigious rate). The building of 20,000,000 two-roomed houses at Rs. 100,000 and Rs. 200,000 lacs respectively. These figures would increase enormously with increase in quality and size of the houses. Installing an electric fan and a few electric bulbs in half the houses in India would involve a sum of something like Rs. 50,000 lacs, to say nothing of the necessary expenditure for electricity supply. Numberless such examples could be given. These few are cited here merely to suggest the possibilities of industry in India rather than immediate needs.

In, say, America, the average householder demands much, strives for much and generally gets much. In India he has demanded little, striven for little and got little; but evolution is a ruling force in India as it is in America. To

its men to develop the scientific and engineering frame of mind. Today there is in Hyderabad, and India generally, the need for all classes of men trained in Mechanical and Electrical Engineering, from craftsmen to highly skilled engineers.

Those who are responsible for turning out engineering work of any kind in India understand well the difficulties of obtaining skilled labour and Supervisors, while Designers are almost unprocurable.

Scope for Industry.—India is essentially an agricultural country. At present, however, agriculture is by no means properly developed. The engineer and the scientist play very important parts to-day in the production of better crops. The more that Agriculture, Science and Engineering are brought into collaboration, the greater will be the produce, and the better off will be mankind. Gradually agriculturists are beginning to discover the advantages of modern over ancient methods, and to realize the import of the word " efficiency ".

The great problems of irrigation, sanitation and famine relief measures involve a considerable amount of Mechanical as well as Civil Engineering. The utilization of India's mineral wealth lays open vast fields for industry. Without thinking of the greater potential needs of the future, the present actual requirements are such that training centres are necessary. To obtain these results good Mechanical Engineers and many of them are essential.

The chief problem confronting the manufacturers in India today is to induce people to buy, the main reasons being conservatism, the very obvious shortage of money, and lack of confidence in (*a*) mechanical methods and (*b*) India's mechanical products. The spread of knowledge assisted by the placing of Mechanical and Electrical Engineers in the districts to supervise machinery, backed by genuine efforts on the part of the manufacturer, will induce confidence and

Some Aspects of Technical Vocational Training

BY

C. E. PRESTON, M. ENG., (LIVERPOOL), A.M.I.E.,

Vice-Principal, Osmania Central Technical Institute.

Introduction: The need for Engineers and skilled Artizans in India.

THE wealth and well-being of a nation depend very largely upon how much the people of that nation work. A nation's industrial and engineering activity may be accepted as a measure of its progress and general status in the world to-day.

Gradually the people of India are increasing their individual demands for betterment. The satisfying of such individual demands determines the extent of progress in the Engineering world. If people are contented to remain where they are in life, Engineering too may well remain where it is, but that means the contradiction of the greatest of all natural laws, the Law of Evolution. The majority of even the most simple minded and contented men have a natural tendency and desire to rise to higher levels in life.

For many years India has produced Civil Engineers and utilized their services, the training having been acquired in India and abroad, and the experience almost entirely in India. The importance and extent of these services are too well-known to require elaboration here.

So much cannot be said of India's Mechanical and Electrical Engineers. In Hyderabad the absence of a Mechanical and Electrical Engineering institution of any kind has been particularly noticeable. No State of the size of Hyderabad can possibly advance to the forefront of progress unless possessed of facilities for training a large number of

courageously set the example, inspectors may stimulate and suggest, but the onus of the work lies on the great body of assistant masters, often hardly worked and poorly paid, but ever the back-bone of our educational service. To the young man who looks on the teaching profession as a fairly easy path in life, with short hours and frequent holidays, I say 'Go back! We do not want you here!' The good teacher must be a combination of the missionary, scholar priest, and leader; he must have the capacity for utter subordination of self in the interest of the state whose future citizens it will be his duty to train. Let him keep in mind the exact meaning of the word *educate*; the Latin *e-ducere* signifies 'to draw out,' which is to say that his work will be to draw out and expand the individual threads of character and personality which exist within every boy. And this is a 'full-time job,' where only the self-sacrificing teacher with high ideals is likely to succeed. Mr. Paton, the late Head-mater of the Manchester Grammar School, believed that three fourthes of a boy's education took place outside the class-room. When engaging a young teacher, he would often remark grimly 'Remember that this school claims you, body and soul!' The intending entrant to the profession will, then, be well advised to reflect, and consider whether he has within himself the capacity for this work. If he has, then let him go forth with his script and his sandals like the apostles of old, that he may be a missionary of culture and light in the dull villages and the city slums. The material rewards may be small, but wherever he sows judiciously he will see a richer harvest springing up than falls to the lot of any other labourer in this world, and will have gained that treasure which is greater than rubies.

I have done no more than indicate a few of the lines on which this truly civic education may be conducted. It may be developed in accordance with the personal tastes, hobbies, and interests of the individual teachers. For, after all, there is no finer test of a boy's progress than to discover what he does with his own leisure time. If the teacher has a leisure occupation which supplies him with interest and relaxation, he will find its enjoyment doubled if he shares it with as many boys as possible. In that respect, a Saturday afternoon in an English school sees practically all the boys away under the care of some member of the staff; it may be on the sports field or out with the scout troop, surveying animal or vegetable life under the escort of the nature knowledge teacher, looking over some works or machinery under the physics master, or visiting some old battlefield in the company of the history master. Whatever the particular activity may be, all masters are agreed that it is in such activities that the good school master finds the shortest cut to the hearts of his charges. There is a feeling of brothership and *cameraderie* which is never possible within the four walls of the class-room, and the wise teacher comes to know his charges thoroughly in such work. The average boy is never quite at his ease, never quite in his natural element, during class-room work. He can keep closer than the proverbial oyster in concealing all his doubts and fears, his hopes and his aspirations, from the unsympathetic master. The shadow of examination looms large, and comes between master and pupil, so that both 'see through a glass darkly, and not face to face'. It is only when the class room is left behind for the freer atmosphere of the sports field and the scout-troop that this artificial barrier is removed, and when they return to the class room, lo, it is no more!

The practical question may then be asked, 'How is this type of education to be encouraged in our schools and colleges?' The answer is direct and easy; it can be done by the teachers alone. A capable headmaster may

brotherhood. It is no exaggeration to say that a good scout can never become a bad citizen. Where the scouting spirit is strong, the forces of Communism, of sedition, of Bolshevism, and all the other *isms* which are distracting our much-vexed world, fade away like the mists before the rising sun. The discontented citizen, the citizen who is constructing a bomb or howling down the speaker at a political meeting, all are citizens who never had the opportunity of reciting the Scout Law round the blazing camp fire.

There are many other activities within the school which serve to promote the growth of initiative and a feeling of responsibility within the boys. A great number of secondary schools in England now have assumed the responsibility of supporting a cot in some neighbouring hospital. In Harrow County School, the boys of the school are responsible for the permanent support of a cot in the Middlesex Hospital. The money is collected weekly in the class rooms by the Form Captains and Prefects, and no member of the staff intervenes in any way. The boys never fail, the money is always forthcoming, and whenever the cot contains a patient, his room is made bright with flowers and he is supplied with magazines and newspapers, and everything else which helps to cheer a bed of sickness. There is also in this school a strong savings club, by means of which each boy is encouraged to put aside some trifling sum of money each week. As this accumulates, a War Savings Certificate is purchased, or a banking account is opened for him, and, by the time he leaves school, the boy has come to realise the value of money and the usefulness of small efforts. Moreover the valuable co-operative spirit has been aroused, and individualism tends more and more to pass into the background. There is no limit to the variety of forms which this spirit may take. The boys of the Madrasa-a-Aliya have responded to it, and, by means of a small monthly subscription of less than two annas each, have raised a monthly scholarship by means of which the education of a needy student is paid for in the Nizam College.

sense of responsibility, and a feeling that self is only secondary when the interests of the community are at stake. And what finer lesson of citizenship can be implanted than this? The House System has now been fostered in almost every secondary school in England, whether residential or not. It adds a sense of unity, unselfishness, and *esprit de corps* to the life of every boy in the school. It brings four times the number of boys into school sports and games that the undivided school is capable of doing, and adds a healthy rivalry and stir that effectually prohibit any accumulation of educational dust.

When considering the dangers of excessive 'bookishness' in Education, a certain well known soldier tried to evolve a system of out-of-door practical training which would act as a corrective and tonic to school studies, and encourage the development of individual personality in every boy. The result was the boy scout movement which has immortalised the name of Sir Robert Baden-Powell. On this we must touch briefly, since otherwise our enthusiasm might overflow into many volumes. But the object of scout training is to make a boy self-reliant, courageous, courteous, without snobbishness and without any sense of inferiority. He is taught to fear God and obey his superiors, to look on life as a great opportunity for doing good to others, and to lead such an existence that the world is made a better place by his presence in it. The movement has spread throughout the whole civilised world; barriers of caste and creed, seas and schisms, are falling down before the fair clean wind of brotherhood which blows wherever the scout rears his flag. It seems not an exaggeration to say, at this stage, that the High School without its Scout Troop is an incomplete School, and will soon be as unknown as any other of the obsolete things of the earth. Already in our State is the Scout Badge a well known sign of which few now need to inquire the significance, and a band of willing workers is engaged in uniting the coming generation in the bonds of

aside and watches the process, being ready to help in case of difficulty or encourage in event of success. The well known Tiffin School in Kingston-on-Thames is now conducted entirely on that principle. A glance at one of the form-rooms is instructive. The boys are working, each at his own separate desk. Each will be found to perform his allotted task in a serious and conscientious manner. If a boy wishes to consult another boy, he does so in a natural manner; if he wishes to leave the room, he goes without asking permission, for each boy is strictly on his honour, and not one would think of abusing the privileges which have been given. If the teacher finds it necessary to leave for a few minutes, or for a full teaching period, the work will go on as usual, and there will be no mischief or loss of time. The results at examinations have been very good, at least as good as in schools pursuing the conventional methods, and the gain in initiative and ability on the part of the boys has been striking.

Without advocating the universal adoption of the Dalton plan, which is still, in many respects, in the experimental stage, there are many institutions and societies within the school which produce the very highest results in character formation, though their results may not be capable of measurement by written examination. Of these, first and foremost comes the House System. This was originally a product of the resident public schools of England. The boys of the school were divided up into several actual houses or buildings, each under the care of a particular master. They lived, ate, and slept together, and the house would take its name from the master in charge, being known as 'Smith's House' or 'Jones' House' as the case might be. The result came to be that the boys looked on themselves as a distinct little community within the school, and each boy was encouraged to feel that it was his duty to uphold the credit and honour of his house in study, in games, and in conduct. Such a feeling invariably breeds a

Teacher. "Does every horse run in races?"

1st Boy. "No, sir."

Teacher. "Then there must be different kinds of horses. Teacher writes on the blackboard: 'race—horse;' 'cart—horse.'"

"Now what do you know about this first kind of horse?"

2nd Boy. "That it runs in races, sir."

Teacher. "And what about the second one?"

3rd Boy. "That it is a horse which draws carts, sir."

Teacher. "So you can say this about these two horses, and yet you could not tell me much about the first horse that I placed on the blackboard. What has made the difference?"

4th Boy. "The words 'cart' and 'race,' 'sir."

Teacher. "Well the words 'cart' and 'race' are adjectives. I want you all to take your pencils now, and write down for me what an adjective is."

Then will follow a variety of efforts. The definitions will vary, but in general the boys will realise that an adjective is a word which tells us something about another word, or gives us some hitherto unknown quality of the object to which it is attached. The definitions may be feeble, faulty, and incomplete, but the essential point is that they have been framed by the boys themselves. There has been exercise of the creative process, and this basic point of grammar has become an enduring item of the boys' knowledge.

Consideration of this basic educational principle led to the formulation of the Dalton plan. The aim, stated as simply as possible, is that the boys do all the work. The teacher supervises the class, and prescribes portions of work to be completed within a certain time. Then he stands

appeal to the teacher only when actually in need of help. The inductive method of teaching is indispensable here. The teacher will never tell a fact or make a statement if he can possibly avoid it; he must create a line of thought in the mind of the pupils which will lead them up to the discovery of that fact or the formulation of that statement for themselves. The knowledge which the pupil finds out for himself will form an enduring and serviceable part of his mental equipment, long after the memorised or dictated facts from the lips of the teacher have faded away into the misty land of forgotten and valueless things. Here is a simple contrast of the old method, and the inductive :—

Deductive Teaching.

Teacher. "Write this down in your note-books: An adjective is a word which qualifies a noun. It supplies some extra information about the noun. Can any one give me an example?"

Class. Remains silent.

Teacher. "Well, take the word 'horse.' If I say 'horse' you only think of a four-legged animal. But if I say 'white horse' you know something more about it. So the word 'white' is an adjective."

Inductive Teaching.

The teacher writes the word 'horse' on the blackboard.

Teacher "What does this word mean to you?"

1st Boy. "An animal, sir."

Teacher. "What kind of animal?"

1st Boy. "An animal that draws carts and runs in races, sir."

Teacher. "Does every horse draw carts?"

1st Boy. "No, sir."

and mere negation of the child's desires and impulses is the first and direct method towards stunting personality in the very bud. No age is too young for the development of Initiative, and, even at the age of four, a judicious mixture of encouragement, praise, and suggestion will make the child do things from a sense of pleasure in doing them, and not as a disagreeable duty imposed upon his will from without. So the germ of a sense of responsibility and independent action is planted, with infinite possibilities of beneficial growth. Such qualities as courage, patience, a sense of justice, a quick wit, are not accidents in a man or woman, but are produced and developed by proper guidance and leadership on the part of the teacher at this tender formative period of life. Such being the case, every primary teacher should be a citizen of the highest type ; he or she should be fully trained in the principles of child-psychology, and should be conversant with the methods of the best teachers in the best schools in the country. He or she is a master-craftsman occupying a post of the first importance, and should be selected accordingly.

The headmaster of a prominent English public school has made the assertion that any criticism which may be passed upon the character, personality, and abilities of a boy at the age of eleven will be found to hold good at the age of twenty. This is carrying an acknowledged truth too far. Though the great formative period is before the age of ten years, there remain infinite possibilities of development and expansion within the high school. Here we may enter into a consideration of some of the lines of education in the English Secondary School, as far as the production of good men and women is concerned, and not merely a good pass list in the examinations.

In the first place, the methods pursued in Form I of the High School have usually one main end in view,–that the boys should be encouraged to work independently, to think for themselves, to find out things for themselves, and to

the effect that the aim of education should be the formation of character. Let us see of what qualities this desirable character consists, and how they are to be produced.

An authority on child-psychology has stated that the child at birth is like a sheet of white paper, on which the educationist can write what he likes; again the child has been compared to a piece of soft and plastic clay which can be moulded into any shape or form at the will of the teacher. But undoubtedly the researches of modern teachers show that the paper does not remain white indefinitely, or the clay soft and plastic, for something good or bad must soon appear on the virgin whiteness of the scroll and the clay will harden into some form, fair or otherwise. This formative process, infant teachers have agreed, seems strongest between the ages of one and ten years, and more particularly so between the ages of three and seven. Hence the most important years in the education of the citizen should be those spent in the Primary School, and it is there that we would expect to find the most scientifically trained, the most highly-qualified and paid teachers. But it is with deep regret that we look around and find that such is far from being the case.

Now what is the process which commences when the child of four first enters the portals of the Primary School? The child is a mass of un-coordinated actions and activities. Every impulse is at once translated into action without the intermediate reference to reflection and consideration. Life is a brightly coloured round of unrestrained movement and unlimited realisation. Into this life of joyous freedom there must now come a measure of Discipline. The child has to learn to sit still for short periods in company with others, to put an end to activity when requested to do so, and to obey the dictates of another's will. Here the good teacher will make the child want to do such things; he will gently lead the current of superfluous and spontaneous movement into the proper channels. For this must never be suppressed,

Education and Citizenship

BY

W. TURNER, M. A.,

Principal, Nizam College.

THAT the aim of education is to produce the highest type of citizen for the State is a truism which we may admit without discussion. This was the axiom assumed by such time-honoured educationists as Aristotle and Plato. They assumed that there were two great responsibilities within the social contract:—The duties of the State towards the individual, and the responsibilities of the individual to the State. It is the duty of every man and woman to become a good citizen, contributing the greatest possible amount to the welfare and progress of the race, and it is the duty of the State to supply the best possible training whereby each man or woman may become such a type of citizen. Aristotle laid particular stress on the need of what he called 'harmonious development,' that is, an all-round training of the individual in which each part of him should be enabled to attain full and complete development, and in which no faculty or power should be neglected. He formed a rough and ready division on the lines of 'Music for the body and gymnastics for the soul,' by which he indicated that man is a compound and intricate animal, composed of body and mind, and that the physical health and fitness of the individual is at least of as much importance as the training of the mind. But, leaving aside the temptation to expand this text so dear to the heart of the physical-culturist, the ancient Greeks and Romans concentrated on the production of good character and strong and healthy bodies. There is hardly a day on which some Educational Association or other does not meet in India, and pass a pious resolution to

THE HYDERABAD TEACHER.

October—December, 1930.

CONTENTS.

REGISTERED ASAFIA NO. 47.

Vol. V — October 1930, A. D. — No. 2

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan, Esq., M. A.,

Director of Public Instruction.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff

S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab.)

F. C. PHILIP, M. A.

SECUNDERABAD-DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD,

1930.

Annual Subscription Rs. 3.

جلد ۵ شمارہ ۳

رجسٹر شدہ ٹپہ سرکار عالی نمبر ۴۷

اسفندار ۱۳۴۰ف م فبروری ۱۹۳۱ء

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا ماہی رسالہ

دائرہ ادارت:

سید علی اکبر ایم اے (کنٹب) مدیر مسئول

سید فخر الحسن صاحب بی اے بی ٹی (علیگ) مدیر

محمد عبداللہ صدیقی بی اے بی ٹی علیگ [illegible]

مقصد

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس علمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات علمی کو شائع کرنا۔

(۳) فن علمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد و ضوابط

(ا) یہ رسالہ ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسۂ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)

۲۔ صرف اردو حصہ (عہ) سالانہ

۳۔ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲ار) صرف اردو (۸ر)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔

(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہیئے۔

(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہمارے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـــہ	صہ ۸ر	سے
نصف صفحہ	صہ	عہ ۱۲ار	عہ ۸ر
ربع صفحہ	لعہ ۸ر	عہ ۶ار	۱۵ر
فی سطر	۱۰ار	۸ر	۶ار

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

حیدرآباد ٹیچر

جلد ۵ شمارہ ۳

اسفندار ۱۳۴۰ف م فروری ۱۹۳۱ عیسوی

افتتاحیہ

ہمیں آل ایشیا کانفرنس میں مسٹر ننگ ایم۔ اے (کلمبیا) نمائندہ چین کی تقریر سننے کا بھی اتفاق ہوا۔ موصوف نے چین کی مروجہ ثانوی تعلیم کا ذکر کسی قدر وضاحت سے کیا۔ ایک بات جو ہم اُن کی تقریر سے اخذ کر سکے یہ ہے کہ چین میں دو قسم کے ثانوی مدارس ہیں جنھیں جونیر مڈل سکشن اور سینیر مڈل سکشن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اول الذکر بعینہ اُسی قسم کے مدارس ہیں جیسے کہ ہمارے ہاں قائم ہیں نصاب بھی قریب قریب وہی ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ وہاں چینی زبان سکھائی جاتی ہے تو یہاں اُردو۔ دوسری قسم کی مدارس یعنے سینیر مڈل سکشن، خاص ضروریات کی تکمیل کے لئے قائم ہیں اور ان کے مختلف شعبے ہیں مثلاً اُصول تعلیم، زراعت، تجارت، فنون لطیفہ وغیرہ مقامی حالات کے اعتبار سے جس قسم کے مدرسہ کی ضرورت جہاں ہو اُس فن کا مدرسہ وہاں قائم کیا جاتا ہے۔

یہ طریقہ ہمیں کئی لحاظ سے بہت پسند آیا اولاً یہ کہ ہمارے نصاب تعلیم اس مقصد سے تیار کئے گئے ہیں کہ طلبہ کو محض اعلیٰ تعلیم کے لئے تیار کریں۔ تحتانیہ، وسطانیہ اور فوقانیہ کا نصاب بجائے خود ایسا نہیں ہے جو طلبہ کو کسی پیشہ یا فن کے اختیار کرنے میں مدد دے۔ یہ صورت بہت اچھی ہے کہ تحتانی تعلیم ختم کرنے کے بعد طالب علم جس فن یا پیشہ کی تعلیم حاصل کرنا چاہے اختیار کرے۔ اس سے طلبہ کو موقع ملتا ہے کہ بہت جلد وہ کشمکش حیات اور اپنی مالی درماندگی سے نجات حاصل کریں۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کے ثانوی مدارس تقریباً سب کے سب طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے تیار کر رہے ہیں، جن سے کسی پیشہ کے اختیار کرنے میں مدد نہیں ملتی۔ اعداد و شمار کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ ممالک محروسہ میں سنہ ۳ف میں طبقہ تحتانیہ میں تقریباً سوا دو لاکھ طلبہ، وسطانیہ میں پچیس ہزار اور فوقانیہ میں سولہ ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے طلبہ کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ضرور ہوا ہے مگر ان مختلف طبقوں کی تعداد اور ان کے تناسب پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم کو خیرباد کہنے والے طلبہ کی تعداد افسوسناک ہے جن کے لئے ایسے موقع بہم نہیں پہنچائے گئے کہ وہ تھوڑی بہت تربیت پا کر کسی کاروبار میں لگ جائیں۔ ہمیں ملکی فلاح و بہبود اسی قسم کے تعلیم یافتہ طلبہ سے وابستہ معلوم ہوتی ہے کیوں کہ انھیں آبائی پیشوں کے اختیار کرنے میں ننگ و عار نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اعلیٰ فنی تعلیم پائے ہوئے طلبہ اپنی بلند خیالی اور بلند معیار زندگی کے باعث آبائی پیشوں کے اختیار کرنے میں پس و پیش کریں گے۔ ایسی صورت میں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ چینی بھائیوں کی تقلید میں خاص خاص مقامات پر سینیر مڈل اسکول قائم کر کے تجربہ اور مشاہدہ کیا جائے کہ آیا اس طریقہ سے متوقعہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

تقریر

عالی جناب اے۔ ایچ مکنزی صاحب ناظم تعلیمات صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ

آل ایشیا کانفرنس بنارس کی نمائش کے افتتاح کے وقت صاحب ممدوح نے جو ظرافت آمیز اور پُر مغز تقریر فرمائی اُس کا منہ دری حصہ قارئین ٹیچر کے استفادہ کے لئے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:۔

(ترکیب)

کل کا دن کانفرنس کے ارکان کو خیر مقدم کہنے کا دن تھا۔ آج اس تقریب سے ہم اپنے حقیقی کام کی ابتدا کرتے ہیں۔ لہذا میں اس کو اپنا حق اور اپنے لئے باعث عزت سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر نیابت کا فرض انجام دوں۔

رات میں نے ایک خواب دیکھا اس کا تعلق آج کے جلسہ سے تھا۔ میری ملاقات بنارس کے ایک پنڈت سے ہوئی۔ میں نے کہا "پنڈت جی میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کو تعلیم کا جلوہ دکھاؤں۔ کاشی خیالات اور افکار کا مسکن رہی ہے تاریخ کے قلم بند ہونے سے کہیں پہلے اُس کا شہرہ علم و شائستگی کے مرکز کی حیثیت سے تھا۔ یہ مجمع اساتذہ کا ہے اس میں دانایان مشرق کے مرد و زن موجود ہیں میں گذشتہ بائیس سال سے صوبہ ہائے متحدہ کی نئی پود کو تعلیم دینے کی سعی میں لگا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اساتذہ کی اس جماعت کو ہندوستان کی تعلیم کا جلوہ دکھاؤں۔ فرمائیے کہ اسے کیوں کر انجام دیا جائے؟"

پنڈت جی نے گھور کر مجھے دیکھا۔ اُن کی آنکھوں سے وہ ہمدردی اور تحمل نظر آ رہا تھا جو ایک عقلمند کی آنکھوں میں کسی بے وقوف کو دیکھتے وقت معلوم ہوتا ہے۔ وہ مجھے گنگا کے کنارے اپنے خس پوش قیام گاہ پر لے گئے۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا اندھیرا گھُپ تھا صرف ایک کونے میں کچھ چمک تھی۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ یہ روشنی کیسی ہے؟ کہنے لگے کہ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے آپ تعلیم کو دکھا سکتے ہیں۔ یہ ایک روشن مشعل ہے۔ قدما کے نزدیک تعلیم کا مفہوم جو کچھ بھی تھا اُس کی ظاہری تمثیل اسی کو قرار دی تھی اور نسلاً بعد نسلٍ اسی طرح منتقل ہوتی آئی۔ میرے نزدیک تعلیم کے جلوہ نمائی کی اس سے بہتر کوئی اور تدبیر نہیں۔ میں چلنے کے لئے مڑا۔ لیکن پنڈت جی نے کہا مہربان ذرا ٹھہرئے۔ ایک بات اور سن لیجئے۔ جب تک آپ اس مشعل کو اپنے ہاتھ میں لئے رہیں اس کا لحاظ رکھیں کہ اس کی روشنی تیز رہے۔ یقیناً پنڈت جی کی رائے صحیح تھی۔ تعلیم مادی چیز نہیں ہے۔ ہم نہ اس کو گز سے ناپ سکتے ہیں نہ رطل سے تول سکتے ہیں نہ شیشے میں بند کر سکتے ہیں نہ کھونٹی سے دیوار پر لٹکا سکتے

ہیں۔ تعلیم نام ہے ایک دماغ کے دوسرے دماغ یا ایک روح کے دوسری روح کے اتصال کا۔
وہ حقیقت، جمال اور صداقت ہے جو ہمارے طلبہ کے دلوں میں جاگزیں ہے جو اُن کے خیالات میں
دکھلائی پڑتی ہے اور جو اُن کی زندگیوں کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم رہتی ہے۔

تعلیم ہیں آکر نہیں رکتی اس کا کام انفرادی حیثیت کو ترقی دینا بھی ہے۔ ہم دیواروں پر لٹکی ہوئی
اور میزوں پر رکھی ہوئی چیزوں کو دکھا کر یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ سب کی سب سرگرم غور و فکر کے مظاہر ہیں۔ یہ
بات بُری ہے کہ ہمارے مدارس میں اکثر و بیشتر غور و فکر کو مضمحل و مردہ شے سمجھا جاتا ہے اور اس کو نصاب
کی کتابوں اور اساتذہ کے اشارات سے چُنا جاتا ہے۔ تحقیقی غور و فکر کو جرم سمجھ کر ہم اپنے درس کے
کمروں میں راہ نہیں دیتے۔ امتحانوں میں اس کا دخل نہیں ہوتا۔ سب سے بہتر طالب علم وہ مانا جاتا ہے
جس کی قوت آخذہ بہت بڑھی چڑھی ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ ہر دل عزیز وہ اُستاد ہے جو سر کے
خالی خولی مکعب جوف میں زیادہ سے زیادہ معلومات ٹھونس سکتا ہے۔ ہمارے مدارس میں اس کا
ذرا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا کہ آیا طالب علم بطور خود کچھ سوچ بھی سکتا ہے، آیا اُس میں کسی بات کے خود
فیصلہ کرنے کی قوت بھی ہے، آیا وہ کسی باجمال چیز کا لطف بھی اُٹھا سکتا ہے۔ تعلیمی نمائش کی قدر و
قیمت کو پرکھنے کا یہی موقع ہے اور آج مجھے اس کے افتتاح کرنے کی عزت بخشی گئی ہے۔ نمائش
تعلیم کے پورے پورے مفہوم کو تو نہیں واضح کر سکتی تاہم ایسے بہت سے مظاہر نظروں کے سامنے
لا کھڑا کرے گی جو ہمارے مدارس کے سرگرم غور و فکر کے نتائج ہیں۔

یہاں آپ کو ہندوستان کے ہر حصہ کے اساتذہ اور طلبہ کی مصنوعات ملیں گی۔ آپ ان کو باریک
بین نقاد کی نظر سے نہ دیکھیں۔ جن حالات کے تحت یہ چیزیں بنی ہیں وہ ہر جگہ یکساں نہیں۔ ان میں
بعض نمائش کی چیزیں ایسے مدارس سے آتی ہیں جو سنگ مرمر کے ایوان ہیں اور بعض ان جھونپڑیوں
سے جہاں طلبہ مٹی کے چبوتروں پر بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ اس نمائش سے اتنی بات ضرور حاصل ہو گی کہ مدارس میں اب سے زیادہ ان
مضامین کو وسعت دی جائے گی، جو دست کاری کو ترقی دیں جن سے ہاتھ اور آنکھ کی تربیت ہو۔ اس
نمائش سے واضح ہو جانا چاہئے کہ تعلیم جس کا نام ہے وہ درسی کتب اور لکچر نوٹس سے بالاتر چیز ہے
اور نمائش کی قدر و قیمت محض دکھاوے سے کہیں زیادہ ہے۔

خطبۂ صدارت

(سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ بہادر)

ذیل میں ہم نواب صاحب کے خطبہ صدارت کا ضروری اقتباس پیش کر رہے ہیں ا جو ممدوح نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بیالیسویں اجلاس میں بمقام بنارس انگریزی میں پڑھا تھا۔ اردو داں حضرات کے لئے اس کا ترجمہ بھی تقسیم کیا گیا مگر ترجمہ میں وہ لطف کہاں! یہ امر مسلمہ ہے کہ نواب صاحب کا خطبہ نہایت ہی پُر مغز اور فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ تھا۔ (شریک)

انتخاب صدارت کا شکریہ ادا فرماتے ہوئے نواب صاحب نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قومی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں ہم نے یہ خطرناک و روح فرسا اصول اختیار کر رکھا ہے کہ ہم واقعات کا کھلونا بن رہے ہیں اس رویہ نے نہ صرف ہمیں خود اپنی نظروں میں حقیر کر دیا ہے، بلکہ وہ اپنے ساتھ تباہی کی اُن قوتوں کو بھی لایا ہے جن کو اگر رد کا نہ گیا تو وہ جلد ہمیں کامل کس مپرسی کے درجہ کو پہونچا دے گا وہ اثر جو ہمارا ہونا چاہیئے اس کو از سر نو حاصل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم مردانہ وار ان مشکلات کا مقابلہ کریں جو ہم سے دو چار ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک یہ نہ ہوگا ہم بہت جلد وہ خود داری بھی کھو بیٹھیں گے جس کے بغیر کبھی کوئی قوم کوئی بڑا کام نہیں کر سکتی۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ بحیثیت مسلمان، ہندوستان کی تہذیب و شائستگی میں ہم نے جو حصہ لیا ہے اُس سے ہندوستان کو فی الجملہ حقیقی فوائد حاصل ہوئے ہیں جو کچھ میں نے ابھی کہا ہے وہ صحیح ہے تو اس سے یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ اس حیثیت سے ہماری شائستگی ضرور اس لایق ہے کہ وہ محفوظ رکھی جائے اور جس عظیم الشان ملک کے اندر ہم آباد ہیں اُس کی بہترین نفع رسانی کی خدمت انجام دینے کے لئے ابھی اور بھی اُن کو کام میں لایا جائے۔

بقیہ ہندوستان کے ساتھ اس وقت ہم ایک دوراہہ پر کھڑے ہوئے ہیں جن میں سے ایک راستہ ترقی و عزت کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا جمود اور کاہلی کی جانب۔ اگر ہم سچے دل سے اپنی حالت کو ترقی دینے کی خواہش رکھتے ہیں تو پھر اپنی منزلِ مقصود کی عظمت پر انتہائی اعتماد کے ساتھ ہمیں

فوراً اُن مشکلات کو دور کرنے میں لگ جانا چاہیئے جو ہمارے راستہ میں حائل ہیں پہلی مشکل وہ ہے جس کا تعلق اُس نہایت ناقابلِ اطمینان حالت سے ہے جو مسلمان عورتوں کو آج ہماری جماعت کے اندر ہے۔

میں اُن لوگوں میں سے ایک ہوں جو عورتوں کو قوم کی بہترین روایات کا محافظ و حامل سمجھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جس قسم کی تعلیم کسی نہ کسی طرح آج ہماری نوجوان لڑکیوں کو دی جارہی ہے اُس کا یہ اثر ہوا ہے کہ وہ اس تہذیبی ورثہ کو حقیر سمجھنے لگتی ہیں جو اُن کے بزرگوں نے اُن کے لئے چھوڑا ہے اور وہ ایسے ملک کی طرزِ زندگی کی نہایت بھونڈے طریقہ سے نقل اُتارتی ہیں جو اُن میں سے اکثر کے لئے سراسر ایک نامعروف چیز ہے۔

اب اس بدنما میلان کو صرف اس طرح روکا جاسکتا ہے کہ ہماری ساری زنانہ تعلیم گاہوں کے اندر ایسی استانیاں ہوں جنھیں نہ صرف زمانۂ حال کی چیزوں کا بلکہ قدیم اسلامی تہذیب و شائستگی کا بھی معقول علم ہو۔ جاپان میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا جہاں قوم کو اس قسم کے مسئلہ سے انیسویں صدی کے وسط میں اس کو سابقہ پڑا۔

میری رائے میں ہم مسلمانانِ ہند اب اس سے بہتر کچھ نہیں کرسکتے کہ اپنا دل پکا کر کے اس قسم کی چیزوں کو (جہاں کہیں بھی وہ ہمیں ملیں) جراُت کے ساتھ اختیار کریں جو ہماری جماعت کو مضبوط کرنے والی ہوں اور ہمارے مذہب کے بنیادی اصول کے اندر مخل نہ ہوں۔ جہاں تک براہِ راست تعلیم کا تعلق ہے ہمیں نہایت غور کے ساتھ ان مضامین کی فہرست پر نظرِ ثانی کرنی چاہیئے جو ہمارے زنانہ مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ چوں کہ میں موخر الذکر معاملہ کو نہایت اہم سمجھتا ہوں میں تجویز کرتا ہوں کہ یہ کانفرنس اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان خواتین کی ایک کمیٹی مقرر کرے جس کے سپرد ایسے نصابِ تعلیم کی ترتیب کا کام ہو جو اُن کی رائے میں ہمارے زنانہ مدارس میں مروّج کیا جاسکے۔ رہا پردے کا سوال خواہ آپ پسند کریں یا نہ کریں اقتصادی اور دوسری زبردست قوتیں پردہ کے بقا کے خلاف عمل کر رہی ہیں میں یہ یقین کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ ہندوستان کے اندر مسلمان عورتیں اس پر قانع رہیں گی کہ پردہ کی دیواروں کے پیچھے تنہائی کی زندگی بسر کریں جب کہ دنیا کے دوسرے اسلامی ممالک میں اُن کی تمام بہنیں اس کے بالکل برعکس عمل پیرا ہیں۔

اب اگر پردہ ترک کردیا گیا تو یک قلم نئے حالات وجود میں آئیں گے جن میں شاید اُن حالات سے زیادہ نشیب و فراز ہوں گے جن میں ہماری عورتوں نے اب تک زندگی بسر کی ہے۔ اگر میرا اس حالت کا مطالعہ صحیح ہے تو کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اس بڑی تبدیلی کا مقابلہ کرنے

کے لئے تیار کرنا شروع کردیں اب وقت ہے کہ ہم فیصلہ کریں کہ ہماری خانگی زندگی کی بنیادیں کن چیزوں پر ہونی چاہئیں کیا کل کے ہندوستان کی مسلمان عورت کیا اپنی مغربی بہنوں کی صرف ایک تیسرے درجہ کی نقل ہوگی یا وہ خود اپنی شخصیت باقی اور قائم رکھے گی؟ بالفاظ دیگر کیا وہ اپنی ترکی بہنوں کے نقش قدم پر چلے گی یا جاپانی بہنوں کے؟

اس زمانہ کی ترکی عورتوں کو یکایک یورپین طرز معاشرت اختیار کرایا گیا ہے، جاپانی عورتوں نے ایک نہایت دلچسپ درمیانی راستہ نکالا ہے جو یہ ہے کہ وہ اپنے گھروں اور اپنی جماعت میں اپنے طریقے برتتی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ نہیں کرتیں کہ یورپین ملکوں کے طریقوں سے ناآشنا رہیں۔

یہ سوال کہ اُس شائستگی کی کیا نوعیت ہونی چاہیئے جو ہماری قوم کا مدار زندگی بنے، اس کا حقیقی جواب نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہم یہ قطعی فیصلہ نہ کرلیں کہ ہماری جماعت کے اندر ہماری عورتوں کا کیا درجہ ہونا چاہیئے اور جب تک یہ صاف نہ جائے، کوئی ایسا معین نظام تعلیم قائم نہیں ہوسکتا جو ہماری قوم کے لئے صحیح رہنما ہو۔

کسی قوم کی زبان اور اُس کی شائستگی کا تعلق اِس درجہ مربوط ہوتا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ایک کو چھوڑا جائے تو دوسرا خود بخود نہ چھوٹ جائے اگر دنیا اس نقطہ نظر سے ہماری زبان کی مطبوعہ کتابوں کی صرف ظاہری شکل وصورت پر لحاظ کرنے لگے تو ہماری شائستگی کے متعلق وہ کتنی ادنیٰ درجہ کی رائے قائم کرے گی!

کیا یہ انتہائی ذلت کی بات نہیں ہے کہ باوجود ے کہ ہم سات کروڑ ہیں ہم ابھی تک اپنی زبان کی جسے ہم بولتے ہیں ایک عمدہ چھپی ہوئی اور علمی طور سے ترتیب دی ہوئی لغت کی اشاعت میں کامیاب نہیں ہوئے؟ آج ہم کہاں ہوتے اگر اعلیٰ حضرت حضور نظام انتہائی دوربینی کے ساتھ اس معاملہ کی جانب اپنی توجہ مبذول نہ فرماتے اور ایک یونیورسٹی قائم کرکے جہاں ہماری زبان ذریعہ تعلیم ہے اس تہذیبی ورثہ کو بچانے کی بہترین سعی نہ فرماتے۔

ہمارے ملک میں اس وقت تین بڑے نظام ہیں جو اُردو زبان کے لئے کام کر رہے ہیں یعنی عثمانیہ یونیورسٹی، انجمن ترقی اردو، اور ان صوبجات کے اندر ہندوستانی ایکاڈمی۔ اب یہ صحیح وقت ہے کہ اُن کی کوششوں کو مجتمع کرنے کے لئے کوئی آلہ ایجاد ہوتا جس سے جو کام ہو رہا ہے اس کی مقدار اور نوعیت دونوں ہی میں تیزی اور ترقی پیدا ہوتی۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ کانفرنس اس غرض کے لئے پانچ اصحاب کی ایک کمیٹی مقرر کرے جن کی رپورٹ پر بلا تاخیر مزید عمل کیا جائے۔

ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ایسے ذرائع اور وسائل پر غور کریں جن سے ہم اپنی قوم کے لئے نہ صرف ایک تازہ ترین اور عمدہ چھپی ہوئی لغت اپنی زبان کی مہیا کر سکیں بلکہ اپنے مصنفین کی تمام وہ تصانیف بھی اُن کو دے سکیں جو حقیقی تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے ہمارے نزدیک کوئی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ جب تک ہم یہ نہ کریں گے اس امر کا بہت بڑا اندیشہ ہے کہ ہمارے بچے یہ خیال لے کر بڑھیں گے کہ ہمارے بزرگوں کے پاس کوئی ایسا اہم ترکہ نہ تھا جو وہ ہمارے لئے چھوڑ جاتے۔

یقین رکھئے کہ جس چیز کو ہم اسلامی شائستگی سمجھتے ہیں وہ ہمارے مُلک اور ہمارے گھروں سے یک قلم مفقود ہو جائے گی اگر ہم نے اپنی زبان کو زمانۂ حال کے خیالات کے اظہار کا معقول ذریعہ نہ بنایا۔ ہم ابھی تک اسی مسئلہ پر جھگڑ رہے ہیں کہ ہماری کتابیں چھپانے کے لئے کوئی نستعلیق ٹائپ ہو۔ ہمیں اُمید رکھنی چاہئے کہ اس سلسلہ میں جو کام نظام گورنمنٹ کر رہی ہے اس سے ہمارے راستہ سے یہ مشکل جلد ہٹ جائے گی اور پھر ہم بھی اس قابل ہو سکیں گے کہ اپنی زبان کی کتابیں اُسی آسانی کے ساتھ چھاپ سکیں جس آسانی کے ساتھ آج تمام دنیا کے مہذب ملکوں میں چھپتی ہیں۔

حضرات، چوں کہ یہ میرا مستحکم عقیدہ ہے کہ نہ تو عام جہالت کا مسئلہ (لفظ کے وسیع ترین معنی میں) نہ قومی تعلیم کا مسئلہ دائمی طور پر حل ہوگا جب تک ہماری دیسی زبانیں واسطۂ تعلیم قرار نہ دے دی جائیں۔ اُن کی ترقی میرے لئے بہت بڑے تعلق خاطر کا موجب ہے میں اس خوش آئند دن کا منتظر ہوں جب کہ ہمارے ملک کی ہر بڑی زبان کی قائم مقام خود اس کی ایک یونیورسٹی ہوگی کیوں کہ میں نے ایک موقع پر بیان کیا ہے کہ "صرف علم کی چھوٹی چھوٹی ندیوں سے جو اسی قسم کے تعلیمی سرچشموں سے نکلیں گی وہ عظیم الشان دریا پیدا ہوگا جو مثل ہماری مادرِ وطن کی پوتر گنگا کے ہماری ذہنی زندگی لئے سرسبزی اور شادابی لائے گا جو آج مثل صحرائے راجپوتانہ کے خالی اور بے برگ و گیاہ پڑی ہوئی ہے"

اگر ہندوستان صرف ایک زبان اور ایک شائستگی کا ملک ہوتا تو بہت سی مشکلات جن سے من حیث المجموع دوچار ہونا ہے ان کا حل نسبتاً ایک آسان کام ہوتا مگر حالات مختلف ہیں چوں کہ ہم مسلمانوں کو یقین ہے کہ گزشتہ زمانہ کی طرح زمانۂ مستقبل میں ہماری شائستگی ہماری مادرِ وطن کی خدمت انجام دے گی ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ دولت مند تنوع جو ہمارے گرد و پیش ہے ہماری قوم کی زندگی کے اندر کامل انتشار کی حالت پیدا نہ کر دے۔

اسلامی اصول زندگی کے بقاء و قیام کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں کہ اُن لوگوں کے ساتھ جو اِن اُصولوں میں ہمارے شریک نہیں ہیں ایک دائمی جدال و قتال کی حالت پیدا کر دی جائے۔

میرا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے اور یہ عقیدہ آج سے زیادہ کبھی مضبوط نہ تھا کہ نفرت کی بنیاد پر کبھی کوئی مضبوط عمارت قائم نہیں ہو سکتی۔

اب میں ایک اور مسئلہ کو لیتا ہوں جو حل طلب ہے۔ ہم اپنی قوم سے تعلیمی پس ماندگی کا خوفناک داغ کس طرح دور کر سکتے ہیں؟ میں اس سلسلہ میں اپنی کچھ تجاویز آپ کے سامنے پیش کروں گا جن کے مرتب کرنے میں میں نے نہایت غور و تعمق سے کام لیا ہے۔

جہاں تک تعلیمی معاملات کا تعلق ہے شرکتِ عمل کی جانب پہلا قدم یہ تجویز کرتا ہوں کہ ایک ہی درجہ کے اسلامی نظاموں کے درمیان تعلقات قائم ہونے چاہئیں۔ میں ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر ضلع کے اندر یہ دیکھنا پسند کروں گا کہ خود قوم کی بنائی ہوئی ایسی مضبوط کمیٹیاں ہوں جن کا واحد فرض یہ ہو کہ مسلمان بچے بڑی سے بڑی تعداد میں اُن مدارس میں تعلیم پائیں جو اُن کی دسترس کے اندر ہیں۔

لیکن یہ ساری اسکیم بالیقین ناکام رہے گی اگر ہم من حیث القوم مسلم یونیورسٹی کو ایک ایسی تعلیم گاہ بنانے میں ناکام رہے جہاں اعلیٰ تعلیم اس کی مختلف شاخوں میں ہمارے نوجوانوں کو دی جائے اگر میں یہ کام کروں تو ابتدائی مدارس سے لڑکے چُن کر مدارس وسطانیہ میں بھیجوں گا، مدارس وسطانیہ سے مدارس فوقانیہ میں، مدارس فوقانیہ سے یا تو مسلم یونیورسٹی میں یا ایسی دوسری تعلیم گاہوں میں جن کو ضلع اور صوبہ کی کمیٹیاں موزوں تصور کریں۔

جس تعلیمی نظام کا میں نے نہایت اختصار کے ساتھ خاکہ دیا ہے اسے علمی بنیاد پر پھیلانا چاہیئے اور علی گڑھ کو جو موزوں ترین جگہ ہے مرکز بنا کر اس تمام تر کوشش کی نگرانی وہاں سے ہونی چاہیئے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے دفتر کو ایک بڑے صیغہ میں تبدیل کر دینا چاہیئے جو نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصوں میں تعلیم کی عام ترقی پر سختی کے ساتھ نظر رکھے بلکہ صوبہ دار کمیٹیوں کے ذریعہ سے اضلاع کی کمیٹیوں کے کام کی خبر رکھے یہ صیغہ اس قابل بھی ہو کہ جو لوگ چاہیں اُن کو وہ نہایت صحیح اطلاع ہمارے ملک کے مختلف اضلاع کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیمی ترقی کے متعلق بہم پہونچا سکے۔ طالب علموں کی تعداد جن کی ہر ضلع کی کمیٹی مدد کرے گی بالکل روپیہ کی مقدار پر منحصر ہو گی جو وہ کمیٹی اس غرض کے لئے فراہم کرنے میں کامیاب ہو چونکہ میں چاہتا ہوں کہ اس کام کو ایک مستقل بنیاد پر دیکھوں اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہر ضلع میں سرمایہ کا فنڈ قائم کیا جائے اور یہ کام

صرف چند دن کے ذریعہ سے نہ کیا جائے جن کی نسبت تجربہ ہے کہ وہ اس درجہ کم و بیش ہوتے رہتے ہیں کہ ایک رقم جو سال بسال ایک خاص مقصد کے لئے آتی رہتی ہو اُس پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم مسلمانوں کے لئے بہت بہتر ہے کہ ہر ضلع میں تعلیم کے اعلیٰ ترین درجہ تک پہونچنے کے لئے صرف ایک لڑکے یا لڑکی کی مدد کریں بہ نسبت اس کے کہ اس قسم کے تین سو لڑکوں اور لڑکیوں کی ہر ضلع میں مدد کرنے کا ذمہ لیں اور یہ یقین نہ ہو کہ ہم اسے بخوبی نباہ سکتے ہیں یا نہیں۔

یہ اب سب پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ایک قوم جو آج دس قدم آگے بڑھتی ہے اور کل بیس قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوتی ہے وہ یہ امید نہیں کر سکتی کہ کسی طرف سے بھی اپنے واسطے عزت یا ہمدردی حاصل کر سکے گی۔

اگر آپ تمام حضرات اس طریقہ کو منظور کر لیں جو میں نے اپنی قوم کی تعلیمی حالت کی پس ماندگی کی اصلاح کے واسطے پیش کیا تو میں آپ کو یہ یقین دلانے کے لئے تیار ہوں کہ ہم علی گڑھ میں اس کے لئے بالکل تیار ہیں کہ آپ کی ہر طرح مدد کریں اور مذکورہٗ بالا انتظام کو مستحکم بنیاد پر قائم کر دیں بشرطیکہ آپ اس پر آمادہ ہوں کہ اخلاقی اور مالی طور پر آپ بھی ہماری مدد کریں۔

مدرسین سے ڈاکٹر ٹیگور کی دو دو باتیں

تعلیم کا خاص مقصد، اطلاعات کا بہم پہنچانا نہیں ہے بلکہ سیرت کو کامل طور پر نشو و نما دیتا ہے۔

صغیر سنی میں بچوں کی ترتیب بے حد اہم ہوتی ہے۔ انسان باہمی میل جول اور ارتباط کا بندہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ تعلیم، انسان کو سوسائٹی کے لائق بنائے۔ کتابی تعلیم بھی ضروری ہے مگر صرف یہی کافی نہیں کسی ملک کا مستقبل، جو کچھ انسان اپنے ملک کے لئے کرے، اُس پر منحصر ہے۔ لہذا اسے سوسائٹی کی جو کچھ خدمات ہوں انجام دینا چاہیئے۔

سماجی شہادت، سیاسی شہادت سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ کبھی بھی تاریخ میں سیاسی جد و جہد سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ جو لوگ بلا سماجی ترقی کے سیاسی آزادی کے خواہاں ہیں وہ محض خواب و خیال میں ہیں۔ جہاں اخلاقی اور ذہنی حیثیت سے کمزوری یا خامی پائی جائے، وہاں آزادی کا حاصل کرنا ممکن نہیں لہذا تعلیم سے سماجی تعمیر خاطر خواہ ہونی چاہیئے۔ بہتیرے طالب علم جو سیاسی آزادی کے لئے جوش و خروش دکھلا رہے ہیں، اپنے ہمسایہ تک کو نہیں جانتے۔ اُن میں محض وجدانیت کارفرما ہوتی ہے کتنے ہی کم ایسے نکلیں گے جو صحیح طور پر اپنے ملک کو جانتے ہوں پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ وہ اپنے ہمسایہ کی طبیعت اور خصائل کا اندازہ کریں اور اپنے ماحول کے مطالعہ کرنے کی عادت ڈالیں۔ ہمارے نوجوانوں میں یہ عادت مفقود ہے۔ اُن میں انسانی دلچسپی کی کمی ہے، جو عام طور پر مغربی باشندوں میں پائی جاتی ہے۔

طلبہ کی سیر و سیاحت۔ جو اس مقصد سے کی جائے کہ ملکی معدنیات و زراعت، نباتات و حیوانات اور مقامی فن تعمیر کا علم ہو، بہت زیادہ منفعت بخش ہے وہ اپنی اپنی قابلیت کے مطابق نوٹ لیں اور اُن سے مستفید ہوں۔ اُن سے کالج کے عجائب خانوں کے لئے نادر اشیا جمع کرائی جائیں۔ اس سے اُن کے مذاق کا پتہ چلے گا اور اساتذہ اُن کی نفسیات سے مطلع ہوں گے، جس کا جاننا اُن کے لئے ضروری ہے۔ موجودہ تہذیب و تمدن کا طریقۂ تعلیم تنگ اور محدود ہے اور اُس میں ترقی کی قابلیت نہیں ہے

طلبہ ایک ہی جماعت میں بیٹھتے ہیں، وہی تعلیمی گھنٹے ہیں، مضامین کا ایک ہی ہیر پھیر ہے اور تقریباً ایک ہی نظام العمل مختصر یہ کہ بہت زیادہ یکسانیت ہے، جس کی باعث طلبہ میں مستعدی باقی نہیں رہتی۔ سیاحت سے طلبہ مستعد اور چالاک ہوں گے اور صحیح شوقِ علم کا پیدا ہوگا۔ جس طرح معدہ کے لئے غذا کی تبدیلی ضروری ہے اسی طرح ذہن انفس کے لئے نقل مقام ناگزیر ہے۔ جب غذا اول بدل کر نہ دی جائے تو بدہضمی پیدا ہوگی اسی طرح تعلیم میں رنگا رنگی نہ ہو تو ذہن کند ہو جائے گا غرض کہ سیاحت میں طلبہ کے لئے دائمی مسرت و منفعت ہے اور قدرت سے سبق حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ۔

جو لوگ مدرس بننے والے ہیں اپنے خیالات کو سلاست سے ظاہر کرنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ طلبہ بھی معنی خیز عبارت خوانی کی عادت ڈالیں۔ شگفتگی اور سلاست، اظہار مطالب میں ضروری ہے۔ اگر اس پہلو کو نظر انداز کیا گیا تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ زندگی بے مزہ ہے۔ نظم خوانی، آواز کا چڑھاؤ اُتار اور اداکاری خداداد جوہر ہیں۔ ہر ایک مدرس کو یہ نعمت نہیں ملتی مگر وہ اس فن کے حاصل کرنے کی کوشش کرے، کیوں کہ اچھے مدرس کے لئے یہ چیزیں ناگزیر ہیں انگلستان میں ہندوستان سے بالکل ہی جداگانہ طریقہ پر نظم پڑھائی جاتی ہے مدرس پہلے ادبی تلمیحات بیان کرتا ہے اور اس کے بعد نظم پڑھتا ہے۔ کبھی کبھی مشکل الفاظ وغیرہ کی تشریح کی ضرورت ہوتی ہے۔ نظم کی پڑھائی معنی خیز اور اس ڈھنگ سے ہوتی ہے کہ مطلب حل ہو جاتا ہے۔ مدرس میں متخیلہ قوت کی ضرورت ہے تب ہی وہ موقع محل سے کہیں گھٹا کر کہیں بڑھا کر اور کہیں زور دے کر نظم کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر سکتا ہے۔ جب میں ایک جماعت کو بنگالی ادب پڑھایا کرتا تھا تو میں سب سے پہلے عروض کی تجزی کر دیا کرتا تھا یہ بحث کہ کیوں فلاں ردیف و قافیہ رکھا گیا، بعد کو کی جاتی تھی۔ پھر شعر کے وزن کو لیا جاتا تھا۔ روکھے پھیکے اوزان سے بحث نہیں ہوتی تھی بلکہ اشعار کے صحیح اسپرٹ کو واضح کیا جاتا تھا۔ پھر نظم خوانی کے بعد راگ کے چڑھاؤ اُتار اور اشعار کے زیر و بم سے مطالب کے حل کرنے میں مدد دی جاتی تھی۔ اشعار کا نغمہ اشعار کے الفاظ سے زیادہ اہم ہے۔ جماعت کی فضا، اشعار کے نغمہ سے بدل جاتی ہے اور طلبہ پیکرِ تصویر کا تصوّر قائم کر کے پُر کیف اور سرشار ہو جاتے ہیں۔

تاریخ کی تعلیم کے وقت اُس سین کا تصور دلانا جس میں تاریخی واقعات رونما ہوئے ازبس ضروری ہے سب سے بڑے مُغل بادشاہ کے مقام پیدائش کو لیا جائے۔ ریگستان ہے، ریتی کے ٹیلہ ہیں کیسی مصیبت اور پریشانی کا وقت ہے، ہر طرف فتنہ و فساد ہے اور کوئی خبر گیراں نہیں

ایسے خوش قسمت لڑکے کی پیدائش کے وقت باپ کے پاس بجز نافۂ مشک اور کچھ نہیں جو تقسیم کر سکے تعلیم کے وقت مُدرس اس بیکس بچّہ کی زندگی کی داستان جو آگے چل کر عظیم الشان بادشاہ بنتا ہے فراموش نہ کرے۔

موجودہ نسل کو ملک کے قائدین تباہ و برباد کر رہے ہیں اُن میں یہ خبط پیدا کیا گیا ہے کہ وُہ ہر طرح مکمّل ہیں۔ یہ خیال، بزرگوں کے احترام کو اُن کے دل سے محو کرّ رہا ہے۔ اُن میں استعجاب اور توصیف کا مادّہ، جو بزرگوں کا ادب سکھاتا ہے، کم ہے۔ وہ سنسنی خیز چیز کو پسند کرتے اور تخیّل کو گرمادینے والی چیزوں سے حرکت میں آتے ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ بہت جلد جوش میں آتے اور جوش میں آنے کو پسند کرتے ہیں۔ اُنھیں محض تحقیر کرنے والا سمجھنا چاہیئے کیوں کہ وہ اِس سے نا آشنا ہیں کہ خدمت گزاری سے اِنسان کمال کو پہنچتا ہے۔ بڑے بڈھوں نے انہی مراحل کو طے کر کے عزّت حاصل کی۔ اس استدلال کا کوئی تک نہیں اور نہ کوئی منطق ہے کہ تمام بڑے اچھے ہوتے ہیں کیوں کہ وہ بڑے ہیں اور تمام نوجوان بُرے ہیں اس لئے کہ وُہ نوجوان ہیں غرض کہ نوجوانوں کو چاہیئے کہ بڑوں کے تجربات سے فائدہ اُٹھائیں۔ اُنہیں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ بڑے بڈھے بھی تو کسی وقت جوان تھے، اُن کی آرزوئیں تھیں اور کمزوریاں بھی تھیں۔ جب جوان تھے تو مکمل نہ تھے کیوں کہ کمال اکتسابی چیز ہے۔ اُنھوں نے اپنے بزرگوں کے احترام میں کبھی بھی کمی نہیں کی۔ نوجوانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وُہ بھی کبھی بڈھے ہوں گے اور اپنے بچّوں کی بے ادبی پر خشمگیں ہوں گے۔ انکساری اور ضبطِ نفس ایسے صفات ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

(ماخوذ)

ناخواندگی

"مندرجہ ذیل مضمون مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) نے آل ایشیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ بنارس (۲۶ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۳۵ء) میں پڑھا تھا اس کا ترجمہ ناظرین حیدرآباد ٹیچر کے استفادہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔" مولوی صاحب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے رُوح رواں اور اعزازی شریک معتمد ہیں۔ جو استدلال اعداد کی مدد سے کیا گیا ہے وہ نہایت ہی دلنشیں اور موثر ہے۔
(شریک)

(۱) خواندگی کے اعداد کو خواندگی میں تبدیل کرنا۔

شاید دنیا کے اور ممالک کے برخلاف ہم ہندوستان میں خواندگی کا اندازہ خواندہ اشخاص کی تعداد کے حوالہ سے کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں ناخواندہ اشخاص کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ رپورٹوں میں ان کا ذکر کرنا درکنار ہم ان کا خیال کرتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ہماری مردم شماری کی رپورٹوں اور دیگر تالیفات میں خواندہ اشخاص کی تعداد تو بتائی جاتی ہے۔ مگر ناخواندگی کی وسعت کا اندازہ ہمارے تخیل پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

(۲) خواندگی کا معیار۔

خواندگی کے معیار کے متعلق کسی قدر اختلاف آراء ہے۔ ایک طرف فطرتی طور پر محکمۂ تعلیمات ابتدائی تعلیم کے نہایت بلند معیار پر مُصر ہے۔ اور دوسری طرف ملک کی غیر سرکاری آرا رکی کثرت نوشت وخواند اور حساب کی ابتدائی تعلیم سے مطمئن نظر آتی ہے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ہے کہ میں ہر طبقہ کی پیش کردہ دلائل پر بحث کروں۔ بلکہ میری رائے میں بحالت موجودہ جو کچھ موجو ہے۔ ہمیں اُسی پر قناعت کرنا چاہیئے۔ جیسے جیسے ہم ناخواندہ اشخاص کی تعداد کو گھٹانے میں کامیاب ہوتے جائیں۔ ویسے ویسے بتدریج اس معیار کو بلند کرنا چاہیئے۔

سب سے آسان اور بہترین معیار "ایک مختصر خط لکھنے اور پڑھنے کی قابلیت" ہے۔ خواندگی کی یہ تعریف رپورٹ مردم شماری کی رُو سے بھی مسلّمہ ہے اور اکثر ممالک غیر میں بھی مانی جاتی ہے یہ ظاہر ہے کہ محکمۂ تعلیمات ہند کے اس معیار کو حقیقی طور پر عمل میں لانے سے ناخواندگی کی مہم سرکرنے کا کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔ اور عوام کی تعلیم کی تجویز کم داموں میں نافذ ہوسکے گی جو صوبہ دار۔

حکومتوں کے مالی حالات کے مناسب بھی ہوگی۔

(۳) خواندگی میں ہندوستان کی حیثیت۔

رقبہ کی وسعت یا آبادی کی کثرت کے اعتبار سے ہمارا ملک دنیا کے دوسرے بڑے ممالک میں شمار ہوسکتا ہے۔ لیکن جہاں خواندگی کا لحاظ کیا گیا۔ یہ بدقسمتی سے سب سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ ممالک متحدۂ امریکہ کے محکمۂ تعلیمات کے بلیٹن ۴ بابتہ ۱۹۲۹ء میں دنیا کے مختلف سیاسی حصے (جو تعداد میں ۶۸ ہیں) دس طبقوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، طبقۂ اول اُن ممالک پر مشتمل ہے جہاں خواندہ اشخاص کی تعداد فی صد ۹۰ اور ۱۰۰ کے درمیان ہے۔ انگلستان و جاپان کا شمار اسی طبقہ میں ہے۔ ہندوستان آخری طبقہ میں آتا ہے۔ جس میں خواندہ اشخاص کی تعداد دس فی صدی سے بھی کم ہے۔

یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ انگلستان۔ ہمارے حکمرانوں کا دیس انگلستان۔ تو اپنے خواندہ اشخاص کی تعداد ۶۶ء۹۹ فی صدی کے ساتھ طبقۂ اول میں سب سے اول رہے اور ہندوستان برطانوی صدسالہ حکومت کے باوجود ۳ ء ۷ فی صد خواندہ اشخاص کا تمغہ امتیاز لئے ہوئے آخری فہرست میں سب سے آخر رہے۔

(۴) جاپان اور ہندوستان کی ترقی کا مقابلہ

جاپان کے مرکزی جزائر بھی، جن کی سیاسی بیداری حال کی ہے، طبقۂ اول میں شامل ہونے پر نازاں ہیں، اور فخر کرتے ہیں کہ اُن کے یہاں فی صدی ۱۲ء۹۹ اشخاص خواندہ ہیں۔ یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ وہاں مدرسہ جانے کی عمر والے تمام بچوں میں

سنہ ۱۹۰۰ء میں ۸۰ فی صدی بچے زیر تعلیم تھے

سنہ ۱۹۱۰ء میں ۹۷ 〃 〃 〃 〃

اور سنہ ۱۹۲۲ء میں ۹۹ 〃 〃 〃 〃

ان کے مقابلہ میں ہمارے ملک میں۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں ۵ء۱۸ فی صدی بچے مدرسہ جارہے تھے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں ۶ء۱۹ 〃 〃 〃 〃

سنہ ۱۹۲۷ء میں ۳ء۲۶ 〃 〃 〃 〃

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سنہ ۱۹۲۲ء میں جاپان میں ۹۹ فی صدی یا تقریباً کل بچے مدرسہ جارہے تھے؛ ہمارے ملک میں سنہ ۱۹۲۷ء تک بھی جب کہ نئے اصلاحات کو جاری ہوئے کافی عرصہ

گذر چکا تھا۔ ۲۶٫۳ فی صدی سے زیادہ بچے مدرسہ نہ جا سکے۔

(۵) ہماری ترقی کی رفتار۔

اب میں اپنے ملک کی خواندگی کی ترقی عام حیثیت سے جس میں ہر عمر کے مرد اور عورتیں شامل ہیں، بتانے کی کوشش کروں گا۔

سنہ ۱۸۸۱ء میں ہندوستان میں خواندہ اشخاص کی تعداد ۳٫۵ فی صد تھی۔

سنہ ۱۸۹۱ء میں یہ تعداد . . . . ۴٫۵ فی صد کو پہنچی۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں . . . . ۵٫۳ فی صد کو پہنچی۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں . . . . ۵٫۹ فی صد کو پہنچی۔

اور سنہ ۱۹۲۱ء میں . . . . ۷٫۳ فی صد کو پہنچی۔

بالفاظ دیگر ہمارے ملک میں خواندہ اشخاص کی تعداد چالیس سال کی طویل مدت میں ۳٫۵ فی صد سے ۷٫۳ فی صد تک بڑھی یعنے ہر دس سال میں بحساب ایک فی صدی اضافہ ہوا۔

ہندوستان کے خواندہ اشخاص کی تعداد کو ناخواندہ اشخاص کی تعداد میں تبدیل کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پاس اب بھی ۹۲٫۷ فی صدی اشخاص ناخواندہ ہیں۔ جس رفتار سے ہم ترقی کر رہے ہیں اُس رفتار سے ہمیں جاپان کے مرکزی جزائر کے معیار تک پہنچنے کے لئے ۹۲۷ سال یا تقریباً دس صدیوں کی ضرورت ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں نافذ شدہ اصلاحات کے باعث تعلیمات پر جو اثر پڑا ہے، اس کی وجہ سے کل آبادی اور طلبہ کی فی صدی نسبت میں شاید کسی قدر اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے اس سے بھی طلبہ کی فی صد تعداد میں کوئی معقول اضافہ نہیں ہوا۔

اسی طرح ابتدائی تعلیم کے خرچ میں بھی کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں مصارف ۵٫۹ کروڑ تھے جو سنہ ۱۹۲۶ء میں ۶٫۹۵ کروڑ تک پہنچ گئے۔ گویا اس پنج سالہ مدت میں صرف ایک کروڑ نوے لاکھ کا اضافہ ہوا۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ مصارف تعلیم میں یہ اضافہ سمندر میں ایک قطرہ کا حکم رکھتا ہے۔

(۶) خواندگی کس طرح بڑھائی جائے۔

اِس سلسلہ میں جس خاص نقطہ پر غور وخوض کی ضرورت ہے، وہ واسطہ ہے جس کے ذریعے خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ آیا واسطہ رعایا کا ہو یا حکومت کا۔

(۷) دیسی نظام۔

زمانہ گزشتہ میں ہندوستان میں لوگ اشاعت تعلیم میں نمایاں حصہ لیا کرتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے نے

اپنی کتاب "بدنصیب ہندوستان" میں ریورنڈ کئے کی کتاب سے مندرجہ ذیل اقتباس درج کیا ہے:-

"ایسے بہت کم ملک ہیں جیسے ہندوستان جن کی تعلیم کی تاریخ اس قدر طویل ہو اور اس میں اس قدر کم ردوبدل کیا گیا ہو یقیناً کوئی مغربی ملک تو ایسا نہیں ہے"

یہ امر برما کے ابتدائی تعلیم کے معیار کو دیکھنے سے بخوبی ہمارے ذہن نشین ہوتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ برما برطانوی ہند کا سب سے آخری الحاق شدہ صوبہ اور ایام گذشتہ کی یادگار ہے۔ اس صوبہ میں خواندہ اشخاص کی اوسط تعداد ۲۷،۲ فی صد ہے۔ اور یہ صوبہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں اس لحاظ سے اول ہے۔ برما کے سوا برطانوی ہند کے اور صوبوں سے بعض دیسی ریاستوں میں بھی خواندہ اشخاص کی فی صد تعداد زیادہ ہے۔ مثلاً:-

ٹراونکور میں فی صد ۲۵،۷ اشخاص خواندہ ہیں۔

کوچین " " ۲۱،۰۶ " "

بڑودہ " " ۱۴،۴ " "

ہماری بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ حکومت کی تعلیمی حکمت عملی (پالیسی) سے تعلیم کا وہ دیسی انتظام جس کو خود رعایا چلاتی تھی۔ اُس کی جگہ ایک مُردہ اور ناموافق نظام نے لے لی جو شعبہ واری تعلیم پر مبنی ہے۔ پُرانے نظام کے تحت معمولی ذرایع کا ہر شخص اس بات کو اپنا مقدس فریضہ تصور کرتا تھا کہ اُس کو جو بچے بھی مل سکیں تعلیم دے۔ خود شہنشاہ شاہ جہاں صاحب قِران اپنی معزولی کے بعد تدریس میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے صاف طور پر اُس زمانہ کا رجحان ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح عام تعلیم گاہوں کے علاوہ جو عامۂ رعایا کے خرچ سے چلائے جاتے تھے تقریباً ہر سکونہ مکان بھی ایک قسم کا باقاعدہ مدرسہ ہوتا تھا۔ ہر قریہ میں اس کا اپنا مکتب۔ مدرسہ یا پاٹ شالا ہوا کرتا تھا جس کی سرپرستی عامہ رعایا یا پنچاب کیا کرتی تھی۔

(۸) موجودہ نظام

لیکن ہم آج کیا دیکھتے ہیں؟ حکومت نے خانگی تعلیم اور تعلیم گاہوں کو تسلیم کرنا موقوف کردیا۔ اور اُن میں تعلیم یافتہ اشخاص کو نالایق، اور چھوٹے سے چھوٹے عہدے کے لئے بھی ناقابل ٹھرا کر محروم بنا دیا ہے۔ اس کے برخلاف مڈل پاس اشخاص کو جن کی معلومات محدود ہوتی ہیں اور جو دیسی زبان میں بھی صحیح طور پر نہیں لکھ سکتے۔ عربی سنسکرت اور دیسی زبانوں کے بہترین طلبہ پر ترجیح دی جاتی ہے جنہیں خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے جدید مڈل اسکولس کے نصاب کی تعلیم کا شرف حاصل نہیں ہوا مثال کے

طور پر صوبجات متحدہ کے دیسی مدارس کو لیجئے۔ یہاں ایک مشرقی طالب علم خواہ کیسی ہی اعلیٰ قابلیت کا کیوں نہ ہو۔ عہ ماہانہ سے زاید نہیں پا سکتا۔ جس کی انتہائی یافت للعہ ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے ایک مڈل ٹرینڈ مدرس کی ابتدائی یافت معہ اور انتہائی صہ ہوتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دیسی تعلیم کا پورا نظام درہم برہم اور اس سلسلہ کی جملہ خانگی کوششوں کا خاتمہ ہوگیا۔ پنجاب کے مشہور و معروف ڈاکٹر لیٹنر ([illegible]) آنجہانی کی تحریروں سے اس امر کی تصدیق ان الفاظ میں ہوتی ہے:۔

"پنجاب کے محکمۂ تعلیمات نے متعدد یاددہانیوں کے باوجود خانگی مدارس کو برباد کردیا لطف یہ کہ محکمۂ مذکور اپنے ابتدائی مدارس کی جیسی کچھ حالت تھی اُس سے غافل تھا۔"

(۹) خانگی کوششیں غیر مؤثر ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہم اب بھی دیکھتے ہیں کہ لوگ مشرقی تعلیم کے پرانے طریقہ کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور پورے ملک میں عربی مدارس اور سنسکرت پاٹھ شالوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ بیس سالہ سیاسی بیداری سے جو علمی ذوق پیدا ہوا ہے، اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکوں اور بالغوں کی تعلیم کے لئے کئی درسگاہیں پیدا ہوگئیں۔ بایں ہمہ یہ تمام اشغال غیر مؤثر ہیں۔ اور ان سے خواندہ اشخاص کی تعداد میں کوئی قابل تعریف اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ سرپرستی کے فقدان، یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ حقیقی طور پر سررشتۂ تعلیمات کی ہمت شکنی سے ایسے اشغال مفقود ہوتے جارہے ہیں۔ ذرائع معاش کے انحطاط اور زندگی کی گرانی کی وجہ سے حیات انسانی میں جو روز افزوں کشمکش پیدا ہوگئی ہے اُس کی وجہ سے عوام اس قسم کے کام کو سرکاری امداد کے بغیر چلانے کے قابل نہیں رہے۔

(۱۰) حکومت کی تنہا ذمہ داری۔

مختصر یہ کہ اگر حکومت کو مہذب حکومت ہونے کا دعویٰ ہے تو یہ امر اُس کا واحد فریضہ ہے کہ وہ عوام کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ دنیا کے تقریباً تمام مہذب ممالک میں حکومتوں نے مدت ہوئی، اپنے اس فریضہ کو محسوس کرلیا اور اُس کو قابل تعریف اور مفید طریقہ پر بجا لا رہی ہیں۔ درحقیقت انگلستان میں حکومت نہ صرف ابتدائی تعلیم کی ذمہ دار ہے بلکہ ۱۹۱۸ء کے قانون ثانوی تعلیم (سکنڈری ایجوکیشن ایکٹ) کی منظوری کے بعد سے وہ ثانوی تعلیم کی بھی ذمہ دار ہوگئی ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے جو دیسی نظام تعلیم رائج تھے، اُن کو حکومت ہی نے درہم برہم کردیا۔

اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو کم سے کم اسی ایک وجہ سے اس کو چاہیئے تھا کہ بہت عرصہ قبل عوام کی عالمگیر تعلیم کی کامل ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لیتی۔ یہ امر عجیب وغریب اور دردانگیز ہے کہ باوجود مصارف کثیر کے کسی صفائی کے رقبہ کو آبرسانی اور برقی رَو کا فراہم کرنا تعلیم دلاکر روشن خیالی پیدا کرنے سے زیادہ ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ موجودہ تہذیب کی دخانی و برقی ایجادات کا ہندوستان میں ایسی حالت میں جاری کرنا جب کہ جہل کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہو زیادہ فائدہ مند نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ ہم ریل اور برقی روشنی کے بغیر مہذب قوم کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں لیکن بغیر عام تعلیم کے ہم ایسا نہیں کرسکتے۔

(۱۱) صوبہ جات متحدہ کی خوفناک ناخواندگی۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں مسٹر گوکھلے بیکنٹھ باشی کے جبری ابتدائی تعلیم کے مسودہ کو پیش کرنے کے بعد سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں کوششیں کی جارہی ہیں کہ حکومت مستعدی کے ساتھ عوام کی تعلیم کے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ لیکن اب تک کوئی معقول نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر اسی صوبہ کو لیجئے۔ جس کو ہندوستان کا مرکز کہا جاتا ہے۔ اور جہاں آج یہ تعلیمی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ یہ صوبہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں سب سے پیچھے ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد سے ظاہر ہوگا۔

(۱) برما	۲۷ر۷	فی صدی
(۲) کورگ	۱۲ر۶	"
(۳) دہلی	۱۰ر۷	"
(۴) اجمیر و مارواڑ	۱۰ر۰	"
(۵) بنگال	۹ر۱	"
(۶) مدراس	۸ر۶	"
(۷) بمبئی	۸ر۳	"
(۸) آسام	۶ر۲	"
(۹) صوبجات شمال مغربی سرحد	۴ر۷	"
(۱۰) بلوچستان	۴ر۷	"
(۱۱) بہار و اڑیسہ	۳ر۵	"
(۱۲) صوبجات متوسطہ	۳ر۱	"

(۱۳) پنجاب	۳٫۸ فی صدی	
(۱۴) صوبجات متحدہ	۳٫۷	"

صوبۂ ہذا نہ صرف تمام صوبوں سے پیچھے ہے بلکہ خواندگی میں اس کی رفتار ترقی نہایت سُست ہے۔ اس صوبہ کے مختلف سنین کے اعداد یہ ہیں:-

۱۸۸۱ء	۳٫۰ فی صدی	
۱۸۹۱ء	۳٫۲	"
۱۹۰۱ء	۳٫۱	"
۱۹۱۱ء	۳٫۴	"
۱۹۲۱ء	۳٫۷	"

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ چالیس سال کی طویل مدت میں ہمارے صوبہ میں خواندہ اشخاص کی تعداد ۳٫۰ فی صدی سے بڑھ کر ۳٫۷ فی صدی ہوئی یعنی ۰٫۷ فی صد اضافہ ہوا۔ ذرا حساب لگانے سے ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اگر ہماری یہی رفتار رہی تو یہ کلنک کا ٹیکا (ناخواندگی (۵۵۰۰) ساڑھے پانچ ہزار سال سے کم میں بھی مٹ نہ سکے گا۔

مندرجہ بالا اعداد گذشتہ مردم شماری کی رپورٹ سے لئے گئے ہیں۔ اُس کے بعد ابتدائی مدارس میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اس پر بھی بہ نسبت اور صوبوں کے ہماری رفتار نہایت سُست ہے۔ جیسا کہ اس مثال سے ثابت ہوگا۔ ۱۹۲۰ء میں صوبجات متحدہ اور پنجاب میں جملہ آبادی سے طلبہ کی نسبت تقریباً مساوی یعنی ۲ اور ۳ فی صدی کے درمیان تھی لیکن ناظم تعلیمات کی سال گذشتہ کی رپورٹ میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہمارے صوبہ میں یہ نسبت ۳٫۱۶ فی صدی ہے اور اس کے برخلاف پنجاب میں ۶ فی صدی یا ہمارے صوبہ کی تعداد کے قریب قریب دُگنی ہے۔ پس یہ بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے صوبہ نے اصلاحات کے جاری ہونے کے بعد بھی کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کی۔

(۱۴) آسام میں جمود۔

دوسرے ہر صوبہ کی بھی تقریباً یہی حالت ہے۔ ان میں اکثر صوبوں میں اصلاحات کے جاری ہونے کے بعد بھی کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر آسام کے محکمۂ تعلیمات کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۲۹-۱۹۲۸ء ملاحظہ ہو جس میں یہ فقرہ درج ہے:-

"مسٹر ایس۔ سی۔ گوسوامی نے کہا" بالآخر عام خواندگی کے پھیلانے میں ہم وہیں پہنچے جہاں

پندرہ سال قبل تھے۔ ہماری ترقی حالت جمود میں ہے" اس فقرہ کی نسبت ناظم صاحب تعلیمات کی رائے حسب ذیل ہے:۔

"گو یہ سخت الفاظ ہیں لیکن بالکل سچے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ہمیں موجودہ دَور میں عام خواندگی کے پھیلانے میں کوئی پیش قدمی کرنی ہے، تو یہ ضروری ہے کہ ہم نہایت فراخ دلی سے سرمایہ فراہم کریں اُس سے کہیں زیادہ جو سابق میں کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ ابتدائی تعلیم پر بھی ہمارے اخراجات دُگنے بلکہ تگنے بھی ہو جائیں،"

لیکن سوال یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے اخراجات دُگنے اور تگنے کس طرح کیے جائیں؟ ہندوستان کے مختلف صوبوں کی مجالس تشریعی میں ہر سال تحریکات اور تجاویز پیش ہوتی ہیں لیکن اُن کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا

(۱۳) مجلس صوبجات متحدہ میں خواندگی کی تحریک۔

سال گذشتہ میں صوبجات متحدہ کی مجلس تشریعی نے خواندگی کی اشاعت سے متعلق ایک تحریک منظور کی جس کو ایک غیر سرکاری رکن نے پیش کیا تھا۔ اور ایک کمیٹی بدین غرض مقرر کی گئی کہ مقررہ مدت میں ہر لڑکے اور لڑکی کو خواندہ بنانے کے لئے ایک اسکیم تیار کرے۔ کمیٹی میں مدرسہ جانے کے قابل عمر کے لڑکوں کے لیے دس سال کی مدت میں تعلیمی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے ایک اسکیم بنائی۔ اُس نے یہ بھی سفارش کی کہ حکومت ابتدائی تعلیم کے بارے سے مقامی مجالس (لوکل بورڈ) کو سبکدوش کر دے اور پوری ذمہ داری اپنے اوپر عاید کرلے۔ مزید متوازی اخراجات کا اندازہ تقریباً اسّی لاکھ کا کیا گیا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا حکومت مالی مشکلات کی بنا پر ان سفارشوں کو تسلیم کرے گی اور بروئے عمل لائے گی۔ یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ اصلاحات کے نفاذ کے بعد سے ہر صوبہ کا نظام حکومت گراں تر ہو گیا ہے۔ اور محفوظ و مفوضہ دونوں سررشتوں کی ضروریات صوبہ واری حکومتوں کے مالی سرمایہ سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔

(۱۴) واحد علاج

مندرجہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ خواندگی کی اشاعت سے متعلق۔ اگر ایک طرف رعایا کے لئے یہ ممکن ہے کہ کوئی نجات کا راستہ نکالے۔ تو دوسری طرف حکومت سے بھی تو کوئی زیادہ اُمید نہیں۔ یہ تصویر کا نہایت ہی تاریک رخ ہے۔ لیکن پانی کا پانی اور دودھ کا دودھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ صورت حال نہایت اہم اور دشوار ہے اور پُر احتیاط و ہمدردانہ طریق عمل کی مستحق ہے۔ میرے ذہن میں اس کا واحد علاج موجودہ طریقہ حکومت کی مکمل تنظیم اور مختلف سررشتوں کے افسروں [illegible]

جرأت آزما کفایت شعاری کی تنظیم ہے جس میں خود سر رشتۂ تعلیمات بھی شامل ہے۔ اس موقع پر اس مضمون کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اُمید رکھنی چاہیئے کہ اب جو سیاسی تبدیلیاں ہونے والی ہیں، اُن سے اچھے دن پلٹیں گے۔ اور اس خصوص میں ہمیں ہندوستان کو جاپان اور دوسرے ترقی کرنے والے ممالک کی صف میں لا کھڑا کرنے کے لیئے آدمیوں اور روپیہ کی وقت نہ ہوگی جو پائندہ یابندہ۔ جہاں حقیقی خواہش ہوتی ہے، وہاں کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی جاتا ہے ہم اپنے آپ کو اس خیال سے مطمئن کر سکتے ہیں کہ آئندہ کوئی گورنر صوبہ اُس گورنر کی تقلید نہیں کرے گا جس نے ناعاقبت اندیشی کا ثبوت ان الفاظ میں دیا کہ کسی محکوم ملک میں تعلیم عام کرنا ایک سیاسی خطرہ ہے۔

(۱۵) واحد قابل عمل علاج۔

مگر ہم صرف اُمیدوں اور التجاؤں پر جی نہیں سکتے۔ ہمیں خاموش بیٹھنا بھی نہ چاہیئے۔ بلکہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیئے۔ جو مؤثر چیز ہم انفرادی اور مجموعی طور پر کر سکتے ہیں۔ وہ صرف یہ ہے کہ ہم ہر ممکنہ کوشش کریں کہ مقامی مجالس کو اپنے اپنے حدود میں وسیع اور مؤثر جبری تعلیم رائج کرنے پر آمادہ کر دیں۔ مجالس تشریعی کے ارکین سے التماس کریں کہ اس خصوص میں تحریکات اور مسودات قانون پیش کریں۔ سائر ہند یا صوبوں۔ شہروں قصبوں اور نیز دیہات سے متعلق تمام تعلیمی۔ سیاسی اور دوسری انجمنوں نیز سوسائٹیوں اور اداروں سے تحریکات منظور کر کے پُر زور بیانات دیں۔ اور حکومت سے اس بات پر مُصر رہیں کہ وہ ہر لڑکے اور لڑکی کو خواندہ بنانے کی ذمہ داری کو محسوس کرے یا ابتدائی تعلیم کی اشاعت کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے۔ اور اس طرح ڈسمبر ۱۹۴۰ء یعنی دوسری وہ سالہ مدت میں ناخواندگی کے بدنما سیاہ داغ کو دور کر دے اس طریقہ سے ہندوستان کو اُس کے موجودہ دسویں اور آخری طبقہ سے نکال کر پہلے طبقہ میں شامل کر دے جس میں خود انگلستان شامل ہے۔ حکومت اور رعایا دونوں کا یہ کم سے کم مطمح نظر اور مخصوص نصب العین ہونا چاہیئے۔

میں توقع کرتا ہوں کہ آل ایشیا تعلیمی کانفرنس اپنے کسی عام جلسہ میں اس مضمون سے متعلق کوئی تحریک منظور کرے گی جس کی تقلید ملک کے دوسرے ادارے کریں گے۔

مولوی سید طفیل احمد صاحب

مترجمہ محی الدین محمود

مددگار مدرسہ فوقانیہ دار الشفا سرکار عالی

طلبہ کی صحت

مثل مشہور ہے کہ جان ہے تو جہان ہے۔ جب جان ہی کے لالے پڑ جائیں تو جہان کو لے کر کیا کیجئے مگر افسوس ہے ہم کو جان سے زیادہ جہاں عزیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر اس کی طرف بہت ہی کم توجہ کی جاتی ہے۔ صحت کا مسئلہ بجائے خود اس قدر اہم ہے کہ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے تو اس کی اہمیت اور بھی کئی گونہ زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہر انسان پر علم دین کے بعد علم طب کی تحصیل فرض ہے۔ العلم علمان، علم الادیان، علم الابدان۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ ہر شخص حکیم یا ڈاکٹر ہو۔ منشا صرف اس قدر ہے کہ وہ بوجہ لاعلمی اپنے جسم و جان کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کرے جب ایک معمولی چیز کی نگہداشت ضروری واقفیت کے بغیر نہیں ہوسکتی تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جسم و جان جیسی اہم ترین شئے کی پرداخت من مانے ہو سکے۔ مگر بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے طلبہ حفظان صحت کے اصول سے بالکل کورے ہیں اور اسی سبب سے علم و عمل دونوں میں ادھورے ہیں۔

تعلیم کے نقطۂ نظر سے مسئلہ صحت پر غور کرنے کے بعد یہی ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہمارے طلبہ کی صحت نہ صرف خراب ہے۔ بلکہ بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ بعض حقیقت شناس حضرات کو تو یہ رائے ہے کہ موجودہ تعلیم طلبہ کی صحت کو گھن کی طرح کھا رہی ہے۔ اگر ہم اس رائے پر ٹھنڈے دل سے واقعات کی روشنی میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کے صحیح ہونے میں سرِمو فرق نہیں۔ کسی بچے کی صحت پر آغاز تعلیم سے قبل اور بعد گہری نظر سے غور کرنے والے جانتے ہیں کہ جب ایک بچہ گھر کی چار دیواری سے نکل کر مدرسے کے احاطے میں قدم رکھتا ہے تو اس کے جسم و مزاج میں کیسے قابل رحم تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے اس کے چہرے کی پژمردگی زبان حال سے کہہ اٹھتی ہے کہ وہ معصوم تازگی کی قایم مقام ہے۔ چنانچہ ایک ماہر تعلیم نے کسی جیل خانے کا معائنہ کرنے کے بعد یہ مبنی بر حقیقت رائے ظاہر کی تھی کہ میں نے کسی مدرسے کے طلبہ سے زیادہ ان قیدیوں کو بشاش پایا، حالاں کہ اصولاً اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا مگر واقعات سے انکار ممکن نہیں۔ اگر طبی ارکان کی ایک مجلس قایم کر کے اس کے ذریعہ طلبہ کی موجودہ صحت کی جانچ کرائی جائے تو کوئی تعجب نہیں کہ خرابی صحت کے سبب تعلیم پانے کی صلاحیت نہ رکھنے والے طلبہ کی تعداد معتد بہ ہو۔ لیکن جب ایسے طلبہ بھی حصول علم میں مصروف ہیں جو نہ اپنی ذات کو کماحقہ فائدہ پہونچا سکتے ہیں اور نہ ملک و قوم کو متمتع کر سکتے ہیں تو پھر اس طرح عمر کا بیش بہا حصہ صرف کر کے

سر پھوڑنے سے کیا فائدہ۔ اس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ وہ جاہل کہلاتے مگر تندرست رہ کر ادنٰے درجے کی محنت و مزدوری کو عار نہ سمجھتے اور اپنی زندگی صحت جیسی نعمت کے ساتھ حقیقی مسرت سے گزار دیتے۔

اب خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تعلیم کے ساتھ حفظان صحت کا کافی التزام موجود نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ اور باتوں کا تو کیا ذکر صرف مکان مدرسہ کو تو دیکھئے۔ جہاں طلبہ کم از کم پانچ گھنٹے گزارتے ہیں اگر محل وقوع کی اہمیت نظر انداز بھی کر دی جائے تو مکان کے صحت بخش ہونے کی ضرورت تو مسلم ہے اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر موجودہ مکانات کے بیشتر حصے کا ناموزوں ہونا اس دلیل سے ثابت ہے کہ عموماً جو چیز جس مقصد کے لئے بنائی نہیں جاتی اس سے اس مقصد کی کما ینبغی تکمیل بھی نہیں ہو سکتی۔ اضلاع کے مکانات کی حالت تو اور بھی ناگفتہ بہ ہے۔ باوجود اس کے یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ سر رشتے نے کرائے کے اچھے مکانات حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ پبلک جس کو مسئلہ تعلیم سے سرکار کی نسبت زیادہ اور گہرا تعلق ہے۔ اس کے ایثار و ہمدردی کا یہ عالم ہے کہ باوجود ماہ بماہ معقول کرایہ لینے کے ضروریات مدرسہ کا مطلق لحاظ نہیں کرتی۔ چنانچہ حفظان صحت کے مدنظر جب کبھی ترمیم کی ضرورت ہوتی ہے قطعاً انکار کر دیتی ہے یا ایسی شرائط پیش کرتی ہے کہ جن کی تکمیل کا سر رشتہ مقتدر نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ناموزوں مکانیت طلبہ کی صحت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مجھے اس خصوص میں اپنے ایک نکتہ رس افسر کی اس صائب رائے سے پورا اتفاق ہے کہ ناف شہر کے کسی ناموزوں مکان میں طلبہ کی زیادہ تعداد فراہم کر کے ان کی صحت کو خراب کرنے سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ بیرون آبادی کسی موزون مکان میں طلبہ کی نسبتاً قلیل تعداد صحت و سلامتی کے ساتھ تعلیم پائے۔

ایک طرف حفظان صحت کے اہم لوازمات مثلاً۔ موزوں مکان۔ آرام دہ فرنیچر۔ طبی معائنہ، بازی گاہ۔ ورزشی مقامات۔ پیراکی کے حوض۔ تفریح گاہ۔ کھلے میدان۔ باغات وغیرہ کا فقدان اور دوسری طرف مضامین تعلیم کی کثرت۔ اور اوراق مقررہ کے حجم کی زیادتی زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ نصاب تعلیم کی تشکیل کے وقت طلبہ کی صحت کا خیال یا تو کچھ تھا ہی نہیں یا اگر تھا بھی تو اس کا وجود و عدم برابر تھا کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جہاں اور بہت سی چیزیں طلبہ کی صحت میں خلل انداز ہیں وہاں نصاب تعلیم کی ناموزونیت بھی مضرت رساں ہے۔ لیکن میں بوجہ خوف طوالت اس بحث کو زیادہ طول دینے سے احتراز کر کے بسبیل اجمال صرف جماعت صغیر کے متعلق مشتے نمونہ از خروارے یہ عرض کروں گا کہ ہماری موجودہ تعلیم کا پہلا زینہ جماعت صغیر ہے۔ جس کے نصاب کے ابواب سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اُن طلبہ کے لئے زیادہ تر موزون ہے جنہوں نے کنڈر گارٹن کا زمانۂ تعلیم بلا کتاب ختم کیا ہوا اور بلحاظ عمر اس نصاب کی

تعلیم کے لئے تیار ہوں۔ پہلے تو ہمارے مدرسوں میں بجز معدودے چند مدارس کے کنڈرگارٹن کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ یوں برائے نام تختۂ نظام الاوقات میں دو چار جگہ کنڈرگارٹن کا لفظ لکھ دینا یا زائد از زائد آئین بائیں شائیں بتا دینا حقیقی تعلیم پر ہرگز دلالت نہیں کرتا۔ چنانچہ ہمارے مدارس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ متمدن ممالک میں کنڈرگارٹن کی تعلیم کے لئے طلبہ کی جو عمر مقرر ہے اس سے کم عمر طلبہ کو وہ نصاب پڑھایا جاتا ہے جس کی نوبت کنڈرگارٹن کا زمانہ تعلیم ختم ہونے کے بعد آنی چاہیئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں بہ لحاظ عمر کتابی تعلیم کا آغاز جلد ہوتا ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض والدین اپنے کم سن بچوں کو اس واسطے مدرسہ بھیج دیا کرتے ہیں کہ بچے کم از کم خود مدرسہ جانے کے عادی ہو جائیں یا اُن کی وجہ سے گھر میں آئے دن جو دھما چوکڑی مچی رہتی ہے اس سے کچھ دیر کے لئے نجات مل جائے۔ مروجہ نصاب تعلیم کے مدنظر صغیر جماعت میں کم از کم داخلے کی عمر کا تعین کر دیا جاتا مگر اس میں یہ اندیشہ تھا کہ اب مدارس میں طلبہ کی تعداد کے سبب جو جبل پل اور آبادی نظر آتی ہے اس میں کمی نہ ہو جائے اور اضافہ تعداد طلبہ کا سوال جو بدقسمتی سے مدارس کی موت وحیات کا مسئلہ بن گیا ہے کہیں عام نہ ہو جائے کیوں کہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اکثر مدارس کی زیادہ تر آبادی عموماً تحتانی اور بالخصوص صغیر جماعت کے طلبہ کی تعداد پر منحصر ہوتی ہے جہاں طلبہ کی موجودہ تعداد میں ہر وقت اضافے کا امکان ہوا کرتا ہے۔ اکثر مدارس وسطانیہ میں جہاں بہ لحاظ تعداد طلبہ صغیر کے دو فریق اور بعض میں صغیر اردو کے ساتھ صغیر تلنگی وغیرہ کی جماعتیں قایم ہیں وہاں طبقہ وسطانیہ کی جماعتوں میں طلبہ کی تعداد نسبتاً کم ہوتی ہے۔ گویا مدرسہ کے وسطانیہ گریڈ کو بہ قید تعداد طلبہ قایم رکھنا اُس کے ملحقہ طبقہ تحتانیہ کا کام ہوتا ہے بہر حال واقعات کے مدنظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہماری تعلیم کا پہلا زینہ کج روی کا پہلا قدم ہے جس کے بعد منزل مقصود کو پہونچنا ظاہر ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا مے رود دیوار کج

مدارس وسطانیہ اور فوقانیہ میں سرکار کی جانب سے طلبہ کی صحت کی خاطر ڈرل گیمس اور اسپورٹس کا انتظام کیا گیا ہے لیکن بدقسمتی سے پرائمری اور تحتانیہ مدارس جن کو لوازمات صحت کی نسبتاً اور اصولاً زیادہ احتیاج ہے محروم ہیں۔ ڈرل کے مروجہ طریقے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طلبہ میں فوجی قواعد کی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے۔ اس کہنے کا منشا یہ ہے کہ ورزشی مقصد سے زیادہ قاعدے کی پابندی پر زور دیا جاتا ہے۔ جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اکثر ڈرل ماسٹروں کا فوج سے تعلق رہا ہے اور وہ اسی وجہ سے ہر وقت فوجی نقطۂ نظر سے کام لینے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایک اور نمایاں خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ عموماً طلبہ ڈرل سے متنفر نظر آتے ہیں اور اس سے بچنے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا

کر لیتے ہیں حتیٰ کہ والدین سے تحریرات اور ڈاکٹروں سے صداقت نامے بھی حاصل کر کے پیش کرتے ہیں گیمس کا انتظام ضرورت کے لحاظ سے بہت ناکافی ہے۔ اول تو اس کا سرمایہ اس قدر قلیل ہوتا ہے کہ ضروریات کی تکمیل نا بجائی ہوتی ہے دوسرے یہ کہ بازی گاہ کی بڑی قلت ہے۔ مدارس تو ایک چھوٹے سے میدان سے بھی محروم ہیں اور جن کو بازی گاہ میسر ہے۔ وہ پورے مدرسہ کا انتظام کرنے سے قاصر ہیں۔ یوں برائے نام چند شوقین طلبہ کا بازی میں حصہ لینا دوسرے طالب علموں کی صحت کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ جن مدارس میں کھیل کا مذکورہ بالا انتظام ہے وہاں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ پرائمری جماعتوں کے کھیل کی طرف بہت ہی کم توجہ کی جاتی ہے۔ اسپورٹس کا حال تو ڈرل اور گیمس سے بھی نرالا ہے۔ ان کا دور دورہ زائد از زائد دو ماہ تک باقی رہتا ہے چنانچہ ادھر اسپورٹس کا اختتام ہوا اور ادھر ان کی مشق سال آئندہ کے لئے برآئندہ ہوئی۔ اگر اسپورٹس کا مقصد استقرار صحت ہے تو پھر ان کے عارضی اور برآئندہ ہونے کے کیا معنے۔ ان حالات سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ صحت جسمانی کا موجودہ انتظام بہت زیادہ اصلاح۔ سرمایہ۔ توجہ اور ہمدردی کا بدرجۂ اتم مستحق ہے۔ جس کے اٹل استحقاق سے تغافل برتنا خود دماغی تعلیم کے حق میں مفید نہ ہوگا۔

طلبہ کی موجودہ صحت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی طرف سرکاری اور غیر سرکاری طور پر جو توجہ کی جارہی ہے وہ ناکافی ہے۔ اگر چندے یہی حال رہا تو اب جو تلافی مافات کی توقع کی جاسکتی ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ چنانچہ اس کا ثبوت اس واقعے سے ملتا ہے کہ محض خرابی صحت کے سبب غیر حاضر رہنے والے طلبہ کی تعداد کا تناسب جماعتوں کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے یعنے تعلیم کی ترقی اور صحت کا گھٹنا لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ اس خصوص میں ایک اور واقعے کا اظہار بھی غالباً خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ چند سال قبل شورا پور کے مدرسے میں دو حقیقی بھائی پڑھا کرتے تھے۔ بڑے کو تعلیم کا جس قدر شوق تھا چھوٹے کو اسی قدر نفرت تھی۔ بالآخر باپ نے تعلیم موقوف کر کے اس کو پارچہ بافی کے آبائی پیشے میں لگا دیا۔ شاید تین سال کے بعد جب بڑا بھائی جماعت مڈل میں داخل ہوا تو اس کی صحت رفتہ رفتہ اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ ہر شخص ایک نمایاں فرق محسوس کرتا تھا۔ برخلاف اس کے چھوٹے بھائی کی صحت ایسی اچھی تھی کہ وہ بڑا بھائی نظر آتا تھا حالانکہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے اور ایک ہی قسم کی غذا کھاتے تھے اس سے بڑھ کر تعجب تو اس حقیقت پر ہوتا ہے کہ جس وقت یہ دونوں بھائی مدرسے میں داخل ہوئے تھے بڑے کی صحت نسبتاً بہت اچھی تھی۔ اگر اس خاص واقعے کو نظر انداز کر کے کاشت کاروں اور مزدوروں کے ان پڑھ بچوں کی صحت سے ہمارے طالب علموں کی تندرستی کا مقابلہ کیا جائے تو ایک نمایاں فرق کے

ساتھ خصوصیت بھی پائی جائے گی کہ یہ اَن پڑھ بچّے طلبہ کے برخلاف امراض میں بھی کم مبتلا ہوتے ہیں اور نوادر کیسی بڑھے باپ کے اعضاء قوار محنت اور صحت وغیرہ سے اُمی کے بچوں کا موازنہ کیجئے تو یہ حقیقت خود بخود ظاہر ہو جائے گی کہ بڑھا باپ اپنے جوان بچے کے مقابل میں ہر حیثیت سے اچھا ہے۔ مزید برآں نوزائیدہ بچوں کے وزن۔ اعضاء کی ساخت۔ امراض کی کثرت اور اموات کے اعداد و شمار پر نظر کرنے کے بعد بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ آنے والی نسلوں کی زندگی یقیناً معرض خطر میں ہوگی۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ پونہ کے انجینئرنگ کالج کے ایک پروفیسر نے صحیح اعداد و شمار فراہم کرکے اپنے طلبہ کو مبارکباد دی تھی کہ دوسرے شعبہ جات کی نسبت انجینئرنگ کے طلبہ بلحاظ صحت و حیات بہت اچھے بلکہ قابل رشک ہیں۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہوسکتی ہے کہ داخلے سے پہلے طلبہ کی جسمانی ساخت و صحت کا طبی امتحان کرکے تعلیم پانے کی صلاحیت کا اطمینان کرلیا جاتا ہے۔ جس کے بعد اُن کی تعلیمی اوقات کا ایک بڑا حصہ ہمارے طلبہ کی طرح تنگ و تار اور بند کمروں میں کٹنے کی بجائے کھلے پر فضا میدان کی تازہ صحت بخش ہوا میں گزرتا ہے۔

اگرچہ مضمون کے مقررہ عنوان پر نظر کرتے اساتذہ کی صحت کا ذکر خارج از بحث ہے۔ مگر میں اس اہم ضرورت کو ثابت کرنے کی غرض سے کہ نہ صرف پڑھنے بلکہ پڑھانے کے لئے بھی جسمانی صحت لازمی ہے صرف ایک واقعے کا بالاختصار اظہار کروں گا جس کے مشاہدے کا موقع مجھے یادگیر کے مدرسے میں ملا تھا۔ ایک نوجوان ہندو ٹرینڈ مدرس صاحب۔ جو افسوس ہے کہ اب بقید حیات نہیں ہیں۔ خرابی صحت کے سبب اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ جن کے اشارات تعلیم کی مرتبہ کاپی دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اصولاً بے نقص اور قابلیت و تحقیق کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ چنانچہ دوسرے اَن ٹرینڈ مدرسین کو اس کا مطالعہ کرنے کے لئے توجہ دلائی جاتی تھی۔ مگر ان کے اکثر مفوضہ مضامین کے نتائج اشارات مرتبہ کا لحاظ کرتے قابل اطمینان نہیں ہوتے تھے۔ اس خلاف توقع اختلاف پر ایک عرصہ تک غور اور دوران تدریس میں معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ خرابی صحت کے سبب مزاج میں چڑچڑاپن اور زود رنجی پیدا ہوگئی تھی جو طلبہ کی ذرا ذرا سی قابل نظر انداز باتوں پر بھی مشتعل ہو کر اشارات کو فراموش اور طریقہ درس کو بے اصول کردیتی تھی۔ اس میں مزید خرابی یہ پیدا ہوئی کہ ناسمجھ طلبہ نے اس کو اپنی نت نئی دلچسپی کا مشغلہ سمجھ لیا اور آئے دن ایسے سامان فراہم کرتے رہے جو اُصول تدریس کو بے اصول اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے کافی تھے۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ اصول حفظان صحت سے واقف نہیں ہوتے اور اگر کچھ جانتے بھی ہیں تو اس پر مطلق عمل نہیں کرتے۔ کھانے پینے میں غضب کی بے اعتدالی کرتے ہیں۔ جو غذا صحت کے لئے زیادہ مفید ہوتی ہے اس کی طرف رغبت نہیں کرتے۔ ترکاری کے معاوضے میں گوشت کو

زیادہ پسند کرتے ہیں گویا مغز پر استخوان کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی چیز کی نوعیت کو دیکھنے کی بجائے اس کی مقدار پر نظر کرتے ہیں۔ کھانا کھاتے وقت ضرورت سے زیادہ جلدی کی جاتی ہے۔ ادھر نوالا اُٹھا اور اُدھر حلق کے نیچے اتر گیا۔ میں نے ایک دن کسی تعلیمی ضرورت کے سبب ایک طالب علم سے فارغ ہو کر ذرا جلد آنا۔ جب وہ واپس آیا تو خلافِ توقع جلد آنے پر مجھے شبہ ہوا کہ شائد کھانا کھائے بغیر آگیا ہو۔ "یہ کیا تھا کہ کھانے سے" مگر دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حسب معمول کھانا کھا کر آیا ہے اور انہیں کھانا کھانے کے لئے ساتھ آٹھ یا زیادہ سے زیادہ دس منٹ کافی ہیں۔ اس پر ان سے کہا گیا کہ کھاتے وقت ہرگز جلدی نہ کریں۔ کیونکہ منہ میں ایک قسم کا رقیق مادہ ہوتا ہے جو نوالے کو خوب چبانے کے سبب کافی مقدار میں شریک ہو کر غذا کو مضم کرتا ہے۔ بس یہ سننا ہی تھا کہ منہ بنا کر کچھ ایسی کراہت ظاہر کی کہ مزید تلقین سے عمداً گریز کرنا پڑا کہ مبادا یہ کراہت مبدل بہ نفرت نہ ہو جائے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ بڑی جماعت کے طلبہ تک حفظان صحت کے معمولی اصول سے بھی واقف نہیں ہوتے ہیں۔ اگر کسی طالب علم سے پوچھا جائے کہ تندرستی کے لیے لازماً کس قدر پانی پینا چاہیئے تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ صحیح جواب دے سکے گا حالاں کہ اس کے لئے اس سے واقف ہونا کسی تعلیمی مسئلہ سے زیادہ اہم اور مقدم ہے۔ ہوا جو جسم کے ساتھ جان کا حکم رکھتی ہے طلبہ کے نزدیک اتنی اہم نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہیئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ تازہ اور پاک و صاف ہوا کو انہوں نے ضروریات زندگی سے خارج کر دیا ہے۔ جن کو اس کا کچھ احساس ہے ان کی تعداد نسبتاً اس قدر قلیل ہے کہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ان کے زرد اور پژمردہ چہرے بتا رہے ہیں کہ تازہ ہوا سے قطعاً محروم ہیں۔ اگر ان کو اس کا کچھ بھی احساس ہوتا تو آج کم از کم ان تنگ و تار اور پُر انبوہ سینما گھروں میں گھنٹوں شوق سے بیٹھ کر اپنی آنکھوں اور شش کو خراب نہ کرتے نیز راستے کا گرد و غبار اور مکانوں کا دھواں ان کو گوارا نہ ہوتا۔ موسم سرما میں بند کمروں میں منہ لپیٹ کر سونا ان کی عادت میں داخل ہے بند کمرے خود ہوا کو خراب کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ پھیپھڑوں سے خارج کی ہوئی ہوا کو بار بار لیتے ہیں جس کے سبب ان کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ موسم گرما میں تیراکی کے شایق بچے دوپہر کا کھانا کھاتے ہی باولی کی راہ لیتے ہیں۔ کھانے کے بعد ہی غسل کرنے سے معدے میں جو خرابی پیدا ہوتی ہے وہ ظاہر ہے عموماً معدہ بیماری کا گھر ہو جاتا ہے اس کے ساتھ تھوڑا سا بُرا سلوک بھی رنگ لائے بغیر نہیں رہتا اگر ان طلبہ سے جو باوجود عاقل و بالغ ہونے کے نماز نہیں پڑھتے دریافت کیا جائے کہ دن میں کتنی دفعہ ہاتھ منہ دھویا کرتے ہیں تو جواب مایوس کن ملے گا صبح کے وقت وہ بھی کھانے کے لئے منہ دھو لینا کافی سمجھتے ہیں۔ اس معاملے میں چھوٹے بچے تو

اور بھی گئے گزرے ہیں ان کے ہاتھ منہ وغیرہ شاید ہی پاک وصاف ہوتے ہوں۔ صبح کے مدارس میں تو بعض وقت یہ بھی دیکھا گیا کہ دیر رسی کے خوف سے ہاتھ منہ دہوئے بغیر مدرسہ آنے میں تکلف نہیں کرتے۔ بڑی جماعتوں کے کتنے طالب علم ایسے ہیں جن کے پاس مُنہ ہاتھ صاف کرنے کے لئے دستی یا کپڑے کا کوئی ٹکڑا ہوتا ہے۔ کم سن بچے آستین۔ کرتے کے دامن۔ دیوار۔ فرنیچر اور پاس کی ہر ایک چیز سے اپنے گندہ ہاتھ بلا تکلف صاف کر لیا کرتے ہیں۔ ہاتھ کے ناخن اس قدر میل آلود ہوتے ہیں کہ دیکھنے سے کراہت ہوتی ہے۔ سر پر بال رکھنے کا مرض تو عام ہے۔ اگر کوئی طالب علم کسی مجبوری کے سبب فیشن کے اس ظل عاطفت میں نہیں ہوتا ہے تو وہ بال رکھنے والے طالب علموں کے سامنے ضرورتاً برہنہ سر ہونے میں تکلف کرتا ہے دراز بالوں کا ہر وقت خشک و پریشان رہنا اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ طلبہ کو کنگھی سے کام لینے کی احتیاج و پروا نہیں۔ ایسے حالت میں بند مسامات سے دماغ کو جو نقصان پہونچتا ہے اس کا صحیح اندازہ ڈاکٹر یا حکیم ہی کر سکتا ہے۔ اگر طلبہ کے دانتوں کا طبی معاینہ کرایا جائے تو معلوم ہوگا کہ بد قسمتی سے بہت کم طالب علموں کے دانت صحت ور ہیں۔ اس خرابی پر طرہ یہ کہ پان کھانے کا مرض گھٹنے کی بجائے بڑھ رہا ہے۔ کتنے طالب علم ایسے ہیں جو رات میں سوتے وقت بالالتزام مُنہ اور دانت صاف کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ عمل صبح اُٹھ کر منہ دہونے سے زیادہ مقدم ہے۔ تمباکو کا استعمال تو اس قدر ترقی کر گیا ہے اس کا انسداد تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ گھر کی طرح مدرسے میں بھی بعض مضرت رساں بے اعتدالیاں دیکھی جاتی ہیں۔ اکثر لڑکے ڈرل اور گیمس کے بعد فوراً پانی پی لیا کرتے ہیں جس سے اُن کے ہاضمے میں فتور پیدا ہوتا ہے خصوصاً چھوٹے بچے دوپہر کے وقفے میں اناپ شناپ کھا کر کھیل کود میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ گیمس سے فارغ ہونے کے بعد جب کہ جسم پسینے میں شور بور ہوتا ہے گریباں کھول کر ہوا دیتے ہیں۔ جہاں تک دیکھا اور سنا جاتا ہے۔ خود والدین اور مدرسین اس طرف کافی توجہ نہیں کرتے بلکہ "او خویشتن گم است" کا مصداق ہوتے ہیں۔ ایک ماں اپنے سوتے ہوئے شیر خوار بچے کے منہ پر اس واسطے کپڑا کھینچ دیتی ہے کہ کھمیوں کے بیٹھنے سے بار بار بیدار ہو کر روتا اور کام کرنے نہیں دیتا ہے۔ جب ایک خانگی مدرس صاحب اپنے شاگرد کو پڑھانے کے لئے صبح اُس کے مکان پر جاتے ہیں تو والد بزرگوار سے یہ جواب ملتا ہے کہ "میاں زیادہ رات تک پڑھنے کے سبب ابھی بیدار نہیں ہوئے کیا کل آپ نے کوئی غیر معمولی کام دیا تھا" یہ سُن کر استاد صاحب متعجب ہوئے کہ بدشوق لڑکا رات کو کیا پڑھتا رہا ہوگا۔ دوسرے دن استاد صاحب کی دریافت سے قبل صاحب زادے نے خود ہی اس دلچسپ عشقیہ ناول کے مطالعہ کا ذکر کر دیا جس کو

وہ گذشتہ رات پڑھتا رہا۔ غور فرمائیے کہ والدین جن پر اپنی عزیز اولاد کی نگرانی ہر طرح فرض ہے اصول حفظان صحت سے کس قدر نابلد ہوتے ہیں۔ کیا شب بیداری کے نقصانات اور علی الصباح اٹھنے کے فوائد سے لاعلم رہنا قابل افسوس نہیں ہے۔ چھوٹی جماعتوں کے اکثر کم سن بچے اپنی سلیٹ تھوک سے صاف کیا کرتے ہیں اور مدرسین درست کرنے کے لئے ان کو بلا تکلف ہاتھ میں لیتے ہیں۔ جس طرح دیکھنے میں یہ فعل کریہ منظر ہے اسی طرح صحت کے لئے بھی مضر ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی بچہ نشش کی کسی متعدی بیماری میں مبتلا ہے۔ ایسی حالت میں خود استاد صاحب کا مبتلائے مرض ہو جانا ممکن کیا بلکہ یقینی امر ہے۔ اگر صبح کی دھوپ کسی کمرۂ جماعت میں داخل ہوتی ہے تو فوراً روک دی جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ ایک بڑی نعمت ہے۔ اسی طرح روشن دان کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ بند ہو جائیں تو کھلنے کی نوبت نہیں آتی اور جو کھلے ہوتے ہیں ان میں گرد و غبار کا تودہ جمع رہتا ہے جو داخل ہونے والی ہوا کے ساتھ شریک ہو کر کمرے کی ہوا کو کثیف کر دیتا ہے۔ تختۂ سیاہ صاف کرنے کے کھادی کے جھاڑن جب کھریا میں بھر جاتے ہیں تو انھیں کلاس میں جھاڑا جاتا ہے جس کی وجہ سے چونے کے باریک ذرات ہوا میں شریک ہو کر تنفس کے لئے زہر کا کام کرتے ہیں۔ یہ خیال مبنی بر حقیقت وعمل نہیں ہے کہ اکثر ٹرینڈ اساتذہ تعلیمی نقطۂ نظر سے طلبہ کی صحت کا خیال کرتے ہیں اس کے برخلاف مشاہدہ شاہد ہے کہ عموماً کامل و ناقص صحت کے طلبہ ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں چنانچہ طبقۂ تحتانیہ کے ایک ٹرینڈ مدرس صاحب نے چند دوسرے طلبہ کے ساتھ ایک ایسے طالب علم کو بھی بغرض سزا صدر مدرس صاحب کے پاس بھیجا تھا جو ہوم ورک نہیں لاتا تھا اور اسباق بھی اچھی طرح یاد نہیں کرتا تھا۔ اتفاق سے خود صدر مدرس صاحب اس طالب علم سے ذاتی طور پر واقف تھے کہ وہ ایک محنتی اور اطاعت گزار طالب علم ہے۔ اگرچہ اس کی صورت سے ضعف و ناتوانی صاف طور سے ظاہر ہو رہی تھی بریں ہم دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دو ہفتے کے بعد بخار کا سلسلہ موقوف ہو کر صرف چار روز ہوئے ہیں اور طالب علم اپنے والدین کی مرضی کے خلاف صرف جماعت میں حاضر رہ کر ممکنہ فائدہ اٹھانے کے لئے از خود مدرسہ آرہا ہے۔ ایک اور ٹرینڈ مدرس صاحب خرابی صحت کے سبب ہوم ورک نہ لانے اور غیر حاضر رہنے والے طالب علم سے فخریہ طور پر یوں فرماتے ہیں کہ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ آج کئی دن سے میں نزلہ و بخار میں مبتلا ہوں اور اعضا شکنی اس بلا کی ہے کہ اٹھنا بیٹھنا بار ہے مگر میں بلا ناغہ مدرسہ آتا ہوں اور اپنے فرائض بے کم و کاست انجام دیتا ہوں۔ ایک رات مجھے ایک صاحب کے مکان جانے کا اتفاق ہوا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ دیوان خانے میں برآمد ہیں اور کھانا کھا رہے ہیں۔

دو طالب علم ہاتھ میں جوابی پرچے لئے سامنے بیٹھے ہیں۔ ایک خاموشی سے مطالعہ کر رہا ہے۔ اور دوسرا آواز سے پرچہ پڑھ رہا ہے۔ اُستاد صاحب نہ صرف سن رہے ہیں بلکہ جوابات کی ناموزونیت پر تنقید بھی کر رہے ہیں اور اکثر دفعہ دوبارہ سہ بارہ پڑھوا کر نمبر دیتے ہیں مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا جناب ایک وقت میں دو کام کیسے۔ یا تو کھانا کھائیے یا پرچے دیکھئے۔ فرمانے لگے اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں نے کہا آپ کو جو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھوانے کی ضرورت ہو رہی ہے وہ خود ہرج کی کافی دلیل ہے۔ کہا کیا خوب۔ یہ تو نئی منطق ہے ہم تو یہ جانتے ہیں کھانا باتوں میں خوب کھایا جاتا ہے۔ میں نے کہا کیا غضب ہے آپ ان کو باتیں سمجھ رہے ہیں حالاں کہ یہ صحت کی گھاتیں ہیں۔ بالاخر کہنے لگے کہ میں ڈاکٹر تو ہوں نہیں۔ مدرس ہوں۔ کل مجھے نتیجہ داخل کرنا ہے۔ ندامت کی صحت سے سرخ روئی کی علالت بہتر ہے۔

مدرسین اور طلبہ عام طور پر اصول حفظان صحت کی پابندی میں جو غفلت برتتے ہیں اُس کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ حفظان صحت کی ضروری تعلیم نصاب میں داخل نہیں ہے۔ قدر و قیمت اور ضرورت کے لحاظ سے اس کی تعلیم ناگزیر اور نسبتاً مقدم ہے۔ اگر اس خصوص میں یہ سوال پیدا ہو کہ مضامین کی کثرت اور درسی کتب کے مقررہ حجم کی زیادتی کے سبب نصاب میں مزید اضافے کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غیر ضروری اور نسبتاً کم اہمیت رکھنے والے مضامین نصاب سے خارج کئے جائیں اور کتابوں کے حجم مقررہ میں بھی کمی کر دی جائے۔ میری ذاتی رائے میں مناسب یہ ہوگا کہ ملکی آب و ہوا۔ رسم و رواج۔ اور طریقہ بود و باش وغیرہ کو ملحوظ رکھ کر دارالترجمے کے شعبہ طب سے سرکاری طور پر ایک جامع کتاب تالیف یا تصنیف کرائی جائے جس کی تعلیم تندرستی کی ضامن ہو۔ اس کتاب کے مناسب حال مختلف حصوں کی تعلیم صغیر سے میٹرک تک لازمی قرار دی جائے۔ البتہ ابتدائی جماعتوں میں دیگر مضامین کی طرح اس کی تعلیم بھی زبانی ہوا کرے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اب عام لاعلمی اور عدم پابندی کے سبب صحت میں جو خرابیاں رونما ہوا کرتی ہیں اگر اُن سب کا ازالہ نہ بھی ہو سکے تو ان میں رفتہ رفتہ نمایاں کمی ضرور ہو جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ صحت کا تھوڑا سا فائدہ بھی کسی بہت بڑے مالی فائدے سے بدرجہا بہتر اور قابل قدر ہوتا ہے۔

سید غلام محمود

صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج بلدہ

رُوداد آل ایشیائی تعلیمی کانفرنس

(پہلا اجلاس)

۲۶ ڈسمبر ۳۰ء

کانفرنس مذکور کا پہلا جلسہ بتاریخ ۲۶ ڈسمبر ۳۰ء سنٹرل ہندو کالج بنارس کے وسیع میدان میں بڑے رونق کے ساتھ منعقد ہوا۔ بڑے بڑے شامیانے نصب کئے گئے تھے اور پنڈال کو اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ جابجا قومی لیڈروں، ماہرین تعلیم اور مشاہیر ہندوستان اور انگلستان کی تصویریں آویزاں تھیں۔ پلیٹ فارم کی آرائش و زیبائش اپنی شان و شوکت کے اعتبار سے خالص ایشیائی مذاق کی تھی۔ سینکڑوں رضاکار مصروف انتظام نظر آتے تھے۔ شائقین سے پورا پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا تقریباً پندرہ ہزار کا مجمع ہوگا۔ بہت سے اشخاص کو نشستوں کی کمی کے باعث کھڑا رہنا پڑا۔

کانفرنس کا افتتاح راجہ صاحب کاشی ہز ہائی نس لفٹنٹ کرنیل مہاراجہ سر پربھو نرائن سنگھ بہادر جی۔ سی۔ ایس۔ آئی، ایل ایل۔ ڈی نے فرمایا۔ ممدوح کی تشریف آوری کے بعد جو بڑے تزک و احتشام سے ہوئی زنانہ کالج بنارس کے طالبات نے ہندی کے ترانے اور سنسکرت کے اشلوک سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

کانفرنس کے نمایندے ہندوستان کے چپے چپے سے آئے تھے غالباً تین سو سے زیادہ، صرف احاطۂ مدارس کے تھے۔ ان کے علاوہ چین، جاپان، لنکا اور جزائر فلپین سے بھی نمایندوں نے شرکت کی ہز ہائی نس مہاراجہ بنارس نے ازراہ نوازش اس کانفرنس کی سرپرستی فرمائی اور اس کی کامیابی میں دلچسپی لی۔ خطبہ افتتاحیہ ان کے پرائیویٹ سکرٹری نے پڑھا۔ ممدوح ذیشان نے فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگوں کا غور و فکر مشرقی علوم و فنون کے احیاء کے لئے ضامن ہوگا اور اس اجتماع سے رشتہ اتحاد مضبوط ہونے کے علاوہ مشرقی تہذیب اور شائستگی کی نہ صرف ترقی ہوگی بلکہ اس میں چار چاند لگ جائیں گے۔ قومی اور بین الاقوامی صلاح و فلاح و یگانگت کو پیش نظر رکھ کر جو تعلیم دی جائے گی وہ یقینی ہے کہ ملک میں بے حد بارآور ہوگی۔ وہ تعلیم جس کی بُنیاد مساوات، دوستی، محبت، ہمدردی اور اتحاد پر ہو اور جو جہل بغض حسد اور باہمی عناد کے دُور کرنے میں کامیاب ہو وہ ایشیائی تہذیب و شائستگی اور مشرقی نشأۃ ثانیہ کا موجب ہوگی۔ آپ نے اس بات کو بھی واضح کیا کہ قدیم زمانے میں مشرق مغرب سے الگ تھا مگر اب دونوں کے

درمیان غیر منفک اور مستحکم تعلقات قائم ہو چکے ہیں ایسی صورت میں شرقی اور مغربی تہذیب و شائستگی کا دانش مندانہ امتزاج ضروری ہے جس سے یقین ہے کہ چار دانگ عالم میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ جائے گی اور وہ عالم گیر اتحاد جو اس وقت خواب و سراب معلوم ہوتا ہے حاصل ہو جائے گا۔

تعلیم کے مسئلہ پر پہلے سے کہیں زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے سب سے پیشتر ایک ارفع و اعلیٰ مقصد تعلیم کا تعین ہونا چاہئے۔ مغرب میں سماجی افادیت (Social usefulness) تعلیم کا منتہائے مقصد ہے مگر ہمارے لئے یہ کوئی بلند نصب العین نہ ہوگا تاوقتیکہ ایک تعلیم یافتہ شخص یہ نہ محسوس کرے کہ جو روح اس کے جسم میں کارفرما ہے وہی ایک حبشی میں بھی موجود ہے اس وقت تک عالم گیر اخوت حاصل نہیں ہو سکتی۔ مغربی مفکرین اس کو بخوبی محسوس کر رہے ہیں کہ تعلیم کی بنیاد روحانیت پر ہونی چاہئے۔ روحانیت ہندوستان کی میراث ہے۔ لہذا تعلیم کا مقصد صرف یہی نہ ہونا چاہیئے کہ لڑکا تعلیم پا کر سماج میں حصہ لے سکے"

اس افتتاحیہ خطبہ کے اختتام پر ڈاکٹر رادھا کرشنن پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی و صدر کانفرنس کرسی صدارت پر متمکن ہوئے اور استقبالی کمیٹی کی طرف سے پرنسپل شیشاوری صاحب پروفیسر دھرو اور وائس چانسلر بنارس یونیورسٹی، راجہ موتی چند اور راجہ بہادر خوش حال پال سنگھ وزیر تعلیمات اودھ نے تقریریں کیں۔ راجہ موتی چند بہادر نے فرمایا کہ اغیار طنز کے طور پر کہتے ہیں کہ سرزمین ہندوستان مختلف مذاہب و ملل کا مسکن ہے اور اس بڑے براعظم (ایشیا) میں اتحاد عمل اور یگانگت مفقود ہے میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ اس کانفرنس سے اغیار کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ یہ مجمع اُن نمائندوں پر مشتمل ہے جو ہندوستان کے ہر حصہ سے آئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جزائر فلپین، لنکا، برما، جاپان اور چین کے نمائندے بھی اس کانفرنس میں موجود ہیں۔ کیا یہ امر طمانیت بخش نہیں ہے کہ امریکہ جیسے دور و دراز ملک کے نمائندے بھی ہمارے درمیان ہیں۔

جناب وزیر صاحب تعلیمات صوبہ اودھ نے حاضرین جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے صوبہ مذکور کی تعلیمی ترقی کا ذکر کیا جو گورنمنٹ کی نگرانی میں ہو رہی ہے اور اُن مساعی کو بیان فرمایا جو مقاصد تعلیم کو روبکار لانے میں کی جا رہی ہیں۔ شیشاوری صاحب نے نمایندگان کانفرنس کا خیر مقدم ادا کرتے ہوئے مختلف تعلیمی مسائل پر روشنی ڈالی۔ مسئلہ بے علمی کے متعلق کہا کہ یہ سب سے اہم مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں خواندہ اشخاص کی تعداد صرف ۱۴ فی صد ہے اور خواندہ اناث سو میں صرف دو ہیں۔ زیر تعلیم طلبا اور مجموعی آبادی کا تناسب تقریباً ۶ فی صد ہے حالانکہ تمام ممالک کا تناسب مسلمہ طور پر ۱۵ فی صد مان لیا گیا ہے اس عام بے علمی کو دور کرنے کے لئے بائیس کروڑ سالانہ اخراجات کی ضرورت ہوگی۔ صوبہ بنگال نے اس

معاملہ میں پیش قدمی کی ہے اور قانون نافذ کر دیا ہے جس کی رُو سے پورے صوبہ میں تحتانی تعلیم دس سال کے اندر مفت اور جبری کر دی جائے گی یقین ہے کہ جن اصول پر بنگال میں کام کیا جارہا ہے اس کی تقلید دوسرے صوبوں میں بھی کی جائے گی۔

ثانوی مدارس میں ۸ لاکھ طالب علم زیر تعلیم ہیں اس میں بھی بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے اصلاح ایسی ہو کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد لڑکے اس قابل ہو جائیں کہ یا تو وہ کوئی پیشہ اختیار کر سکیں یا آگے تعلیم جاری رکھیں۔ ہندوستان کی ۱۸ یونیورسٹیوں (بشمول برما و دیسی ریاست) اور ان کی تعداد داخلہ ایک لاکھ سالانہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ ہماری یونیورسٹیوں نے یہ محسوس کیا کہ امتحان پاس کرانے اور ڈگری عطا کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی اُن کے فرائض ہیں بحیثیت مجموعی ہماری یونیورسٹیوں کی حالت غنیمت ہے مگر مغرب کی درس گاہوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ صحیح معیار کو پہنچنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ طبقہ اناث کے ناخواندگی کا ذکر کرتے ہوئے پرنسپل صاحب نے فرمایا کہ ہمارا ملک اس لحاظ سے بہت بدقسمت ہے۔ گو خود عورتوں میں خاصی بیداری پیدا ہوگئی ہے مگر ہر توسیع یا ترقی تعلیم کی اسکیم میں عورتوں کی تعلیم کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ پروفیسر شیشادری نے آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس ایسوسی ایشنس کی جانب سے نمایندگان کانفرنس کا شکریہ ادا کیا اور اس اجتماع کو ایشیا کی بیداری کا فال نیک قرار دیتے ہوئے اپنی تقریر ختم کی۔

اس کے بعد ڈاکٹر ایس رادھا کرشن صدر کانفرنس نے برجستہ تقریر کی۔ وقت کی قلت اور گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے وہ کوئی خطبہ تیار نہ کر سکے۔

آپ نے اپنے صدر منتخب کئے جانے پر کارکنان کانفرنس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "اس وقت کرسی صدارت کے لئے مجھ سے بہتر اور موزوں شخص کا انتخاب نہ ہو سکا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ بانیان کانفرنس نے پیش بینی سے کام نہیں لیا بلکہ اصلی سبب یہ ہے کہ ہندوستان کے ممتاز افراد بشمول ماہرین تعلیم سیاسی اُمور میں منہمک ہیں۔ چونکہ یہ کانفرنس "ورلڈ فیڈریشن آف ٹیچرس" کے تحت منعقد ہو رہی ہے اس لئے اس کانفرنس کے ذریعہ ایشیائی ممالک کا رشتہ ارتباط میں منسلک ہونا کسی کوتاہ بینی یا محدود قومیت پر محمول نہ ہونا چاہئے بلکہ یہ اتحاد، اتحادِ عالم کا ایک ذریعہ ثابت ہوگا۔ ایشیا اور یورپ میں اگر اختلاف ہے تو یہ کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ بہت سے لوگ یورپ کو ایشیا کا جزیرہ نما کہتے ہیں اگر اقوام یورپ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایشیائی اقوام میں اور اُن میں کوئی اصلی فرق نہیں ہے اس حیثیت سے یورپ کو ایشیا کی نوآبادی کہنا چاہیئے"

پروفیسر صاحب نے یہ یقین ظاہر کیا کہ اس کانفرنس سے مشرقی تہذیب و شائستگی اور مغرب کے تجربات سائنس کا ایسا امتزاج عمل میں آئے گا جو ہمارے لئے مفید ہو یقین ہے کہ اب نوع انسان کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوگا جس کا دارومدار ماہرین فن تعلیم کے تصفیہ پر ہوگا۔ آپ انھیں (ماہرین تعلیم) یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ یہ دو بڑے براعظم ایشیا اور یورپ دوست کی حیثیت سے ملیں گے یا دشمن کی طرح۔ اگر اخیر صورت تجویز کی جائے تو تمام دنیا کا امن خطرہ سے خالی نہ ہوگا اور بعید کیا کہ بدترین مصائب اور آلام سے دوچار ہونا پڑے۔ جو بے شبہ گذشتہ جنگ عظیم سے بھی سخت تر ہوں گے۔ ہمیں چاہیئے کہ سیاسی اقتصادی اور سماجی مسائل کو باہمی اعتماد اور فراخ دلی کے ساتھ حل کریں یہ اجتماع اس لئے ہوا ہے کہ بنی نوع انسان کو ایسے رشتۂ اتحاد میں منسلک کردے، جو سماج میں ہمدردی اور فراخ دلی کی لہر ایک سرے سے دوسرے تک دوڑا دے۔ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ تعلیم کا مقصد ہر جگہ جداگانہ غرض و غایت کی تکمیل قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ ہندوستانی اچھے اور قابل شہری بنیں جرمنی میں باقاعدہ اور منظم غور و فکر کا حاصل کرنا تعلیم کا مقصد ہے۔ فرانس میں دماغی تہذیب و شائستگی مگر ہندوستان میں زیادہ زور اب تک روحانی قدر و قیمت اور اس کی فوقیت پر دیا جاتا رہا ہے جہاں تک کہ روح انسانی اور اس کے انجام کا تعلق ہے مشرق اور مغرب میں کوئی امتیاز نہیں۔

خطبہ صدارت ختم ہونے کے بعد ہی راجہ موتی چند بہادر کی جانب سے گارڈن پارٹی کا انتظام کیا گیا مگر کچھ ایسی ہڑبونگ مچی کہ خدا کی پناہ۔ ظاہر ہے کہ پندرہ ہزار اشخاص کی ضیافت کا انتظام کوئی آسان کام نہ تھا۔ شب میں طلسمی فانوس کے ذریعہ لکچر ہوا جس میں اچھی خاصی رونق تھی۔

دوسرا اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۹۳۰ء

گیارہ بجے مسٹر آے۔ ایچ مکنزی ناظم تعلیمات صوبہ آگرہ و اودھ نے نمائش کا افتتاح فرماتے ہوئے معنی خیز تقریر کی جو علیحدہ درج کی گئی ہے۔

اس تقریر کے بعد ہزارہا اشخاص نمائش کے کمروں میں پہنچے جس کے لئے متعدد کمرے مختص کئے گئے تھے تقریباً ہر شعبہ کے لئے ایک کمرہ تھا۔ تاریخ، جغرافیہ، حفظان صحت، طریقہ مانٹی سوری، آلات تعلیمی مصوری و نقاشی، مصنوعات ملکی و اشیا تیار کردہ ہندو یونیورسٹی شعبہ ٹکنالوجی وغیرہ کے لئے الگ الگ کمرے تھے ہندوستان کے مشہور کتب فروشوں کے شو روم بھی تھے۔ طالبات کی تیار کی ہوئی چیزوں کو علیحدہ جگہ دی گئی تھی۔ نمائش کے انتظامات نہایت وسیع پیمانے پر کئے گئے تھے ہزارہا چیزیں نمائش کی

موجود تھیں۔ صناعی جدت اور اختراع کے بیسیوں بہترین نمونے پائے گئے۔ میسور اور بڑودہ نے ایک ایک کمرہ گھیر رکھا تھا۔ آخر الذکر نے گشتی کتب خانہ کی تنظیم، طریقہ کار اور اُس کے فوائد نقشوں اور خاکوں وغیرہ سے ظاہر کیے تھے۔ میسور سے ہر قسم کی چیزیں طلبہ وطالبات کی آئی تھی، جن میں دستکاری کے نمونے قابل تعریف تھے۔ بحیثیت مجموعی نمائش نہایت ہی کامیاب اور شاندار رہی۔ دوپہر میں ورزش جسمانی اور بائے اسکاؤٹ کے کرتب دکھلائے گئے۔ دیسی ورزش اور سپہ گری کے کرتب پھیک، بیٹ، بنوٹ تیر اندازی شمشیر زنی اور جو جٹسو وغیرہ غرض کہ جملہ دیسی چیزوں کے مظاہرے کیے گئے اکثر کرتب نہایت ہی حیرت انگیز تھے۔ اس کے بعد ہی بیک وقت تین جلسے مختلف کمروں میں شروع ہوئے۔ سنسکرت کی ایک شاخ تھی؛ عربی اور فارسی کی ایک اور ثانوی تعلیم کی ایک جداگانہ سنسکرت کے جلسہ میں حاضرین کی تعداد خاصی تھی۔ عربی اور فارسی میں گنتی کے آٹھ یا دس اشخاص بشمول پریسڈنٹ موجود تھے ہاں ثانوی تعلیم کے جلسہ میں خوب رونق تھی۔ مسٹر کے۔ ایچ ڈنگ ایم۔ اے (کلمبیا) جن کا تعلق پٹ شنگ اکاڈیمی کینٹن سے ہے صدر جلسہ مقرر ہوئے۔ موصوف نے ثانوی تعلیم کا طریقہ جو وہاں امریکہ کی تقلید میں رائج ہے بیان کیا چین میں ثانوی تعلیم کے دو سکشن ہیں ایک کو جونیر مڈل سکشن اور دوسرے کو سینیر مڈل سکشن کہتے ہیں۔ اول الذکر میں چینی زبان، جغرافیہ سائنس دینیات، انگریزی، تاریخ اور دوسرے مضامین سکھائے جاتے ہیں۔ آخر الذکر کے مختلف شعبہ ہیں مثلاً اصول تعلیم، زراعت، تجارت، فنون لطیفہ وغیرہ۔ ان مدارس میں مقامی ماحول کے اعتبار سے تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر کہیں تجارت کی تعلیم مقامی حالات کے اعتبار سے دینے کی ضرورت ہے تو وہاں سینیر مڈل اسکول اُسی شعبہ کا قائم کیا جائے گا۔ اس وقت چین میں ایک ہزار مڈل اسکول ہیں۔ حال ہی میں یہ تصفیہ ہوا ہے کہ ہر ضلع میں جن کی تعداد ۱۹۰۰ ہے ایک ایک مڈل اسکول قائم کیا جائے صدر صاحب کی تقریر کے بعد سلطان محی الدین صاحب ایم۔ اے؛ ایم۔ ایڈ نے میسور کی فنی تعلیم پر بسیط مضمون پڑھا فلپین کی ثانوی تعلیم اور دوسرے صوبوں کے تجارب معرض بحث میں آئے۔ تنگی وقت کے باعث پورے مضامین پڑھے نہ جاسکے شام میں میجک لنٹرن کے ذریعہ سے بڑی دلچسپ تقریریں کی گئیں جن سے حاضرین کے معلومات میں مفید اضافہ ہوا۔

تیسرا اجلاس ۲۸ دسمبر ۳۰ء

یہ اجلاس تعلیم یونیورسٹی سے متعلق زیر صدارت جسٹس سلیمان منعقد ہوا۔ پروفیسر وحید الرحمن صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی پر ایک تحریر پڑھی جو مولوی حمید احمد صاحب انصاری رجسٹرار

عثمانیہ یونیورسٹی کی تیار کی ہوئی تھی۔ اس پر ذرا گرم مباحثہ چھڑ گیا مولوی عبدالرحمن خاں صاحب پرنسپل جامعہ عثمانیہ نے اعتراضات کے جواب دئے۔

حفظان صحت، ورزش جسمانی اور عام صحت سے متعلق بھی جلسے ہوئے۔ ایک چیز قابل تعریف یہ دیکھی گئی کہ چھوٹے چھوٹے رسالے اردو انگریزی اور دیسی زبانوں میں چیچک، پلیگ، ہیضہ میعادی بخار اور دوسرے کئی امراض کے مفت تقسیم کئے گئے۔

سہ پہر میں کوئی پانچ جلسے ایک ہی وقت میں کئی کمروں میں منعقد ہوئے۔ مسٹر نیوٹن موہن دت ناظم کتب خانہ بروڈہ نے صدارت کی۔ اس شعبہ میں متعدد پرچے امریکہ جرمنی چین اور جاپان وغیرہ سے وصول ہوئے۔

شام میں عطیہ بیگم، ڈاکٹر ضیاءالدین اور ڈاکٹر بھگوان داس کی تقریریں ہوئیں۔ ڈاکٹر بھگوان داس کی تقریر ''ایشیائی تخیل'' پر نہایت بسیط اور فاضلانہ تھی۔

۲۹ و ۳۰ دسمبر ۳۰ء عیسوی

بارش کی وجہ سے بعد کے جلسوں میں بے ترتیبی پیدا ہوگئی۔ پنڈال کا کچھ حصہ گر گیا اور اس میں پانی بھر آیا تھا پرنسپل سانجیوراؤ بنارس کی تقریر ''ہندوستان کے بڑھنے والے مدارس'' پر مطلق سنی نہیں گئی۔ دو منٹ میں موصوف نے تقریر بند کر کے وعدہ کیا کہ وہ اپنی تقریر کسی اخبار میں چھاپ دیں گے۔ اس کے بعد سید فیضی رحمن اور پروفیسر کلکرنی کی تقریروں کا تقریباً وہی حشر ہوا۔ ایک طرف موسلادھار بارش دوسری طرف آکنشر صوت کا جواب دے دینا بڑی بدمزگی اور بے چینی کا باعث ہوئے۔

دوسرے دن دوپہر سے شعبۂ تعلیم نسواں کا اجلاس ہوا۔ آج کے جلسوں میں پھر کچھ سابقہ رونق عود کر آئی پنڈت مدن موہن مالویہ صدر استقبالیہ کمیٹی جو حراست میں رہنے کی وجہ سے شریک جلسہ نہ ہو سکے، اخیر اجلاس میں تشریف لائے۔ حاضرین جلسہ نے جوش و تپاک کے ساتھ استقبال کیا اور پروفیسر شیشادری نے خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ پنڈت جی باوجود علالت و کمزوری و ممانعت ڈاکٹر تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ آل ایشیا کانفرنس نے مسئلہ تعلیم کو سلجھانے اور حل کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے جو تمام مسائل سے اہم ہے۔ اگر یہ گتھی سلجھ گئی تو سمجھ لینا چاہئے کہ تمام گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ اسی پر ہماری کامیابی کا دارومدار اور ترقی کا انحصار ہے علم کسی کی میراث نہیں ہے اور تعلیم کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام بنی آدم سے ہے۔ اس عالم گیر

برادری کی تشکیل اور آپس کی یکجہتی و اتفاق، رواداری امن و امان، یہی وہ چیزیں ہیں جو ہر ماہر تعلیم کے پیش نظر ہیں۔

اس تقریر کے بعد پیام تہنیت و تبریک پڑھے گئے اور الوداعی تقریروں کے بعد یہ بارونق اجتماع منتشر ہوا۔

عبد النور صدیقی

ناخواندگی اور تعلیم بالغان

جبری تعلیم کے ساٹھ سالہ نفاذ کے بعد بھی انگلستان میں ان پڑھ اشخاص موجود ہیں یورپ کے مغربی صوبوں میں قریب قریب یہی حالت ہے۔ اور مشرق میں ناخواندگی اس سے بڑھی ہوئی ہے پولینڈ میں ۳۳ فی اور سویٹ روس میں ۵۵ فی صدی تعلیم یافتہ ہیں۔

بخلاف اس کے ایشیا میں بے علمی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رو سے ہندوستان میں دو کروڑ انتیس لاکھ تعلیم یافتہ اشخاص تھے جن میں اناث کی تعداد صرف تیس لاکھ تھی اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ناخواندگی کے اعداد بہ لحاظ آبادی کس قدر افسوس ناک ہیں ذکور میں بیس سال کی عمر سے اوپر صرف ۱۸ فی صد اور اناث میں ۲½ فی صد پڑھنے لکھنے کے قابل ہیں اگر برما کو ہندوستان سے خارج کر کے دیکھا جائے تو اور بھی افسوس ناک اعداد ہوں گے۔

حال حال میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ شہروں اور قصبوں میں پختہ عمر اشخاص کو تعلیم دی جائے اور خواندہ بنایا جائے۔ جدید اعداد و شمار کی رو سے ۱۹۲۶ء تک گیارہ ہزار مدارس بالغان قائم ہو چکے ہیں جن کی آبادی دو لاکھ اسی ہزار ہے۔ سب سے زیادہ مدراس میں ۵۲۸۷ مدارس ہیں جن میں ۱۰۳۶۶۲۶ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ چوں کہ اس صوبہ میں کم عمر اور پختہ عمر دونوں قسم کے طلبہ ساتھ ساتھ ایک ہی مدرسہ میں پڑھتے ہیں اس لئے اس صوبہ کے کام کا اندازہ مشکل ہے۔ ناخواندگی کے دور کرنے میں صرف بنگال اور پنجاب نے موثر طریقہ اختیار کیا چنانچہ ۱۹۲۶ء تک پنجاب میں مدارس شبینہ ۳۰۷۸۶ اور زیر تعلیم اشخاص نو لاکھ پچاسی ہزار تھے جن میں سب کے سب بالغ العمر اور زراعت پیشہ تھے۔ اس طرح بنگال میں مدارس شبینہ ۱۴۴۵ اور زیر تعلیم اشخاص ۲۷۰۷۳ ہیں۔

ہندوستان کے مدارس شبینہ اسی قسم کی تدابیر ہندوستانی ریاستوں میں بھی اختیار کی گئی ہیں جن میں

کوچن قابل ذکر ہے۔ بڑودہ میں سنہ ۱۹۱۰ء کے نافذ کردہ جبری قانون پر کامل بھروسہ کیا گیا اور کسی قسم کی مزید کوشش کو غیر ضروری سمجھا گیا۔ بریں ہم سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری سے واضح ہے کہ دس سال سے زیادہ عمر کے طلبہ کی ۸۰ فی صدی تعداد خواندہ ہے۔

مدرسہ بالغاں عام طور سے رات میں ہوا کرتے ہیں اور اس کے مصارف بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتے دیہات میں بچوں کے مدارس کے معلمین کے علاوہ اور مدرسین نہیں ملتے اس لئے انھیں پانچ یا دس روپیہ کا الونس شام میں گھنٹہ دو گھنٹہ کام کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

دوسرے متفرق اخراجات تین چار روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں ہوتے۔ اس طرح مدرسہ شبینہ کے لئے ۱۵۰ روپیہ سالانہ کے اخراجات درکار ہیں۔ پہلے سال میں عموماً لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب سکھایا جاتا ہے۔ اگر ایک سال کے بعد ۵۰ فی صد طالب علم معمولی امتحان لٹریسی ٹسٹ پاس ہو گئے تو مدرسہ کو قابل مبارک باد سمجھنا چاہیئے۔ ابتداءً طلبہ شوق سے شریک ہوتے ہیں مگر بعد میں دن بھر کی تکان، گرمی کی شدت یا دوست احباب کے ہنسی مذاق کے باعث طلبہ کی کافی تعداد تعلیم کو خیرباد کہتی ہے۔ اس پر بھی اکثر و بیشتر شوق و ذوق کے آثار مشاہدہ کئے جاتے ہیں مثلاً ایک نوجوان کسان ہل چلانے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے پہلی کتاب کے ایک آدھ لفظ پر غلط انداز نظر ڈال لیتا ہے، گاؤں کا پٹیل جمع بندی کے تختہ میں منہمک نظر آتا ہے یا یہ دیکھا گیا کہ مدرسہ بالغان کی کانفرنس میں ایک کانا امتحان کی سند خوشی خوشی ہاتھ میں لے کر یہ کہتا ہے کہ اُسے محنت مزدوری سے نجات مل گئی اور اب اچھے دن لوٹیں گے۔

کُتب خانے | جیسے جیسے پبلک خواندہ ہوتی جائے ویسے خواندہ کی تعداد کو برقرار رکھنے کی ضرورت بڑھتی جائے گی اور ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہو گی کہ انھیں بھول کر جاہل بننے کا موقع نہ ملے۔ دیہات میں کتابیں اور اخبار میسر نہیں آتے اس لئے چوتھی جماعت تک محنت سے تعلیم حاصل کئے ہوئے طلبہ چھ مہینے میں جو کچھ حاصل کیا تھا بھول جاتے ہیں لہذا ان طلبہ اور مدارس شبینہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی خاطر قصبات اور دیہات میں کتب خانوں کا قیام ازبس ضروری ہے یہ کتب خانے ایسے مدرسین کی نگرانی میں دئے جائیں جو فارغ التعلیم طلبہ کو مشورہ دیتے رہیں کہ کس قسم کی کتابیں اُن کے لئے مفید ہوں گی اور کن کا مطالعہ وہ جاری رکھیں نیز اس کا انتظام بھی رکھا جائے کہ دلچسپ اور مفید مضامین بآواز بلند ناخواندہ اشخاص کو پڑھ کر سنائے جائیں۔

ناخواندگی کے دُور کرنے میں سرکاری جد و جہد کے ساتھ ساتھ غیر سرکاری جماعتیں بھی گورنمنٹ کا ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ ہندوستانی جامعات میں شاذ و نادر "اکسٹنشن لکچرس" کا انتظام ہوتا ہے۔ بمبئی، رنگون

اور اودھ کی جماعتوں نے تھوڑی بہت کوشش کی مگر دیہات اور قصبات میں نقل و حرکت کے ذرائع نہ ہونے سے موانعات پیش آ رہی ہیں۔ ہندوستانی انجمنیں جیسے کلکتہ کی وائی۔ ایم۔ سی۔ اے، پونا کی سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی، طیبار کاری کنسٹرکشن ٹرسٹ اور مدراس کی نیچ اقوام کی تبلیغی انجمنوں وغیرہ نے اتنا وقت نکالا ہے کہ شہروں اور دیہات میں بالغ العمر اشخاص کو نوشت و خواند کی تعلیم کے علاوہ ٹائپ و دستکاری اور عورتوں کے لئے سوزن کاری و حفظان صحت کی تعلیم بھی دی جا سکے۔ ان انجمنوں کی امداد مقامی حکومتیں بھی کرتی ہیں۔ اس سے کہیں مؤثر پنجاب کی دیہی انجمنیں ہیں، جہاں سرکاری اور غیر سرکاری اتحاد، عوام کی بیداری اور تنظیم میں بدرجۂ اتم کام کر رہا ہے۔ امداد باہمی کے مدارس گو ابھی چند ہی صوبوں تک محدود ہیں مگر دیہات کے دور افتادہ قصبوں میں بڑی سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ کام کر رہے ہیں ان مدارس سے عوام میں حصول علم کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔

غرض کہ دیہاتی بتدریج ترقی کر رہے ہیں۔ چوں کہ جمہوری حکومت خود اختیاری کا دار و مدار اہل دہ کی رائے (ووٹ) پر ہے اس لئے اس کی شدید ضرورت ہے کہ ان کو خواندہ بنایا جائے تاکہ سمجھ بوجھ کر رائے دے سکیں۔

عبدالنور صدیقی

کرم خور پودے

درختوں میں بھی عجیب وغریب خواص وافعال تحقیق ہوئے ہیں جن سے قدرت کی گہری حکمت کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً درختوں میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ غیر نامیاتی اجزا سے نامیاتی اشیا تیار کرتے ہیں جن پر تمام دنیا کے جانوروں اور انسانوں کی غذا کا دارومدار ہے۔ اس کے تیار کرنے کے لئے درخت کرۂ باد سے کاربونک ایسڈ گیس (Carbonic acid) پتوں کے ذریعہ سے جذب کرتے ہیں۔ اس کے بعد دھوپ کی گرمی اور روشنی کے اثر سے پودے کے اندر اس گیس میں ایک عجیب تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یعنی اس کا تمام کاربن (کلسا) شکر اسٹارچ اور دیگر کاربوہائیڈریٹ (Carbohydrates) میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ لیکن اس وقت تک یہ تحقیق نہ ہوسکا کہ یہ تبدیلی کیسے واقع ہوتی ہے۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوا کہ کلوروفل (Chlorophyll) یعنی پتوں میں سبز رنگ کی موجودگی کے بغیر یہ تبدیلی پیش نہیں آسکتی۔

اس کے علاوہ درخت زمین سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ زمین کے اندر پانی میں مختلف قسم کے کھار محلول رہتے ہیں۔ چنانچہ جب درخت کی جڑیں زمین میں سے پانی چوستی ہیں تو اس کے ساتھ یہ حل شدہ کھار بھی اندر جاتے ہیں۔ ان کھاروں سے درخت اپنی ضرورت کے موافق وہ ضروری اجزا لے لیتے ہیں جو بالیدگی اور نمو کے لئے مفید اور کارآمد ہوں۔

دلدل کے اندر جو پودے اگتے ہیں۔ ان کو بعض ضروری اجزا زمین سے نہیں مل سکتے مثلاً نائیٹروجن (Nitrogen) اور اگر ملتے بھی ہیں تو اس قدر کم کہ پودوں کی ضرورت کو کفایت نہیں کرتے۔ چنانچہ ان ضروری اجزا کی کمی کو پورا کرنے کے لئے پودے دیگر ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو پکڑ کر کھا جاتے ہیں۔ اور اس طرح ان کیڑوں سے اپنی نائیٹروجنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ اس وجہ سے دلدل میں اگنے والے پودے بالعموم کرم خور ہوتے ہیں۔ ان کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جو اپنی اپنی مختلف اور مخصوص صورتوں سے اپنے شکار کو جال میں پھانستے اور پکڑتے ہیں۔

ہندوستان میں کرم خور پودوں کی صرف چار نسلیں پائی جاتی ہیں پنگوئی کولا (Pinguicula) ڈروسرا (Drosera) یوٹریکیولیریا (Utricularia) اور

نیپنتھیز (Nepenthas)

پنگوئی کولا کی نسل کہیں کہیں الپائن ہمالیہ میں ملتی ہے۔ اسی لئے اس کو پنگوئی کولا الپائنا (Pinguicula alpina) کہتے ہیں اس پودے کی جڑ کے قریب چاروں طرف چوڑے چوڑے پتوں کا ایک گچھا ہوتا ہے ان پتوں کی بالائی سطح پر بہت سے غدودی بال ہوتے ہیں جو حرکت نہیں کر سکتے یہ بال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ذرا لمبے ہوتے ہیں جن میں سے ایک لس دار مادہ نکلتا ہے۔ جب کوئی کیڑا ان پر بیٹھتا ہے۔ تو اس مادہ میں چپک جاتا ہے اور بال اس کو اچھی طرح جکڑ لیتے ہیں۔ اس کے بعد پتوں کے کنارے خود بخود مڑ جاتے ہیں اور کیڑے کو اوپر سے ڈھک لیتے ہیں۔ دوسری قسم کے بال ذرا چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر ہشت خانوی قرصیں ہوتی ہیں جن میں قوت جاذبہ بہت ہوتی ہے۔ ان بالوں میں سے بھی ایک چپکتا ہوا رس نکلتا ہے جو نائیٹروجنی مرکبات کی جوگی میں تیزاب کا کام کرتا ہے۔ اسی کے اثر سے کیڑے کے جسم کے نرم حصے تحلیل ہو کر جذب ہو جاتے ہیں۔ جب کیڑا ہضم ہو جاتا ہے تو پتیوں کے کنارے کھل کر پھر سیدھے ہو جاتے ہیں۔

ڈروسرا کی نسل میں سے ہندوستان میں صرف دو قسم کے پودے پائے جاتے ہیں۔ ایک ڈروسرا برمینیا (Drosera Burmania) جو میدانوں میں ملتا ہے اور دوسرا ڈروسرا لیوناٹا (Drosera Lunata) جو ہمالیہ اور نیلگیری کے پہاڑوں پر ہوتا ہے اس کی سبز سبز پتیوں پر تیز سرخ رنگ کے لاتعداد غدودی بال ہوتے ہیں جو حرکت کر سکتے ہیں ان بالوں کی نوکوں پر چپکنے والے مادے کے چھوٹے چھوٹے قطرے ہوتے ہیں جو دھوپ میں شبنم کے موتیوں کی طرح چمکتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو سن ڈیو (Sun dew) بھی کہتے ہیں۔

چمکدار قطرے
کھلے ہوئے گیرے
جھکے ہوئے گیرے
کیڑا

ڈروسرا کی پتی

ان بالوں میں جو گیرے بھی کہلاتے ہیں خون چوسنے کی قوت ہوتی ہے خوبصورتی دیکھ کر کیڑے آتے ہیں اور ان چمکدار قطروں میں چپک جاتے ہیں۔ اس کے بعد گیرے حرکت کرتے ہیں اور کیڑے کو پتی کے وسط میں لے جاتے ہیں جیسے کیڑا یہاں پہنچتا ہے پتی کے کناروں کے گیرے بھی اندر کے رخ جھک آتے ہیں اور تمام پتیاں ایک گول پیالے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے

بعد غدودوں میں سے ہضمی رس نکل کر کیڑے کے جسم پر گرتا ہے اپنے بچنے کی کوشش میں کیڑا جس قدر زیادہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے اسی قدر اور زیادہ پھنستا ہے۔

حیاتیات کے مشہور محقق چارلس ڈاروں (Charles Darwin) نے اس پودے پر عملی تجربات کرتے ہوئے معلوم کیا کہ جب گیرے جھک جاتے ہیں تو ان میں سے تیزاب نکلتا ہے جو سید ہے گیروں سے نکلے ہوئے رس سے ملکر خمیر تیار کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کے ہضمی رس کی طرح ان پودوں کے افراز میں بھی تیزاب اور خمیر ہوتا ہے چنانچہ جانوروں کے پیٹ میں ہضمی رس غذا پر جو اثر ڈالتے ہیں ان درختوں میں پتیوں کے افراز کا بھی کیڑوں پر وہی اثر پڑتا ہے بالآخر غذا کا ہضم شدہ حصہ غدودوں میں جذب ہو جاتا ہے۔ پس سن ڈیو بھی جانوروں کی طرح غذا کھا کر اس کو باقاعدہ ہضم کرتا ہے غذا کے جذب ہو جانے کے بعد گیرے پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتے ہیں۔

اگر گیروں کو کسی سخت چیز سے چھوئیں تو ان میں حرکت تو ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن تاوقتیکہ کوئی نامیاتی غذا مثلاً سڑا ہوا گوشت یا ابلے ہوئے انڈے کی سپیدی وغیرہ پتی پر نہ ڈالی جائے غدودوں سے ہضمی رس کا افراز نہیں ہوتا۔

یوٹری کولیریا (Utricularia) کی نسل کے پودے پانی میں ڈوبے رہتے ہیں ان میں نہ جڑ ہوتی ہے اور نہ پتیاں۔ بلکہ ان کی سینکوں کی طرح باریک شاخیں پانی کے اندر رہتی ہیں۔ بعض شاخیں جن پر پھول نکلتے ہیں۔ پانی کی سطح کے اوپر آجاتی ہیں۔ ڈوبی ہوئی شاخوں پر ایک عجیب قسم کے پھکنے سے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ان پودوں کو بلیڈر ورٹس (Bladder worts) بھی کہتے ہیں۔ ان پھکنوں میں ایک ایک کھلنے والا دروازہ ہوتا ہے جو اندر کی طرف آسانی سے کھل جاتا ہے۔ چنانچہ پانی کے بہت سے چھوٹے چھوٹے کیڑے اندر گھس جاتے ہیں لیکن دروازہ بند ہو جانے کی وجہ سے پھر باہر نہیں نکل سکتے جب یہ کیڑے اندر مر جاتے ہیں تو ان کے نرم حصے سڑ کر پھکنے کی اندرونی سطح کے شاخوں دار بالوں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اس کی بہت سی قسمیں موجود ہیں جو وہاں کے کھیتوں تالابوں اور بہت سے پہاڑی علاقوں میں بالعموم ملتی ہیں۔

وینس فلائی ٹریپ (Venus fly trap) گوشت خور پودوں کی ایک اور نسل ہے جو کیرولینا (Carolina) میں پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک قسم ڈایونا سا (Dionaea)

ہوتی ہے جس کو اکثر گرم خانوں میں رکھتے ہیں۔ ورنہ عام طور سے یہ نسل کماد میں ہوتی ہے ڈایونا سا کی پتیاں بیچ میں سے چر کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں یہ دونوں حصے وسطی نس پر ایک قبضے سے جڑے رہتے ہیں پتی کے ہر حصے پر بالائی جانب تین لمبے لمبے بال لگے ہوتے ہیں۔ جو بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں یہ بال کمانی کا کام کرتے ہیں جب کوئی کیڑا ان بالوں سے چھو جاتا ہے تو فوراً پتی کے دونوں حصے مڑ کر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اور بالوں کے آپس میں بل کھا جانے کی وجہ سے پھر کھل نہیں سکتے غریب کیڑا بیچ میں دب کر رہ جاتا ہے اور کسی صورت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس کے بعد غدودوں سے ہضمی رس نکلتا ہے اور کچھ دنوں میں جب کیڑا ہضم ہو جاتا ہے تو پتی کے دونوں حصے پھر کھل جاتے ہیں اور شکار کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔

پتی جس کے اندر کیڑا بند ہے

وسطی نس

کھلی ہوئی پتی

حساس بال

وینس فلائی ٹریپ۔ (ڈایونا سا کی پتی)

وینس فلائی ٹریپ کی پتیوں پر کیمیاوی محرکات کا اثر زیادہ نہیں ہوتا لیکن کسی کیڑے کی موجودگی میں پتیاں بہت مضبوطی کے ساتھ بند ہوتی ہیں تاکہ شکار چھوٹ کر باہر نہ نکل سکے۔ لیکن اگر ان بالوں کو کسی پنسل وغیرہ سے چھوا جائے تو یہ پتیاں اتنی قوت سے اور پوری بند نہیں ہوتیں اور فوراً ہی کھل جاتی ہیں البتہ پہلی صورت میں جب تک کیڑا بالکل ہضم نہ ہو جائے نہیں کھلتیں

پچر پلانٹس (Pitcher plants) کی نسل میں پودے اپنا شکار پانی کے ذریعہ سے پکڑتے ہیں۔ اس نسل میں نیپنتھیز (Nepenthes)، سیراسینیا (Sarracenia)، ڈارلنگٹونیا (Darlingtonia) اور سیفیلوٹس (Cephalotus) وغیرہ بہت سی قسمیں ہیں۔ ان کی پتیاں جگ یا صراحی کی شکل کی ہوتی ہیں جن میں اندر پانی بھرا رہتا ہے اسی لئے اس قسم کے پودے پچر پلانٹس کہلاتے ہیں

نیپنتھیز اس نسل کی بہت ہی عام قسم ہے اس میں پودے کی تمام پتی یا اس کا کچھ حصہ جگ کی شکل کا ہوتا ہے جو بالکل ایک ڈھکنی دار سپر نما پترا (Tubular pitcher lamina) سا معلوم ہوتا ہے جگ میں پانی بھرا رہتا ہے جس میں جرثوما (Bacteria) کی موجودگی ہر وقت جما لگتے رہتے ہیں نیپنتھیز میں بھی ہضمی رس نکلتا ہے جسے پیپسن (Pepsin) کہتے ہیں جب کیڑے پانی میں گر کر ڈوب جاتے ہیں تب اس رس کے اثر سے ہضم ہوتے ہیں۔ اس قسم کے پودے ملایا

میں بہت ملتے ہیں لنکا اور کھاسیا پہاڑیوں میں بھی ہوتے ہیں

سیراسینیا کی جگ نما پتیاں

اول تو بہت ہی خوش رنگ اور خوبصورت ہوتی ہیں اس کے علاوہ جگ کے دہانے پر کچھ غدود ہوتے ہیں جن سے شہد نکلتا ہے۔ اسی وجہ سے کیڑے پتیوں پر آکر بیٹھتے ہیں پتیوں کا رنگ بہت خوبصورت سبز ہوتا ہے جس پر تیز سرخ اور گہرے گلابی رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں جب کیڑے پتیوں کے کناروں پر آکر بیٹھتے ہیں تو ان کو شہد کی خوشبو آتی ہے۔ چنانچہ اس کی تلاش میں بیچارے ان رنگین دھاریوں پر چلتے ہیں اور جگ کے دہانے پر شہد کی خوشبو زیادہ تیز آنے کی وجہ سے اندر گھس جاتے ہیں ایک مرتبہ اندر جانے کے بعد پھر ان غریبوں کو باہر لوٹ کر آنا نصیب ہی نہیں ہوتا کیونکہ اندر جگ کے اطراف میں نیچے کو جھکے ہوئے بہت سخت قسم کے بال ہوتے ہیں۔ جو کیڑوں کے باہر نکلنے میں مانع آتے ہیں۔ بیچارے ان بالوں میں الجھ ہاتھ پاؤں مارتے مارتے تھک جاتے ہیں اور نیچے پانی میں گر پڑتے ہیں یہیں پڑے پڑے انکا خاتمہ ہوجاتا ہے

سیراسینیا میں خمیر نہیں ہوتا بلکہ کیڑے کا جسم جرثوما کے اثر سے پانی میں پڑے پڑے سڑ جاتا ہے اور تحلیل ہونے لگتا ہے اور پتیاں اس کو جذب کرلیتی ہیں اس قسم کے پودے بالخصوص امریکہ ہی میں ملتے ہیں

پچر پلانٹس میں جگ کے اوپر بہت شوخ رنگ کا ایک ڈھکنا بھی ہوتا ہے جس کی خوبصورتی سے متاثر ہوکر کیڑے آتے ہیں ان ڈھکنوں میں حرکت کرنے کی قوت نہیں ہوتی چنانچہ ایک مرتبہ کھل جانے کے بعد پھر بند نہیں ہوسکتے۔ ہمیشہ کھلے ہی رہتے ہیں۔ اس نسل کے بہت سے پودے کیڑوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی چڑیوں تک کو بھی اسیطرح کھا جاتا ہے۔

بہت سے کرم خور پودوں میں بھی کافی کلوروفل موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ حسب ضرورت نامیاتی غذا تیار کرسکتے ہیں اور اسی وجہ سے اگر ان کو کیڑے کھانے کو نہ بھی ملیں تو بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ البتہ کیڑے سڑا ہوا گوشت یا ابلے ہوئے انڈے وغیرہ ملجانے سے پودے بہت زیادہ بشاش رہتے ہیں۔ ان کا جوش نمو بہت بڑھ جاتا ہے پھول اور پھلیوں سے لد جاتے ہیں۔ ناظم صدیقی

بی اے بی ٹی آصف آباد

کتب خانہ انجمن اساتذہ بلدہ

اراکین انجمن اساتذہ بلدہ نے اسٹیشن نام پلی کا وہ نظارہ فراموش نہ کیا ہوگا جب کہ عالی جناب محمد حسین جعفری صاحب نائب ناظم تعلیمات اور عالی جناب سید علی اکبر صاحب کو لندن کی شاہی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لئے رخصت کیا گیا تھا جس عقیدت سے صاحبان موصوف کو رخصت کیا گیا اُسی عقیدت کا اظہار صاحبان ممدوح کی مراجعت اور کامیاب نمائندگی پر کرنے کا ارادہ تھا، چنانچہ بطیب خاطر چندے کئے گئے اور خاصی رقم جمع بھی ہوگئی۔ مگر حضرات ممدوح نے بجائے گل پوشی اور ضیافت میں روپیہ صرف ہونے کے اُس کا بہترین مصرف یہ تجویز فرمایا کہ مجتمعہ رقم سے اراکین انجمن اساتذہ بلدہ کے استفادہ کے لئے فن تعلیم پر اُردو اور انگریزی کتابیں خریدی جائیں۔ یہ تجویز ایسی معقول اور مفید تھی کہ سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس طرح انجمن اساتذہ بلدہ کے کتب خانہ کے قیام کی بنا پڑی بڑی خوشی کی بات ہے کہ انگریزی اور اردو کتابوں کا کافی ذخیرہ فراہم کرلیا گیا ہے۔ نواب رُستم جنگ بہادر ناظم کروڑگیری نے از راہ مہربانی انسائیکلو پیڈیا بریٹانکا کی پوری جلدیں عنایت فرمائیں۔ دفتر عالیہ نظامت تعلیمات سے بھی خریدی کتب کے لئے رقم منظور ہونے والی ہے۔ یقین ہے کہ بہت جلد فنی کتابوں کا کافی ذخیرہ مدرسین کے استفادہ کے لئے فراہم ہوجائے گا۔ مجتمعہ رقم سے جتنی کتابیں انگریزی کی خریدی گئیں اُس کی فہرست حیدرآباد ٹیچر کے حصہ انگریزی میں چھپ چکی ہے۔ ذیل میں ہم اُردو کتابوں کی فہرست بھی بغرض اطلاع درج کرتے ہیں:-

	نام کتاب	نام مصنف		نام کتاب	نام مصنف
۱	۲	۳	۱	۲	۳
۱	فلسفہ تعلیم	مترجمہ خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی	۷	طلسم تقدیر	ابوالبرکات سید غلام محی الدین زور
۲	معین مشاہدۂ فطرت	شیخ عبدالحمید صاحب	۸	امور خانہ داری و تربیت اولاد	مترجمہ ای۔ سی۔ نندا
۳	مبادی فلسفہ	سید حسن الدین صاحب	۹	تاریخ ہند حصہ دوم	مترجمہ شیخ عبدالحمید صاحب ایم اے
۴	بصارت طلبہ	مترجمہ لالہ بہاری لال صاحب	۱۰	رہنمائے تعلیم	مترجمہ غلام حسین صاحب قریشی صدیقی
۵	باغبانی و زراعت کا رسالہ	رائے بہادر پنڈت نتھو رام صاحب	۱۱	انتخاب سودا	ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری
۶	طریقہ تعلیم ابجد خوانان	لالہ تلسی رام بی اے۔ بی ٹی	۱۲	شاہ ہنری چہارم	مترجمہ سید وقار احمد صاحب

نمبر	کتاب	مصنف / مترجم
۱۳	فرسٹ ایڈ ٹو دی انجرڈ	ڈاکٹر مرزا کریم خاں صاحب نذیر جنگ
۱۴	معلومات دیہی حصہ اول	غلام رسول صاحب
۱۵	” ” حصہ دوم	” ” ” ”
۱۶	تسہیل التعلیم حصہ اول	سید اصغر علی صاحب بی۔اے۔ بی ٹی
۱۷	رسالہ باغات مدرسہ	مترجمہ لنگا کسرن و اما صاحب
۱۸	اسکوٹ ماسٹر ہینڈ بک	ایچ ڈبلیو ہاگ مولوی کرامت اللہ صاحب
۱۹	جدید رہنمائے علم التعلیم	سردار گوبند سنگھ صاحب گوہر
۲۰	رہنمائے مدرسین لوئر پرائمری	دینا ناتھ شرما
۲۱	اساس التعلیم	محمد عبدالحق صاحب
۲۲	پہلواڑی	لالہ دیوان سنگھ صاحب
۲۳	فلسفہ اجتماع	عبدالماجد صاحب بی۔اے
۲۴	رفیق المعلمین	یس انوار نبی قریشی
۲۵	سالنامہ جامعہ عثمانیہ ۱۳۳۵ و ۱۳۳۶ ف	
۲۶	سیرت و کردار	عبدالرحمن صاحب رئیس
۲۷	سیرۃ المحمود	مولوی محمد عزیز مرزا صاحب
۲۸	تندرستی	محمد واجد علی قادری
۲۹	جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق	مترجمہ محمد عنایت اللہ صاحب بی اے
۳۰	وضع اصطلاحات	مولوی سید وحید الدین صاحب سلیم
۳۱	فطرت اطفال	مترجمہ منشی فاضل مولوی حامد حسن صاحب قادری
۳۲	رہنمائے تعلیم	پنجاب ٹیکسٹ بک سوسائٹی انارکلی لاہور
۳۳	اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم	مترجمہ محمد سلیم صاحب ایم۔اے
۳۴	مادر زاد گونگوں اور بہروں کی تعلیم	خان صاحب ڈاکٹر حافظ فضل احمد صاحب
۳۵	حساب کے سبقوں پر اشارے	لالہ بہاری لال
۳۶	تعلیمی علم النفس	نظیر احمد صاحب بی۔اے
۳۷	اصطلاحات جغرافیہ بطرز جدید	مولفہ پروفیسر قاضی جلال الدین صاحب مرادآبادی
۳۸	روح جاپان (ایک لکچر)	سید الیاس مسعود صاحب (مسعود جنگ)
۳۹	زرعی افلاس ہند	ڈاکٹر جعفر حسن صاحب
۴۰	تاریخ مغربی یورپ جلد اول	مترجمہ محمد یحییٰ صاحب تنہا
۴۱	طالب علم کی زندگی	آغا صفدر
۴۲	فن تعلیم و طریقہ تعلیم کی کتاب	چودھری فیض محمد خاں صاحب
۴۳	تاریخ التعلیم	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد
۴۴	مبادی علم انسانی	مترجمہ عبدالباری صاحب ندوی
۴۵	مکالمات برکلے	عبدالماجد صاحب بی۔اے
۴۶	نفسیات ترغیب	مولفہ سید وہاج
۴۷	فلسفہ جذبات	عبدالماجد بی۔اے
۴۸	اصول و طریقہ تعلیم حساب حصہ اول و دوم	لالہ بہاری لال صاحب
۴۹	ابتدائی مدارس ہند میں تعلیم	مترجمہ مہدی حسن صاحب زبیری
۵۰	برگ سبز	محمد حسین صاحب فاضل
۵۱	ہمارے رسول	خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی
۵۲	روح تنقید	ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب زور
۵۳	مذکرات سال اول	(تخلص حسرت)
۵۴	تعلیم بالغان	سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب)
۵۵	تعلیم روزگاری	محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے (کنٹب)
۵۶	منظر الکرام	سید منظر علی صاحب اشہر
۵۷	تاریخ الامت حصہ ہفتم	محمد اسلم صاحب جیراجپوری
۵۸	التربیت الاستقلالیہ	عبدالسلام صاحب ندوی
۵۹	گلزار نونہال	لالہ خزان چند جاولہ بی۔اے
۶۰	اطوار بازیچہ	ایچ ٹی نولٹن صاحب
۶۱	اصول تعلیم	
۶۲	اشاعۃ القواعد	عبدالخالق صاحب بھیرانوی
۶۳	مطالعہ قدرت و علمی جغرافیہ	لالہ رتن لال ایم اے
۶۴	میوزک فار آل	رائے بہادر لالہ اتما رام صاحب
۶۵	ابتدائی تعلیم حصہ دوم	شیخ اللہ رکھا صاحب
۶۶	پلے فار آل	رائے بہادر لالہ اتما رام صاحب
۶۷	ابتدائی تعلیم	شیخ اللہ رکھا صاحب
۶۸	اشارات جغرافیہ	مولفہ مولوی عبدالخالق صاحب بھیرانوی
۶۹	رسالہ تعلیم و تربیت	شیخ عبدالرؤف صاحب صدیقی

تنقید و تبصرہ

نورس عبدالحق نمبر | اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج کا دو ماہی رسالہ نورس تقریباً چار سال سے مولوی وہاج الدین صاحب کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے اور اپنے مضامین کی عمدگی و ترتیب میں اپنے معاصر رسالوں سے گوئے سبقت لے گیا ہے ہمارے پیش نظر اس رسالہ کا عبدالحق نمبر ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کے نام نامی سے حیدرآباد کیا ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اردو صحافت کی دنیا کا اگر موسس کہا جائے تو بجا ہے۔ ادبی اور تصنیفی خدمات سے قطع نظر، اورنگ آباد کالج کی صدارت کا زمانہ ناقابل فراموش ہے اور اسی زمانہ کی یادگار قائم کرنے کے واسطے یہ نمبر نکالا گیا ہے جو موصوف کی خدمات کا عقیدت مندانہ اعتراف ہے۔

رسالہ ۱۸۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدائی ۱۶۰ صفحون میں ملک کے لائق ادیبوں کے قلم سے لکھے ہوئے ۱۲ بلند پایہ مقالے میں جو مولوی عبدالحق صاحب کی علمی و عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں باقی ۲۷ صفحوں میں سپاسنامے اور وداعی نظمیں درج ہیں۔ شروع میں دو فوٹو دئے گئے ہیں ایک مولانا کا رنگین فوٹو اور دوسرا مولوی سید محی الدین صاحب بی۔ اے بار ایٹ لا موجودہ پرنسپال صاحب کا ہے۔ سرورق پر کالج کی خوبصورت عمارت کی تصویر ہے۔ ہم اس نمبر کی اشاعت پر مولوی وہاج الدین صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اور توقع کرتے ہیں کہ یہ موقر رسالہ اپنی شاندار روایات کو قائم رکھے گا۔ (رسالہ کا چندہ درج نہیں ہے۔

پیام دیہات سدھار | یہ مختصر کتاب مولوی سید خورشید حسن صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی کی تصنیف ہے جو نورمل سکول کے طلبہ کی ہدایت کے لئے لکھی گئی ہے۔ نظری طور سے مدرسین کا حلقہ اثر بہت وسیع سمجھا جاتا ہے اور یہ عام طور پر خیال ہے کہ اگر کسی تحریک کو بارآور کرانا مقصود ہو تو اس کی داغ بیل مدرسین کے مبارک ہاتھوں سے ڈالی جائے۔ اسی نظریہ کی عملی شکل اس کتاب میں بیان کی گئی اور بتایا گیا ہے کہ دیہات کی حالت کو سدھارنے میں دیہات کے مدرسین کیا مہتم بالشان حصہ لے سکتے ہیں۔

زبان بہت صاف و ستھری ہے اور خیالات نہایت دلچسپ پیرایہ میں ظاہر کئے گئے ہیں شروع میں پروپگنڈا کے فوائد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ضمیمہ کے طور پر چند ہندی نظمیں درج کی گئی ہیں جن کا پرچار کر کے عوام کو سدھارا جا سکتا ہے۔ (حجم ۱۸۴ صفحہ۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے قیمت ۶ کلدار۔

طلبہ اوران کی صحت | یہ دوسرا رسالہ بھی منشی طالب علی صاحب پابند توکشی مالک و منیجر اخبار تعلیم لاہور کا شائع کیا ہوا ہے۔ اس کے مصنف پنجاب کے فاضل ادیب مولوی نور احمد صاحب نور مرحوم و مغفور ہیں یہ کتاب آٹھ بابوں پر مشتمل ہے۔ جن میں مدرسہ میں داخل ہونے کی عمر، محنت میں اعتدال، ورزش بدنی، خوراک نیک چلنی، عادات کا

بنانا اور سان کی غفلت پر نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ آخر میں مدرسہ کے ماسٹروں سے التجا کی گئی ہے کہ وہ بچوں کی صحت سے غافل نہ رہیں۔

آج کل طلبہ کی صحت کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ اور اس پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جا رہا ہے۔ ایسے زمانہ میں ہمارے خیال میں اس کتاب کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

حجم ۸۰ صفحہ لکھائی چھپائی پاکیزہ قیمت ۵ر

منتخبات نظم ہندی ہندی اور اردو زبان میں کچھ حقیقی مغائرت نہیں ہے لیکن اختلاف رسم الخط کی وجہ سے دو بہنوں میں لامحدود بے گانگی پیدا ہوگئی ہے۔ اسی کو دور کرنے کے واسطے جامعہ عثمانیہ کے لائق پروفیسر ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی۔ ایچ ڈی نے ہندی نظموں کا انتخاب بنام منتخبات نظم ہندی شائع کیا ہے اس نوعیت کی یہ پہلی کوشش نہیں ہے۔ اس کے پہلے ہی اکثر ہندی داں حضرات نے کلام ہندی کا تعارف اردو خوانوں سے کرایا ہے۔ جذبات بھاشا ایسی کوششوں کا معروف نمونہ ہے لیکن سابقہ تصانیف پر اس کتاب کو فوقیت و برتری اس وجہ سے ہے کہ اس میں ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف عاشقانہ دوہے درج کئے ہیں جو عام طور سے اس قسم کی کتابوں میں بھرے پڑے ہوتے ہیں بلکہ کھوج کرکے فلسفیانہ اور اخلاقی نکات کے متعلق بھی دوہے وغیرہ شامل کردئے ہیں۔ جو ہندی شاعری کو نئی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس جدت طرازی پر قابل مبارکباد ہیں۔

دوہوں کو ناگری اور فارسی دونوں خطوں میں لکھا گیا ہے لیکن اکثر مقامات پر دونوں تحریروں میں فرق ہوگیا ہے اردو تحریر میں اعراب ٹھیک نہیں لگائے گئے اس لئے جو شخص ناگری سے ناواقف ہو وہ دوہوں کو صحیح نہیں پڑھ سکتا ہے۔

دوہوں کے مطالب سمجھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے لیکن اکثر دوہوں کے لفظی معنی پر اکتفا کی گئی ہے اور بعض دوہوں کا مفہوم واضح کرنے کے لئے صفحے کے صفحے سیاہ کئے گئے ہیں۔

یہ بات بار بار کھٹکتی ہے کہ مطالب میں عمرانی مسائل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور جابجا انگریزی الفاظ جو غیر ضروری ہیں توس میں دئے گئے ہیں دوہوں کا انتخاب اچھا ہے لیکن اگر بجائے سنے سنائے دوہوں پر قناعت کرنے کے ڈاکٹر صاحب خود بھی چھان بین کرتے تو ہمیں یقین ہے کہ انتخاب بہتر ہوتا۔

لکھائی چھپائی صاف اور جلد بندی نفیس ہے۔ نفس مضمون کا لحاظ کرتے ہوئے کتاب کا حجم بہت زیادہ اور قیمت بے حد گران یعنی (عہ ۱۲) ہے۔

ناشر دی حیدرآباد بک ڈپو چادرگھاٹ حیدرآباد دکن

ضروری اطّلاع

برائے طلبائے مدارس تحتانیہ وسطانیہ وفوقانیہ چونکہ ٹکسٹ بک کمیٹی
نے نئے سال تعلیمی سے مختلف جماعتوں اور درجوں کے کتب نصاب میں اہم
تغیرات فرمائے ہیں اس لئے ہم نے طلبائے مدارس کی سہولت کے لئے
ان تمام جدید کتب کا کافی اسٹاک فراہم کرلیا ہے جن میں سے اکثر
مطبع ہذا کی مطبوعہ بھی ہیں یا جن کی ایجنسی کتب خانہ ہذا نے حاصل کرلی ہے
خصوصاً انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی مرتبہ کل اردو ریڈرس (پہلی سے
ساتویں تک) جو شریکِ نصاب ہوئی ہیں وہ جماعت صغیر سے تھرڈ فارم تک
کے واسطے ہیں ان تمام ریڈرس کی ایجنسی بھی کتب خانہ ہذا نے حاصل کرلی ہے
جدید منظورہ نصاب کتب کی فہرست کتب خانہ ہذا نے طبع کرائی ہے جو طلب کرنے
پر مفت روانہ کی جاتی ہے امید ہے کہ مدرس صاحبان مدارس طلبہ کو خریدی
کتب میں بموجب نصاب جدید ہدایات فرماکر قدیم کتب کی خریدی سے
احتیاط کرنے کی مناسب تدابیر اختیار فرمائیں گے۔

المشتهر

سید عبدالقادر تاجر کتب و مالک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر چارمینار حیدرآباد دکن

position of women in Moslem society. We agree with him that Purdahas an institution in India is doomed, and we consider that he has done a signal service to his community by drawing attention to the need for preparing children for the new conditions of life which they will have to face when they grow up and by sounding a note of warning against aping western ways and manners. If the Moslem community desires to make its real contribution to Indian civilisation, it must develop its own culture according to the demands of modern life.

The Hyderabad Teacher.

ADVERTISEMENT RATES.

Space.	Whole year.		Six months.		Per issue.	
	B. G.		B. G.		B. G.	
	Rs.	As.	Rs.	As	Rs.	As
Full page ...	10	0	5	0	3	0
Half page ...	5	0	2	12	1	8
Quarter page	2	8	1	6	0	12
Per line ...	0	10	0	8	0	6

SUBSCRIPTION RATES.

For the Nizam's Dominions O. S. Rs. 3 annually, (including potage).
For British India B. G. Rs. 3 a year (including postage).
Single copy O. S. As. 12 for H. E. H. the Nizam's Dominions.
Single copy B.G. As. 12 for British India.

The Urdu Section is published separately also. Subscripton Re. 1-14 As. a year.

S. M. KHAIRATH ALI, MANAGER,
Hyderabad Teacher,
Gun Foundry, Hyderabad-Deccan.

in schools. In this connection, we should like to invite attention to the following passage in the eloquent speech made by Mr. A. H. Mackenzie, Director of Public Instruction, United Provinces, while opening the educational exhibition, which was organised along with the All-Asia Educational Conference at Benares last December.

"Too often in our schools, thought is an inert dead thing, gathered from text books or from teachers' notes. Creative thought is almost a crime in our class rooms. It does not pay in examinations. Pupils are receptacles to be filled. The best student is the one with the greatest power of absorption. The most popular teacher is he who can ram the greatest amount of knowledge in to a given cubic space of hollow head. Whether the pupil can think for himself, whether he can judge for himself, whether he can do things for himself, whether he has any appreciation of beauty, these matters count for too little in our schools. It is, therefore, of great importance that we teachers should keep prominently before ourselves that education must at least revealitself in the development of individuality and the creative spirit."

Dr. Masood Jung's Presidential Address at the All-India Moslem Educational Conference, Benares.

Dr. Nawab Masood Jung's Presidential Address at the Moslem Education Conference held in Benares last December was full of constructive suggestions for the educational and cultural advancement of the Mussalmans. One of these recommendations was that some machinery should be devised to coordinate the efforts of the Osmania University, the Anjumane Taraqqi-e-Urdu and the Hindustani Academy to develop and enrich Urdu language and literature. We strongly support this suggestion and hope that the Osmania University will take the initiative in the matter before long. Dr. Masood spoke with commendable candour on the

Editorial Notes.

The First All-Asia Educational Conference.

We congratulate the All-India Federation of Teachers' Association on the success of the First All-Asia Educational Conference, an account of which appears elsewhere in this issue. It was the best attended educational conference that has ever been held in India. There were not less than 5000 delegates present, representing almost all parts of India. The Conference afforded abundant proof of the great educational awakening that has come over India in recent years. The All-India Federation of Teachers' Associations has been rendering valuable services to the causes of Indian education for the last six years by promoting solidarity among the members of the teaching profession and giving them an opportunity of exchanging views and experiences once a year. To it is also due the credit for organising the First All-Asia Educational Conference, which was a regional Conference of the World Federation of Teachers' Associations. It is a pity that the number of foreign delegates present at this gathering was small; but India has given the lead which other Asiatic countries are prepared to follow, for at the concluding sitting of the Conference, Mr. K. M. Wong, M.A., the Chinese representative, announced that the Second All-Asia Conference would be held in China.

Development of Creative Thought in Schools.

It is seldom realised in India that education in the true sense of the word means the release of faculty and not the accumulation of facts and that the child cannot develop unless he is given opportunities of self-expression. Herein lies the value of organising creative and manual activities

Now if Purdah is given up, as I am sure it will be, radically changed conditions of life will come into existence, which will perhaps be fuller of pitfalls than those in which our women have so far lived. If my reading of the situation is correct, is it not our duty to begin to prepare our children to face the great change which we already see coming in the life of our country? Now is the time when we should make up our minds as to what should form the foundations of our home life. Is the Mussalman woman of the India of tomorrow to be nothing but a third rate copy of her Western sisters, or is she to preserve an individuality of her own in spite of having given up the seclusion which she had hitherto enjoyed and which had protected her from the harsh struggles of competitive life? In other words, is she to follow in the foot-steps of the Turkish women or in those of her Japanese sisters?

Need for Developing Urdu Language and Literature.

The connection between the language of a people and their culture is so intimate that it is not possible to despise the one without despising the other. If the world were to judge us from this point of view, and if it were to take into consideration only the outward appearance of the books printed in our language, what a terribly low opinion it would have of our culture!

Is it not a matter of deep humiliatian that in spite of the fact that there are seventy millions of us, we have not yet succeeded in bringing out a single properly printed and scientifically arranged dictionary of the language we speak? I dread to think where we should have been today if His Exalted Highness the Nizam had not with great foresight devoted his attention to this matter, and by founding a University with our language as its medium of instruction, done his best to save that cultural inheritance of which we have always been proud, but which we have never done anything to safeguard.

There are in our country three big institutions today which are working for the Urdu language, namely, the Osmania University, the Anjuman-i-Taraqqi-i-Urdu and, in these Provinces, the Hindustani Academy. It is high time that some machinery was devised to coordinate their efforts and thereby accelerate and improve both the quantity and the quality of the work that is being done. I recommend that this Conference should appoint for this purpose a committee of five gentlemen on whose report action should be taken without any further delay.

Believing as I firmly do that neither the problem of illiteracy in the broadest sense of the term nor that of national education will really be solved until our vernaculars are made the media of instruction, their development is to me a matter of very great concern. I look forward to the happy day when each great language of our land will be represented by a University of its own.

Extracts from Dr. Nawab Masood Jung's Presidential Address Delivered at the 42nd Session of Muslim Education Conference.

Position of Women.

As I am one of those who look upon women as the guardians of the best traditions of a race, I have been greatly distressed by certain tendencies that I have noticed amongst some of those who have received what is wrongly called Western education. It seems to me that somehow or other the kind of education which is today being imparted to our young girls tends to make them despise the cultural inheritance left to them by their ancestors, and these feelings they are inclined to express by aping in an exceedingly awkward manner the ways of life in a country which must remain to the vast majority of them an unknown land.

Now this ugly tendency can only be checked by arranging that all the educational institutions for our girls should have as teachers women who themselves possess a sound knowledge not only of modern things but also of the past history of Muslim civilisation. This has been the method adopted by Japan where, too, the nation was faced with a similar problem, when in the middle of the 19th century it first came into direct contact with foreign thought and foreign modes of life,

In my opinion we Indian Mussalmans can now do nothing better than make up our minds to boldly adopt such customs, wherever we may find them, as tend to strenghten our society without contravening any basic principle of our religion. The process will necessarily be a long one, but the work must be begun without any further delay. Such customs, for instance, as the unnecessarily early marriage of our girls must be given up; and so far as direct education is concerned, we should revise very carefully the list of subjects that are taught in our girls' schools. As I consider the last a matter of very great importance, I suggest that this Conference should appoint a committee consisting of highly educated Mussalman ladies to whom should be entrusted the work of drawing up the syllabus of studies which in their opinion should be introduced in all the schools for our girls.

Purdah.

This brings me to the vexed question of what should be our attitude towards Purdah. The position, as I see it, is that whether you or I like it or not, the economic and other forces working against the continuance of Purdah are so great that it is safe to predict that in India Purdah as an institution is now doomed. I refuse to believe that Muslim women in India will be content to lead secluded lives behind Purdah walls when all their sisters in other Mohammedan countries of the world do the very opposite.

received with great enthusiasm. Mr. Sheshadri extended welcome to Punditji on behalf of the Conference. Mr. Malaviya thanked him and the delegates for the cordial welcome which had been extended to him and observed " Education is no monopoly of any race or community. The problem of education is the problem of humanity, and how to shape humanity in future, how to change humanity's ideas into those of harmony, peace and good will, is the task that lies before every educator ".

Resolutions.

Resolution were passed expressing the thanks of the Conference to the various bodies political and educational, which had extended help or sympathy to the organisers of the Conference.

Short addresses were delivered by representatives of the provinces appreciating the work of the Conference and the untiring zeal and energy of the office bearers. Mr. Syed Ali Akbar M. A., (Cantab) spoke on this occasion on behalf of the Hyderabad State.

Amusements and excursions:

An All-India Teachers' tennis tournament was run during the Conference days, in which many delegates took part. The nagari Natak Mandali performed a Hindi drama and invited all the delegates to witness the play free of charge.

The closing day of the Conference was set apart for excursions to the Benares Hindu University and to places of historical importance such as Sarnath and the Ghats. Special arrangements were made with the bus agencies to facilitate visits of the delegates to these places.

Dr. Ziauddin, late Pro-Vice-chancellor of the Aligarh Muslim University, delivered an address on Examinations Dr. Anne Besant spoke on "Ideals of Ancient Indian Education" Atiya Faizi Begum Saheba on "Foundation education and academic education" and professor Kulkarni on "The Childhood, Formative Period".

Scout display :—

The Sevasamiti Scout Troop under the command of Mr. Shri Ram Bajpai of Allahabad, Sevasamiti Organising Commissioner, gave very good displays on two successive afternoons. The programme included *inter alia* boxing, self-defence in Lathi play, Lezem exercises, archery and sword play. The performance gave one the impression that the Sevasamiti Scout Organisation was more than a make-believe organisation and that it looked upon scouting as a serious business and as a real training in social service, physical culture and citizenship. To their playground activities was added the management of traffic on the roads leading to the Conference. For this purpose they very successfully used their knowledge of semaphone signalling. They had also set up a cycle stand, a lost property office, a bank and, to crown their *bhagtiprem* (Love of service), they had established a post offiice which received and delivered letters to the great convenience of the delegates.

Ju Jutsu play :—

Another open ground display was given by a band of stalwart youths from Shantinekitan in Ju Jutsu play. This is a new and very useful system for physical training and claims to develope the physique and to build up muscles as no other system can. The performance was very interesting and aroused keen interest and appreciation among the spectators.

The closing Session :—

The announcement that Mr. Madan Mohan Malviya would address the Conference at the last session was

The Health, Hygiene and Physical cutlure, Teachers' training, Parental co-operation, Teachers' Associations and Kindergarten and Montessori Sections held a meeting each, at which interesting papers were read.

In the Primary and Rural Education Section, Mr. Iqbal Narain Gurtu made an impressive speech on the importance of primary education. He slightly remarked that it was time that the country seriously grapped with the vital problem of the extension and expansion of primary education.

The Library Section had the privilege of receiving the largest number of papers, some of which came from other countries. Mr. Newton Mohun Dutt, Chairman and Curator of the State Libraries, Baroda, had the good sense to get all the papers received within the fixed time published in book-form beforehand, so that only the few papers that could not be published were read at the conference. The most interesting and instructive paper was the one written by Mr. Dutt himself in which he explained fully the leading features of the Baroda Library System, which has done so much for the cause of mass education in that state. A resolution appealing to the Librarians, trustees of libraries and others interested in libraries to organise library associations in those provinces and districts where they do not exist, was moved and passed unanimously.

Lectures :—

Apart from the sectional conferences, about a dozen public addresses were delivered in about four instalments, some of them being illustrated with magic lantern slides. Among other eminent educationists, Dr. Bhagwan Dass spoke on the unity of Asiatic thought and by citing apt quotations from sacred books of the Hindus and Mohamadans and Christians and from verses and sayings of mystics and Sanskrit, Persian, Arabic and Urdu poets, he proved that the same fundamental current of thought ran through all Asiatic religions and philosphical systems.

far-reaching importance. The unanimous recommendation of this committee, that the students of these two languages should be subsidized by the Government to go to the lands where they are spoken, presents a contrast to the present policy of the educational authorities who have retained these snbjects on the curriculum merely as a mark of respect for the sentiments of the Muslim community.

The illiteracy and Adult Education Sections had a Joint meeting under the presidency of Atiya Faizi Begum. In an instructive paper Mr. Vilayat Husain gave figures in respect of the appalling illiteracy in India and pointed out that, at the rate India was advancing at present, it would take us centuries to attain universal literacy. Ways and means to combat this awful state of ignorance and to further the cause of literacy were suggested and discussed. Mr. Apte, Honorary Secretary of Adult Education League, Poona, in a brief paper put forward interesting proposals for the vigorous diffusion of adult education. Among other things, he recommended calling into seivice the visual method of instruction. Speaking on the question of compulsory education, Mr. Iqbal Narayan Garu, M. L. C, recomended that compulsory education should begin at the age of 5 years. The President deplored the "rotten" condition of education in the country. The Character and Moral and Religious Section met under the chairmanship of the learned theosophist, Dr. Bhagwandass of the Benares Hindu University. Under his guidance an elaborate scheme of comparative theology was worked out, which, if carried out, would tend to minimise the estrangement due to religious differences and help to bring about a closer unity in thought and action.

The Women's Education Section assembled with Mrs. Padmabai Sanjiva, B. A., in the Chair, and discussed topics such, as Home Science, Co-education, Child Marriage equal standard for boys and girls and the standard of training of primary school teachers.

The Secondary Education Section held its sessions in the conference pandal, under the chairmanship of an able educationist from China Mr. Wong, M. A. As the meeting was held in the pandal, it was well attended. Mr. Sultan Mohiuddin, M. A., M. Ed., Deputy Director of Education, Mysore, read a very illuminating and thought-provoking paper on "The Place of vocational Instruction in Secondary Schools". Another delegate from Mysore, a lady, described the educational system of Mysore, while Mr. K. S. Vakil, M. Ed., Inspector of Schools, Dharwar Division, in the absence of any representative form the Phillipines, gave an interesting account of the educational system of that country. After a few other papers had been read, the President in his concluding speech enlightened the audience on the educational system in China.

The University section met under the presidency of Justice Dr. Shah Mohd: Suleman, M A.,' LL. D, of the Allahabad High Court. A paper on "the Osmania University" by Mr. Hameed Ahmed Ansari, B. A., Registrar of the University, led to a very heated debate on the question of the medium of instruction. The objections of some of the ill-informed speakers as to the wisdom of making Urdu the medium of instruction in the Osmania University were met by Mr. Abdul Rahman Khan, B. A, B. Sc, Principal, Osmania University College, who gave facts and figures to show that the the Osmania University had proved a great boon not only to the Mussalman but even the Hindu subjects of H. E. H. the Nizam as to the Mohammadans.

The Oriental Classics Section was split up into two subsections—the Sanskrit Sub-section and the Arabic and Persian subsection, which met at two different places. Both the sections suffered neglect. In the Arabic and Persian section a handful of enthusiasts put their heads together under the guidance of the eminent scholar and philologist Dr. Abdus Sattar Siddiqi, Head of the Department of Arabic in the University of Allahabad, and passed resolutions of

every article of every-day use. He was followed by Principal Sheshadri, President, All-India Federation of Teachers' Associations, who, in his welcome speech, touched on some of the most prominent present-day educational problems of India-illiteracy, education of th edepressed classes, women's education and low salaries of teachers. He concluded by hoping that the conference, which was the first occasion in modern times when cultural representatives of various asiatic countries were meeting on a common platform, might become historic as one of the landmarks in the present awakening of Asia.

Messages of good wishes received from the education authorities of a number of Asiatic countries outside India as well as from prominent Indians were read.

Dr. Radhakrishna delivered his presidential address extempore. At the very outset he made it clear that the conference had met under the auspices of the World Federation of Teachers' Associations, and that it was thus an instrument of furthering not merely Asiatic but World Co-operation. He believed in the possibility of building up a synthesis of the great cultures of the East and the scientific accomplishments of the West. This, he said, really depended upon what the educationists were going to do. They must make up their minds whether they were going to make the two continents of Europe and Asia face each other as combatants or comrades.

The first session closed with a garden-party given by H. H. the Maharaja of Benares in Kashi Naresh Hall.

On the following day, the conference divided itself into sections which met at different places, sometimes three or more at the same time. As the meeting places, except the pandal, were not well-known to the delegates and as there were constant changes in the programme and places of the sectional meetings, most of these meetings were poorly attended. There were in all fourteen sections dealing with a vast range of educational subjects.

came, clad in oriental durbar costume, and took his seat amidst loud and uproarious cheers, a chorus of girls of the Hindu Central Girls School sang a Hindi poem composed for the occas 'on by Pandit Ajodha Singh Upadhyaya, followed by another group of girls who played soul-stirring melodies on the Jaltrang. An English poem " Hail, O Hoy-priest" was then recited by Mr. Haridas Mitra, M. A., of Netrokona. In his inaugural address, which was read by his private secretary, the Maharaja dwelt on the glories of Kashi, or Benares as it is now called, which through centuries he declared had maintained its reputation for ancient learning and culture. He emphasised the need for the blending of the East and West and hoped that a Judicious and harmonious blending of the two cultures, which though apparently opposite and antagonistic to each other, are really complimentary, would produce a note which would charm the whole world and easily bring about the world-unity which is a mirage at present ". This, he concluded, could best be accomplished through education.

After installing the president-elect, Professor Radha Krishnan, in the chair, the Maharaja departed.

Great disappointment was felt at the unavoidable absence of Pandit Madan Mohan Malaviya, Vice-Chancellor of the Benares Hindu University, who was to have addressed the Conference as Chairman of the Reception Committee. In his absence, the Hon'ble Raja Sir Moti Chand, Kt , C. I. E., Chairman of the Working Committee of All-Asia Educational Conference, accorded a hearty welcome to all those who had taken the trouble to come to Benares to attend the Conference.

The Hon'ble Minister of Education, Raja Khushpal Singh, then rose to welcome the delegates. In his speech he described the educational policy of the Government of the United Provinces and referred to the industrial organisation at Dayalpur, Agra, which had given a practical turn to technical subjcts and wss now manufacturing almost

*

The First All-Asia Education Conference

BY

S. FAKHRUL HASAN B. A., B. T.,

Head-Master, Chanchalguda Middle School, Hyderabad-Dn.

THE First All-Asia Educational Conference opened on the 26th December 1930 amidst oriental pomp and splendour in the spacious shamiana specially erected for the occasion on the grounds of the Hindu Central School, Benares. The shamiana was tastefully decorated with artistic buntings and festoons, and pictures of leading educationists and reformers were hung at prominent places. In the centre, facing the north, was the dais supporting the embossed chairs of burnished gold and velvet cushions and all along the passage from the entrance to the foot of the dais, was spread scarlet cloth on a ground of skyblue carpet. There was accommodation for several thousands and special arrangements were made for ladies, whose number ran into hundreds. Loudspeakers were installed to make the speeches audible in the distant nooks and corners of the shamiana.

Outside the pandal, the arrangements were no less picturesque. Fountains whimsically playing with celluloid balls, fancy cord-railings, pyramids of variegated flower and croton pots, the clean swept streets patrolled by volunteers and Sevasamiti scouts, the seried bookstalls and cloth shops presented a beautiful picture

The conference was to meet at 3 p. m. but long before the time fixed, the shamiana was full to the last bench and those who came late had to keep standing.

The arrival of the Maharaja of Benares, Lieut. Colonel Sir Prabhu Narain Singh Bahadur, was announced by a tremendous upheavel in the pandal, and when at last he

scientific principles, to so apply the principles in his own mind, that the problem may be satisfactorily dealt with. Obviously, in these cases, in order to save time, and annoyances and misunderstandings, and often final failure, the ideal is to have both these types combined in one person, the theorist and the "handy-man" combined, which becomes possible in time if the method of employing the practical periods outlined above be adopted.

To sum up then, teachers should take special pains with their first one or two lessons introducing new sections of science subjects; to first and foremost, at the expense of everything else, engender interest; to set the example of consistent scientific method in their theory lessons; to aim at technique development in the practical periods; to work frequently from objects of interest in everyday life; analyzing the scientific principles embodied in them, instead of starting with the principles, and finishing with a passing reference to some application of them in common life; in short, to turn out a whole man on that side of the student's education for which he is responsible, namely the scientific side.

After all, the real aim of setting practical exercises, and their importance, lies in helping to turn out students not only well versed in theory, but quick and sure in hand and touch in handling delicate instruments. It teaches appreciation of accuracy in all things, and in short, develops what the world wants so much,—the practical man rather than the theorist or philosopher. This all centres round the technique, which thus stands out as the most important item to be learnt by performing practical work. Therefore the other two items mentioned earlier, each absorbing their quota of mental energy, should be eliminated as far as possible, and this is best accomplished by the students performing experiments already made familiar to them during the theory class demonstration lesson, the experiment being fully performed in the first place by the teacher.

This, we venture to suggest, is a psychologically correct procedure, since it employs one of childhood's strongest characteristics, namely imitativeness. The child's mind works somewhat contrary to that of the adult here, since if an experiment is not fully understood, the desire to imitate it is feeble, whereas if fully comprehended, imitation appears the natural mode of self-expression. With the adult, to imitate a fully comprehended act or experiment, appears waste of time and pointless. This is an essential difference, which must be realised and used in setting practical work, remembering that the aim should not be so much to teach or even impress theory, as to develop technique and manipulative skill.

This will automatically bring the subject into closer relation to everyday life, since a student well versed in the handling of apparatus and tools, is able to apply his scientific knowledge direct, and is not hampered by a strange paralyzing feeling of not knowing on the one hand, just how to get about the job in the best and quickest way, or on the other, how to cause some other person familiar with the use of tools and instruments, but ignorant of

self-imposed; and all teachers know what a tremendous amount of real hard work most children will put in to attain a self-imposed goal. In some cases a restraint rather than a drive, has to be exerted by the teacher.

The same applies to inculcating observation and the scientific method often set up as fetishes by science teachers, but usually only succeeding in doing to death that delicate germ of budding scientific enquiry in a child, by expecting it at once to assimilate adult food and thrive in an uncongenial atmosphere.

Having obtained interest and awakened a passion for science, observation will look after itself, and scientific method is rapidly acquired if only interest can be kept alive. Scientific method, like character, is caught rather than taught, from the teacher himself, who should so plan to employ analysis when required, and subsequent synthetic blending of the simpler facts thus discovered, to build up the child's knowledge to any required standard during the course, so that the child, never having had anything but scientific method within his experience, naturally adopts it as a sine qua non of getting at the answers to nature's riddles. "The scientific method thus acquired will become a vital part of the learner's mental habit, not merely an accomplishment kept strictly for use at school".

Practical Work :—

In dealing with practical work and its value from the point of view of its being an instrument for teaching theory, it would seem from experience, that work which is not thoroughly understood before the practical period begins, yields little or no fruit. The mental energy is too divided between several things, one, the actual technique, the second, uncertainty about the exact aim of the experiment, and what result to expect, which tends to paralyze mental effort; and thirdly, through not having the procedure thoroughly understood, frequent mistakes in order occur, necessitating a repetition of the experiment from the beginning.

power appeared to be about the weight of an ordinary pocket knife. A horse-shoe electro-magnet was then shown, connected to an accumulator, and the armature carrying the hook, applied. The circuit was broken, and the armature fell with a bang, causing considerable surprise, as "once a magnet always a magnet", was the experience of the toy-magnet owners, It was again connected, armature applied, and one by one, three four-pound weights hooked on, admiration for such a magnet mounting high, and the promise was given that some day they too would know how to make one like it. Finally the weights were all allowed to fall with a bang on the table, to prove their solidity and reality. A passing reference was made to the convenience of this sort of magnet for handling steel rails, etc., when loading trucks.

An invitation was offered for penknife owners to come out and magnetise the blades by stroking on one of the poles of this electromagnet, which caused great delight, and a sense of having got something out of their first science lesson. A crowd of youngsters more eager to commence a journey to this land of wonders, even though it might prove boring in places, would be hard to find anywhere.

Someone may object and say that this is going too far, and spoiling these things for when they really have to be studied. We think not; no more than seeing photos of the Taj or of the Rock Temples of Ellora, spoils these realities when the time comes to see them in actuality and with understanding. Most of these experiments stand seeing three or four times without losing their fascination for the average boy.

The above method can be applied with advantage at the beginning of each new section of scientific work with equally good results, for stimulating interest and instilling determination to get through the intermediate stage of less interesting mathematical and memory work, to reach the desired goal. The goal of the efforts in this way becomes

to boil the water. This was vigorously rejected as a possible explanation. He then recalled to the pupils' minds the stories of fire-breathing dragons told in their story books from time to time, and suggested that he was one such. This too was greeted with disapproval, but the interest in the real reason mounted higher. Upon enquiry, it was found that only three boys out of the class of about 27, had that morning (in January) had a cold bath. The water was reported by these three who knew, as being very cold. The teacher also had had one, fortunately, and was inclined to consider the water warm or even hot, and proceeded to prove to the astonished class that ordinary water drawn straight from the tap and slowly poured over the upturned flask, caused still more vigorous boiling of the water inside. The class was spell-bound; various school-boy slangy expressions of perplexity and admiration being heard. This pouring-on of cold water went on for a good many minutes, during which it was evinced from several members of the class, that eggs take three minutes in boiling water to cook. One boy volunteered to suggest, in answer to a question, that they could still be satisfactorily cooked in three minutes inserted into the flask, as the water was obviously boiling. However, by this time, it was little more than blood heat, and the said boy was allowed to come and handle the flask, and correct his notions of cooking eggs in three minutes in luke-warm water! Most of the class wished to prove to themselves that it really was practically cold.

A few minutes still remained, so a penknife was called for. The blade was polished by rubbing with emery cloth, and then "transmuted" into copper by dipping into copper sulphate solution, washed, dried, and handed back to the proud owner of the knife.

Finally it was found on enquiry, that about a dozen of the boys in the class had at some time in their possession, a small horse-shoe magnet as a toy. The average lifting

in disgust, and go home again. Therefore before we start our scientific journey to the land of all mysterious and wonderful things, let us look, as it were, at some photos, not perceiving or understanding more than we can see just for the present, till we actually get there, and perform a thorough investigation.

While this introduction was in progress, a round-bottomed flask about one third full of water, to which attention was now drawn, was being boiled in preparation for the well known magical experiment illustrating boiling under reduced pressure, at temperatures as low, even, as blood heat. While all the air was being expelled from this flask, (the very fact of water being boiled in a glass vessel without the latter cracking, causing fair interest), artificial "raspberry" cordial was produced in a large beaker of water, by adding a little phenolphthalein, and then caustic soda. (Note—These indicator changes are usually left till their utilitarian aspect in titrations is the main feature; but shown in this way they serve to instantly arouse much interest.)

It was then suggested that all the class might not care for "raspberry", but might prefer "lemon", and to rectify the error in judging the prevailing taste, a few drops of sulphuric acid brought about the even more striking colour change back to colourless.

The ease of supplying the white fluid required for the milkman's profession, was demonstrated by adding barium chloride solution to a beakerfull of very dilute ammonium sulphate.

Meantime the star piece of magic of the lesson was ready, and inserting a rubber stopper, and simultaneously withdrawing the flame, all was ready Upon inverting the flask, and gently blowing upon it, the water boiled briskly, causing great amazement. The teacher made the suggestion that he had high fever, and really should be at home in bed, and that his breath in consequence was hot enough

methods available to the trained man of science for attacking various problems. Thus the usual stodgy beginning of physics is the three states of matter, or measures of length and capacity, scales etc., and similarly of chemistry, the difference between elements and compounds and mixtures, (a difference which was not appreciated till the science of chemistry was very old, and should not be presented till the learner knows the details of quite a number of chemical reactions), followed by a dull description of methods of separating mixtures, and making pure compounds. He then does some "so called" practical work on solution, evaporation, crystallization, distillation, and so on. He is asked to separate a mixture of sugar and sand, (a thing he will probably never have to do, unless he becomes a dishonest "baniya" in danger of prosecution).

And so after a few weeks of such exciting stuff, and before he reaches anything interesting, his appetite may be gone; the germ of the love of science starved to death, to life for ever cold and unresponsive, thus sealing an avenue through which untold and never ending delight to the boy throughout his life might have flowed, if only that delicate germ had been stimulated by palatable and invigorating food.

To give a concrete example of the above idea of a suitable method of commencing scientific studies, the first ¾ hour period of a class commencing elementary science for the first time in their lives, consisted in something like the following:—

When we visit a new country, it is often wise to find out beforehand its most interesting sights, by means of looking at photographs of them, and then we plan our tour accordingly. After the interest of looking at the pictures is finished, there usually follows a long, and often quite uninteresting journey, and were it not for the fact that we bear in mind a mental picture of the glorious and interesting sights awaiting us at the end of the journey, or at definite stages in its progress, we should be tempted to give up

150 years from the passing of the futile search after the Philosopher's stone, proving again the soundness of this principle of first kindling the spark of a scientific bent, to a roaring and consuming flame, which then easily overcomes formulae, definitions, and difficult mathematical portions of the more formal part of science.

"The teaching, then, should begin with known things, and should not follow any stereotyped course, but the natural enquiry of the youngsters. It need hardly be said that this does not mean that the pupils are capable of deciding what should be done; but to igonre their suggestions is to commit a very grave error in teaching. It is the teacher's job to keep in mind the essentials, and see that they are covered, but to use all the enthusiasm and eager enquiry of the pupils in determining the development of the course which may never be the same a second time. If a teacher is content to follow the textbook he is shirking his job."

This method of procedure usually automatically correlates the subject with others, as well as making obvious the application of scientifiic knowledge to things of everyday life since in the first case the child is fully interested in the subject and his will to learn is active, leading and even driving him to draw on information imparted to him under the label of another subject which helps him to elucidate more readily some fascinating mystery he has come up against in his study of science. In the case of the second consideration, namely that of application to everyday life, since this method of imparting scientific knowledge starts with the common things of everyday life, the application thereto of knowledge of scientific principles acquired is more than self-obvious, rather it is the very heart of the method itself.

The whole trouble with the old method is that it does its best to quench the spark of love of science, commencing, as it does, with formal definitions, and the whole series of

course," if we may call it such, at home, often before they were introduced to the systems of weights and measures, atomic weights and molecular formulae and symbols, and all the numerous laws and definitions abounding in our text books.

They used bottles in place of flasks, and tin and wood and string played a large part in their crude apparatus; nevertheless, their souls were breathing the true scientific air,—that of discovery and of mystery to be unravelled, the joy of analysis, with its elating sense of mastery of the secrets of nature, and the tremendous impulse to the imagination born of a successful synthesis, no matter how simple. Thus their scientific muscles grew strong, and when the time came for them to know the various theories, atomic weights, laws of combination, more precise systems of measuring etc., they were not crushed or bewildered by them all, but hailed them as useful assets and tools to help them still further,—tools which those strengthened muscles wielded with ease, so the mastery of all this side, commonly called scientific training came naturally and almost automatically.

This, in brief, appears to be the method of development of our greatest chemists and physicists, doctors and astronomers, all silently testifying to the soundness of the principle.

The sound path of approach is not along the formal way (though this old way is still practised by many teachers), but though the natural desire for explanation of common things. The world was full of wonders provided by common things, when the human race appeared, and we have been steadily working back to the root of the whole matter; and the present day great theories were only established, understood and applied after many years of testing. The early scientists, the alchemists, and their successors, did not start with definitions and theories as we often try to do when we teach the pupils of to-day, yet from their work the whole of our present scientific knowledge has sprung, and all in about

A Method of Approach to Science Teaching in Schools.

BY

R. S. HUGHESDON, B. SC.,

Vice-Principal, St. George's Grammar School, Hyderabad-Dn.

AT the outset, it is necessary to emphazise the importance of a correct method of approach or introduction to a school science course. We might with advantage take the simile of a baby. Careful treatment during the first few hours often saves its life, to result in many years of usefulness. So the first few lessons or weeks of science teaching should receive the maximum of attention, and not be treated as relatively unimportant on the ground that there is plenty of time to make up later on. The science teacher should strain every nerve to cause any slight spark of inherent love of science, lying dormant in the child, to be fanned successfully to a vigorous flame, instead of, as is too often the case, extinguishing for ever that feeble spark,—not intentionally, of course, but by unsuitable treatment at a most critical time. This is of cardinal importance, and requires the maximum of effort on the part of the teacher to place himself in the child's position. He should remember that " the things in science which now loom most important in his eyes, are things of most significance from the standpoint of theory. For example, a quite unimpressive reaction of some substance scarcely to be found outside the walls of a laboratory, interests him far more than some spectacular, pretty or striking experiment, since the former may throw light on some disputed question of molecular composition. But he began his career with a very different scale of values, and where he was then, his pupils are now ".

We usually find the names of great and revered scientists, borne by men who commenced their " science

Board. Similar arrangments are made for the treatment of children suffering from poliomyelitis (infantile paralysis).

Children who suffer from stammering attend for a course of three months, classes taken by specially trained teachers, The period may be extended if found necessary.

In addition to the ambulances of which the Council bears the whole cost, the council provides guides, where necessary, to conduct children safely to and from the special school. The travelling expenses of the children are also paid by the Council to the extent to which the parents are considered to be unable to meet them.

(*To be continued*)

reception of London cases, and altogether about 90 children are so dealt with. An epileptic child is one who, not being an idiot or embecile, is unfit by reason of severe epilepsy, to attend an ordinary public elementary school. The Council has under consideration, the provision of further accommodation for epileptics by means of the enlargement of one of these colonies by 80 places, to be reserved for London children. It is likely that all educable epileptic children will thus be provided for.

(c) Care Committees and After-Care.

At the schools for the blind, deaf, physically defective and mentally defective, children's care-committees have been constituted as in the case of the ordinary elementary schools. Two Central Committees of voluntary workers undertake the after-care of children leaving the special schools. The Ministry of Labour makes grants towards the expenses incurred by these two committees. Largely as a result of their activities, in conjunction with the teachers of the schools, employment problems for the special school child are solved; it is worthy of record that the percentage of children placed in employment from the special schools compares very favourably with the percentage of normal school children.

The Council is required by the Blind Persons Act, 1920, to provide for the further training of all blind children who are found to be in need of it after leaving the schools at the age of 16.

(d) Miscellaneous Provisions.

Debilitated and anaemic children and those who may be suspected of a tendency towards tuberculosis, are provided for by day open-air schools and by residential convalescent open-air schools.

Children suffering from the after effects of encephalitis lethargica (sleepy sickness) are, by arrangements made, taken into one of the hospitals of the Metropolitan Asylums

the schools for the mentally defective, are those notified and about 8 per cent. of the leavers are subsequently sent to institutions.

As regards schools for the physically defective, one of the school for these children is conducted in the Northcourt Hospital for sick children, the council providing the teachers and apparatus. Three separate schools have been provided for elder physically defective girls, in which, in addition to the ordinary subjects, trade needle work is taught. Three separate schools have also been provided for elder physically defective boys, at which special trade teaching is given. The number of these schools is being increased as opportunity serves.

A physically defective child is one who is incapable by reason of physical defect of receiving proper benefit from the instruction in the ordinary public elementary schools, but is not incapable, by reason of that defect, of receiving benefit from instruction in special schools.

Ambulances are provided to take these children to and from school, if they reside at a distance from the school or are unable otherwise to attend. A trained nurse is attached to each of the schools for the physically defective.

The Council makes arrangements with the authorities of various voluntary residential schools certified by the Board of Education for the reception of physically defective children. The children sent to these schools by the Council are selected from day schools for the physically defective and are such as suffering from an ailment which is not likely to improve except under such treatment that only a residential institution can provide, while the children are being educated.

The problem of the "pre-tuberculous" and "tuberculous" child has been met (I) by the establishment of open-air schools and playground classes, and (II) by the provision of a number of special schools for tuberculous children.

Arrangments are also made with the authorities of the Chalfont, Lingfield and Hadham epileptic colonies for the

certified as being; "by reason of mental defect, incapable of receiving proper benefit from the instruction in the ordinary public elementary schools, but not incapable by reason of such defect, of receiving benefit from instruction in special schools."

The scheme of instruction is a modification of that in the ordinary elementary schools and special methods are followed, with a much larger proportion of manual work, nearly half the time being given to manual occupations.

Under a scheme which is being developed, fourteen separate schools have already been provided for elder mentally defective boys and ten such schools for elder mentally defective girls. At these schools, in addition to the ordinary subjects of instruction, boys are taught handicraft (woodwork and metalwork), shoemaking and tailoring and girls domestic economy and needlework, with other subjects. The Council has a home for mentally defective boys, and to this school are sent some 72 of the most difficult cases. A similar residential institution provides for 36 girls.

Special measures have been taken with regard to a few mentally defective children who, on account of personal characteristics, are found to be unfit for mixed schools, or require custodial care. Such children are sent by the Council to institutions for the mentally defective, established especially for that purpose.

Before children leave the schools for the mentally defective, the question is considered whether they require owing to home circumstances, etc. institutional care as is provided for under the Mental Deficiency Act, 1913. If further care is thought desirable their cases are notified by the Education Committee to the Mental Hospitals Committee of the Council, who then deal with them by way of (*a*) institutional treatment or (*b*) guardianship or (*c*) legal supervision. The two first-named methods require an order of a Court. About 30 per cent. of the children who leave

Blind girls—Hand and machine knitting and basket-making.

Deaf boys—Cabinet making, tailoring, boot-making and bakery and confectionery.

Deaf girls—Dressmaking, lingerie work and fine laundry work.

In addition to the blind and deaf children mentioned above, there are about 900 partially blind and about 150 partially deaf children in London. To meet the requirements of these children, 21 day schools have been opened for those suffering from high myopia, and 5 for the partially deaf. These children as a rule attend an adjoining ordinary elementary school for instruction in certain subjects and are encouraged to mix with the normal children as much as possible. They leave at the ordinary school leaving age, i. e. at the end of the term in which they attain the age of fourteen years. Many of the partially deaf, having acquired sufficient ability in lip reading, return to the ordinary elementary school before reaching the age of fourteen. The classes for the partially blind contain 25 children while those for the partially deaf take 15 children.

(b) Schools for the Mentally and Physically Defective.

The Council also provides schools for mentally defective and for physically defective children. The instruction for these children is continued up to the end of the term in which they reach the age of 16 years.

There are under instruction about, 6000 mentally defective children in 68 special day schools, and about 4000 physically defective and invalid children in 35 day schools and one special hospital school. The number of children taught by each teacher averages about 20.

Children are admitted to the schools for the mentally defective on being medically certified as neither imbecile on the one hand nor merely dull or backward on the other. In the words of the Act of Parliament, they must be

control. This corse plan is usually followed in the case of Jewish or Roman Catholic pupils, or those who are specially recommended for country or seaside institutions.

Between the ages of 5 and 13, blind or deaf children attend day schools at which both boys and girls are educated. They are taught in classes containing 15 pupils each in the case of the blind and 10 pupils each in the case of the deaf. A few blind or deaf children, who live too far away from the schools to attend as day pupils or whose home circumstances are undesirable, are boarded out by the Council with foster-parents in the neighbourhood of the schools.

The instruction in the blind schools is given by means of Braille writing and reading and the instruction given in the deaf schools is usually on the oral system.

There are also some deaf children with another defect, e. g. deaf and blind, deaf and mentally defective etc. They are accommodated in one of the three residential schools for the deaf, which is set apart for the purpose. These defective deaf, while they are encouraged to learn to speak, are also taught, by means of finger, alphabet, writing and simple signs. The elder blind and deaf pupils—those from 13 to 16—are taught in school which are partly day and partly residential, the boys and girls being provided for in separate schools. The children who can conveniently attend from their own homes and who have suitable homes are day pupils, those who come from a distance or from unsuitable homes are residential.

The instruction of the elder children, both blind and deaf, includes a large amount of manual and industrial teaching with a strong vocational bias, and it is found that many of the children, on leaving school, are able to obtain employment at the trades which they have been taught.

The trade taught to these elder children, are as follows:—

Blind boys—Basket making, mat-making and metal-work.

*

Schools for Ailing or Defective Children in London

BY

SYED MOHAMED HUSAIN JAFERI, B. A. (OXON).
Deputy-Director of Public Instruction, Hyderabad-Deccan.

THE London County Council has made special arrangements for the education of blind, deaf, physically defective and mentally defective children, in accordance with part V of the Education Act, 1921.

(a) Schools for the Blind and Deaf.

A school authority is required to provide instruction for blind and deaf children up to the end of the term in which they reach the age of 16, and, if necessary, may maintain these children in residential schools or institutions. The definitions of blind or deaf children, for the purposes of their education, are (i) a blind child is one who is too blind to be able to read the ordinary school books used by children and (ii) a deaf is one who is too deaf to be taught in a class of hearing children in an elementary school.

The education is free but in cases in which children are sent to residential schools or institutions, a charge for maintenance is made upon the parents, according to their means.

There are about 300 blind and 650 deaf children in London between the ages of 5 and 16 years. Accommodation has been provided by the Council for 372 blind and 690 deaf children. There are six day schools for the blind, six day schools for the deaf, two residential and day schools for the blind and two residential and day schools for the deaf. In a few instances the Council sends blind and deaf children to schools or institutions not under its own

have risen to positions of comparative leadership, we see how every one of them in his younger days was conscientious in the discharge of small duties assigned to him. Responsibility begets responsibility, and the boy who manfully undertakes to do a small work, will at a later stage attempt to shoulder big things. Our boys supervise study, Reading Room, Sports, Kitchen, and have responsible works in connection with our Chapel Service, Office, Garden, etc. We have chosen Honesty, Courtesy, Service, Sportsmanship, Poise, Industriousness, Health Habits, Responsibility, Punctuality, Obedience, Patriotism and Resourcefulness as our ideals, and we expect our boys to work towards these ideals wherever they may be—in the class room, Assembly, athletic field or dormitory.

A boy becomes a leader because he is a servant. Our greatest leaders are and have been our best servants. Around the boy, there are many opportunities to serve. One is sick and needs a little company, another is poor in arithmetic and needs a little help. Plague is raging in the City, and while we can get voluntary doctors, compounders and nurses, we cannot get ward boys or if we get them they believe they must be dead drunk before they can work with plague patients. The adults in our locality are illiterate and willing to learn reading. We have a vacation of eight weeks and in the village we have boys and girls—men and women—willing to learn reading and writing or learn singing songs. We have people who do not know about malaria, the danger of guinea worm or the value of rubbish heaps. Wherever we may turn, there is a great deal of service to be done and a boy can never become a leader unless he loves to do service.

A Literary Union, carefully planned and watched is a good education. Two of our teachers have prepared the subjects to be discussed in the Union this year and divided them into sub-topics, and placed in the hands of the students a copy of the printed programme. This stimulated thinking on the part of the boys, and avoided overlapping by different speakers. At the end of the meeting a Teacher-Critic gave constructive criticism about the content of the speeches, language, elocution, etc. A man who can not think cannot be a leader.

It is important for every boy to learn how to support himself when he grows up. Whatever the profession of a man may be, he must know some manual work, on which he may fall back in case of a crisis. Several of our boys have small plots in the garden, and there they work with a graduate teacher, who often works more than two hours a day with them. Boys learn digging, making the earth soft, mixing the manure, choosing the proper kind of manure, sowing, planting, transplanting, watering, tending the plants, harvesting and selling the crop. Some other boys have learnt to build a chicken-house, make tick-proof perches, feed chickens regularly and with proper diet, clean the houses periodically, collect eggs and sell them. Tinning the "dekchas," making furniture, whitewashing walls, cooking food, looking after the sick, sweeping the compound and rooms, tailoring, all enable our boys to soil their hands—a lesson that we must learn in India. Incidentally the boys earn some thing towards their support.

The greatest qualification of a leader is a sound character. A boy forms his character by watching the many small details of life—his reaction when he is kicked in football, when he is gibed by a fellow student, when he has four annas belonging to his Patrol, when he can leave school without permission with no chance of being caught, when he breaks a glass and nobody has seen him.

Character is formed when a boy seriously attempts to take a responsibility. Reviewing our ex-students who

who by his observation enjoys the sparkling stars on the canopy of heaven has his soul uplifted, recognises the greatness and magnificence of the Almighty and exclaims with the Psalmist, "What is man that thou art mindful of him, and the Son of Man, that thou visitest him?"

Educational excursions under the guidance of teachers develop in the boys the faculty of observation. A trip to the sea, to the River Krishna with its bridges, anicut, canals, lock systems and boats—indeed all historical and geographical trips carefully planned and studied - are a great education to the boys. A visit to the Fort of Golkonda and the neighbouring tombs of the Kutubshai Kings will not only stimulate thinking about the history of the Deccan, but may be made the starting point for an appreciation of Indian Art.

The ingenious teacher will find many ways of developing this faculty of observation, while he is teaching reading, writing, answering questions and so forth.

The second great qualification of a leader is the ability to think. Modern pedagogy lays great stress on thinking as opposed to memorisation, reduction or imitation. We do not now teach any subject by rote. Geography, for instance, is humanised, and instead of learning by memory the boundaries or exports, we now determine the causes underlying the various geographical facts.

A Students' Magazine, edited by a student-editor and worked by a representative committee of students—with a little assistance from one of the teachers — is a great means to develop originality on the part of the boys. Very often in the class-room we prescribe the work for the boy. He has to write an essay on a set subject or do an assigned work—and this may not interest him at all. The Students' Magazine gives him an opportunity to work along lines which will interest him.

The regular use of the library and the Reading Room with current periodicals and magazines will stimulate thinking on the part of the boys.

Training Boys for Leadership.

BY

GABRIEL SUNDARAM, B.A.,

Principal, Methodist Boys High School, Hyderabad-Deccan.

THE great need of our country at the present time is leaders—leaders with initiative, self-sacrifice, character and vision. We have a large number of people willing to follow a great leader, but we have been unable to produce leaders in sufficient numbers. Leaders are needed for every walk of our national life—for politics, social reform, adult education, village uplift, work among the depressed classes and labourers.

It is one of the important duties of schools to produce leaders. A leader must have eyes to see, and, therefore, boys must be trained to use their eyes. If a class room is dirty, our boys must be able to see it and resent it. If our dining room or dormitory is not swept, they must refuse to use it. If a picture is crooked, they must instantly feel an urge to set it right. If a boy is sick, they must see immediately the need for help. Lessons on orderliness, cleanliness or helpfulness may be valuable but are not fully satisfactory. Our boys clean the rooms, put the furniture in order, dust the walls, nurse the sick and we find that the best way to learn is by doing.

In our education, emphasis is laid on observation. In the drawing class, we do not merely learn imitation or reproduction but an appreciation of Nature—the sun-set, the great lake of Himayatsagar, the various kinds of clouds, flowers, trees, meadows, etc. Great interest in stars and the various constellations may be readily created by taking the boys to the terrace a few nights and early mornings before dawn and talking to them about stars. The interest thus created in the starry heavens may be a source of happiness to the boys for the rest of their life, (and the boy

general and vocational schools. it would be very desirable to vest the control of all types and kinds of schools-general and vocational-in the Director of Public Instruction, who will be assisted in respect of vocational schools by committees of technical experts and representatives of employers. Vocational diagnosis and guidance should be regarded as an integral part of the organised educational service and closer relations between education and industries, commerce etc., should be established. Finally, we have to realise in the words of the Hadow Committee Report (P. 149) that "The time has come.............................when the country should be prepared even at the cost of some immediate sacrifice, to take a step which will ensure that such (secondary) education shall have larger opportunities of moulding the lives of boys and girls during the critical years of early adolescence." and, I may add, suitably to the requirements of the present economic and social life.

in training colleges or outside, to function as vocational guides. This method secures effective and economical adjustment of young people to the employments which they can most advantageously follow and it thereby conduces to the economic efficiency and happiness of the individuals and avoidance of social wastage.

Lastly, in the interests of education, prospective emyloyees and employers alike, it is highly desirable that co-operation between education on the one hand and the industries, commerce etc., on the other, should be secured not only on a local but also on a regional and national scale. The example of the United States of America is helpful in this direction.

Summary.

To sum up, although systems of vocational education had been organised in all progressive countries, it has been lately felt that vocational institutions by themselves have not been sufficiently effective in diverting pupils from general schools to vocational institutions. The recent studies in the psychology of the adolescent and the growing complexity of economic life have brought home the need for a re-organisation of the courses in the secondary schools in order to suit the aptitudes and inclinations of various groups of pupils, and to pre-dispose them in favour fo practical occupations. This need has been met by imparting a vocational bias to the secondary school course, particularly about the end of the course. The form of bias varies in different places but it seems to be desirable to differentiate courses with reference to the main groups of practical occupations Such courses might preferably be organised in the same school in parallel sections. These courses should be closely related to those in the primary and middle schools on the one hand, and to those in vocational schools on the other. The organisation of such courses will involve the selection of proper type of teachers and a change in the nature of the final examination. To secure a proper co-ordination of

tion of placing all forms of education, general as well as vocational, under the control of the Director of Public Instruction—as originally in Mysore and even now in Cochin—who will be assisted in regard to vocational schools by consultative committees consisting of technical experts of the Departments concerned and employers of skilled labour.

Vocational Diagnosis and Guidance.

To the end that a large number of young men may be diverted towards practical occupations, and enabled to find them, we should not only know the local economic conditions and requirements and possibilities of employment but also the qualities required by the different occupations and how far the pupils possess them, so that each pupil may be enabled to reach the particular gate-way which will lead him where he will, with greatest benefit to himself and to the good of the community. We cannot leave young men to try one vocation and then another on the wasteful principle of trial and error. There is need, in other words, for vocational diagnosis and guidance. A technique of psychological testing has been evolved as a result of several years' experience for the determination of the general mental capacities, character and aptitudes and of the specific sensory and motor capacities of individual pupils, in addition to the knowledge that a teacher might have gained of the pupils' aptitudes and bents in connection particularly with their pre-vocational work. In Germany and America, a large proportion of the children leaving schools are administered psychological tests and psychographs of individual pupils are prepared. In addition, it is necessary that information relating to the conditions, requirements and prospects of employment should be made available to the children and their parents to assist them in a wise choice of employment. In certain countries vocational diagnosis and guidance has come to be recognised as an integral part of the organised educational service and special training is given to teachers and others, either

It is very necessary that teachers for the new courses should be men of the same academic and social status as teachers of subjects in the purely academic courses. The teachers of special subjects should become ordinary members of the staff with precisely the same status as that of teachers primarily responsible for the academic subjects.

Relation to Primary and Middle School on the one hand and Vocational School on the other.

Lastly, unless a preparation for these courses has been given in the Primary and Middle Schools by bringing the work in harmony with the environment, unless in the methods of these schools and their curricula, inspiration and strength is drawn from the life around and unless they enliven and open the minds and interests of pupils so as to prepare them for more complex courses of the secondary grade, much cannot be achieved by the pre-vocational courses. Further, organisation of pre-vocational courses in secondary schools pre-supposes adequate provision of specialised technical institutions for those pupils who desire to take up definite preparation for vocations. In addition to the mere provision of such institutions, is needed a close and careful co-ordination of courses so that technical courses should pre-suppose pre-vocational training and follow it up. Even in Mysore, where a variety of vocational subjects is provided in High Schools and a fair number of technical and other special vocational courses are available, there is yet no adjustment reached between vocational and ordinary general schools. A co-ordination between general schools and technical institutions is necessary in order to emphasise their complementary nature.

Question of Control.

At present, in several provinces industrial schools are controlled by the Department of Industries, the agricultural schools by the Department of Agriculture and general schools by the Director of Public Instruction. The line of reform in educational administration lies in the direc-

ment, such as the difficulty of securing a proper atmosphere in a manysided school for the work in these different courses. Large schools with various courses present also difficulties of management. But these shortcomings are out-weighed by the advantages

Change in the Nature of Examinations Required.

The organisation of these courses will necessiate a change in the nature of examination and the qualifications of the teachers. The examination for these courses should be different from that for the Secondary-school course of the traditional type. While maintaining its character as a test of general education it should be so devised as to test also the abilities of the pupils other than those of the strictly academic kind.

Qualifications of Teachers.

As regards the qualifications of teachers, the question arises whether the teacher for the pre-vocational courses should be a person with the same general educational qualifications as the other members of the staff, with additional technical qualifications for the special work, or, he should be a craftsman with some aptitude for teaching. Since the special subjects will have to be treated as integral parts of the school curriculum, it is clear that teachers of the former type should at all events be preferred. For the professional preparation of such teachers the courses in the training colleges should be specially adapted. In addition to this preparation, they might be given the advantage of some special courses of training as in agricultural in the Panjab and Mysore and in wood-work as in Madras. Teachers with merely technical qualifications and low general educational standing will lower the status of these courses in the estimation of both the pupils and the public. Already, owing to the force of tradition, the melancholy fact is recognizable that pre-vocational courses generally suffer in prestige in comparison with the purely academic courses.

Real-gymnasium and Ober-real schule, according to the emphasis on the various subjects, although in some cases the courses of these schools are organised in the same school. England proposes to have the distinction between Secondary Schools, narrowly so called, and Modern Schools, with bias according to local economic requirements. For India, I am personally in favour of alternative courses being provided in the same school. For one thing, the long prestige attaching to purely academic courses will induce the general public to look upon the new schools as inferior and this will not only prejudice these schools in respect of a favourable start but will also threaten the feeling of social solidarity by the tacit classification of schools as superior and inferior. Secondly, if the courses are organised in the same school it will be possible to arrange for the transfer of pupils from one course to another in the light of the fuller knowledge of their aptitudes and capacities; and this any well-planned organisation should provide for. There will, therefore, be less danger of pupils being committed, once for all, to a mistaken choice made at a tender age. Thirdly, it might be possible to arrange for certain common courses and thus prevent the dilution of the standard of attainment in the academic subjects of the course with the vocational bias. At all events, pupils pursuing these courses can share equally in the activities that make up the corporate life of the school. Fourthly, except in large and densely populated centres, it will not be possible to secure an adequate number of pupils for different types of pre-vocational schools; and if schools with bias in a particular direction are located at certain suitable centres they will not be as near the homes of the pupils as the present secondary schools and parents will not be able to bear the extra cost of sending their children away from homes. Lastly, there will be considerable economy of expenditure in having one school with many sides rather than different schools each with a single side. There are certain disadvantages, no doubt, in the suggested arrange-

Which alternative courses should be provided in any particular schools would be determined by the conditions of the areas in question, by the varieties of the social and economic conditions of the environments. Not only would the method of the educative process be determined by the immediate environment but also its content. For, it would be futile to predispose pupils towards vocations in general or towards vocations which do not exist in the province or which are over-stocked. Provincial and local surveys to discover the local conditions and the economic needs would have to be conducted; and not only the bias should be determined by them but also the proportion of pupils that should follow the specifically biassed courses. In India, it is needless to say, the problem is mainly agricultural as 74·4 per cent of the population is dependent on agricultural or pastoral pursuits, 10·1 on industries and 5·5 on trade.

The value of these pre-vocational courses will consist not only in their possessing the flavour of the local economic environment but also in the opportunities they provide to the pupils for participation in constructive and practical work along industrial, commercial, agricultural and domestic lines and for a little experimentation with their tastes and aptitudes. There should be, therefore, a gradual narrowing down in the nature of their practical activity; and, what is more significant, opportunity should be provided to pupils to give up uncongenial forms of work and change to other kinds of work.

In the same School or separate Schools?

If alternative courses are to be provided, the question arises whether they have to be provided in the same school or in different schools. The example of America and Germany and the proposals in England are in favour of separate schools. America has the Commerical, Industrial, Agricultural and Home Economics High Schools, in addition to the academic High Schools. Germany has the Gymnasium,

prospective employment. While subordinated to general educational aims and correlated with elements of general education they should be closely related to the occupational environment of the pupils. Such instruction will give large opportunities to the pupils to participate in a series of practical experiences related to vocations, it will give them a broad appreciative insight into, and sympathetic contact with, the present-day vocations and will be related to their living interests. But it will be clearly distinguished from that of industrial or technical schools which provide specialised instruction for definite vocations and training in the technique of some specific trades.

Differentiated Courses.

A proper reorganisation of curricula implies a diversification of courses with reference to the main groups of occupational activity, namely, Industrial, Commercial, Agricultural and Domestic with a view to appealing to varying interests and cultivating different powers. In order to secure unity in the courses and to make them self-contained it would be necessary to have alternative courses including general or academic as well as special or pre-vocational or practical subjects. These courses would be in addition to the existing purely academic courses leading to the university on its scientific and humanistic sides. They would differ from the latter courses and from one another only in their respective vocational reference, but not in the demands they make on the pupils nor in their educational value. The traditional academic courses will certainly continue but they will cater for the gifted few. Both in Western countries and in India, the limit of their expansion has been reached. In Japan, it has been the policy to discourage and restrain the opening of general secondary schools on a large scale but to develop the technical system. In several countries, such as England and Japan, admission to the academic courses is by a competitive examination.

by manual methods of teaching the ordinary subjects of the school courses, for example, by the extension of the Project Method to High School work.

Mysore, perhaps, has gone farther than any other province in India in not only including a large variety of pre-vocational subjects in the list of optional subjects for the S S. L. C. Scheme but in making provision in all the High Schools in the State for the teaching of one or more of these subjects. But even there the futility of the mere inclusion of such subjects as optionals in the scheme of studies and examination has been abudantly demonstrated by the fact that many pupils whose aims is to qualify themselves for admission into the college and who have no intention whatever of making use of the study of these subjects as a preliminary to specialised vocational training, choose them as mere " soft options ". Reports indicate that even those who leave off without passing the S.S.L.C. Examination do not either pursue vocational courses in technical institutions or turn their hands to any form of practical work as a result of this special teaching. Much worse is likely to be the position when vocational subjects are introduced as merely additional non-examination subjects, as they are never likely to engage the serious attention of the pupils and the teachers. I wish also to express strongly my opinion that educational handicraft or manual training, as this form of instruction is usually called in India, introduced in the curriculum merely for its general educational value, as it is often avowed in India, is inadequate for Secondary Schools. What is needed is that sufficient opportunities should be provided to the pupils to acquire a preliminary acquaintance with the processes involved in the main groups of future occupations, so that they may experiment with groups of activity and discover their own aptitudes and bents. The curriculum should include elements having some direct bearing, particularly towards the end of the course,—say, during the last two years—on these groups of occupations and conditions of

would develop the qualities demanded by practical vocations. These two factors, namely, the psychological and economic, have led to the present trend towards practical forms of education, towards what is called vocational "bias" in the curriculum of Secondary Schools.

The Nature of Vocational "Bias".

The question arises: what is the exact form of the bias to be given to courses in the secondary schools? Although it is generally agreed that courses should be given a trend towards occupations to develop practical aptitudes, there is no uniformity of view and practice as to the precise form of the bias to be given. In India generally, bias is given by the inclusion of one or two special subjects such as carpentry, weaving, smithy, agriculture, tailoring, spinning, knitting and embroidery in some of the High Schools as additional non-examination subjects. The number of such Schools varies and the most favoured subjects are wood-work and agriculture. In Mysore, not less than sixteen or seventeen of such subjects are included in the scheme of the S. S. L. C. examination as optional subjects, alternative to certain academic subjects. High schools in Cochin also provide a large variety of such subjects. Only commercial subjects have been introduced as optional subjects for the Madras S. S. L. C. and the Calcutta Matriculation Examination. In certain other places, the bias consists in a certain grouping of subjects of the secondary school course and in giving even the so-called academic subjects a treatment which is practical. For instance, in boys' Central Schools in England an industrial bias is given by devoting special attention to practical mathematics, practical science, and technical drawing, in addition to handwork. In geography, special attention is devoted to products, raw and manufactured, imports and exports, study of railways and train routes. In arithmetic, mensuration, estimates of costs and qualities loom large. Some others believe that the necessary bias can be imparted

the increased attention to the physical and psychical characterstics of adolescence and, secondly, the expansion and increasing complexity of business and industry with the growing diversification in the economic needs of society. Adolescence is the period for the emergence of new powers and interests; and the interests of that period are practical and related to the work of the world. No programme of education which fails to appeal to those interests and cultivate those powers is likely to be significant to the youth and retain its hold upon him. Secondly, it is the period of differentiation of special abilities and disabilities, which lay nascent during the pre-adolescent stage. A programme of general education for that period, if it should be meaningful to the adolescent, should not only be practical and realistic, but also provide for diversity of gifts and talents by the variety and elasticity of its courses. *Equality* of educational opportunity should not be taken to mean an *identity* of opportunity. The school for this period should be so planned as to discover the pupil's individual bent and develop it. It should assist him in the choice of a career for which he is fitted, if social wastage resulting from heavy elimination from the purely academic courses is to be avoided. In other words, selection of pupils of secondary schools is necessary but, it should be by differentiation and not by elimination. The academically fit should be selected for the traditional secondary school courses and enabled to proceed later to the university, the rest should be provided courses suited to their aptitudes and to their destinies in the economic world. Industry, by general agreement, demands from general schools not so much specialised skill as qualities of mind and character coupled with a certain amount of manual dexterity and power of adaptability. Secondary schools, if they are to discharge their functions effectively, should provide for a great majority of its pupils, who are not fitted to pursue the purely academic courses in sciences and arts, courses that

educational courses for a great majority require a reorientation in the direction of vocations. They should point towards special vocational courses and vocations.

The Traditional Opposition Between the Cultural and the Vocational is now Reconciled.

The traditional opposition between the cultural and vocational elements and aims in education has been at last reconciled with the passing away of a class-organisation of society in the west and gradual obliteration of the economic divisions by castes in India. The complementary nature of the two in a scheme of education is now clearly visualised. Educational reorganisation in advanced countries has brought about the inclusion of realistic elements in schemes of general education to awaken and guide intelligence on practical lines, and of liberal elements in specialised vocational courses to give the mind of the prospective practical worker the breadth, freshness and vitality of new interests. Kerchensteiner's dictum "On the way to the ideal man stands the useful man" is now generally accepted without reservation. There is no real dualism now in progressive educational theory and practice between the vocational and the cultural, between pure and applied thought. Even the special instruction provided in purely vocational schools when properly given can be made just as cultural in its influence as the academic. The ramifications of even a trade, it is urged, are so wide that if pushed far enough it can become the source and origin of real culture. It can furnish a motive, a sense of reality and at the same time deliver one from scrappiness and superficial dilettantism which is the enemy of true culture.

Factors affecting Secondary Education: Psychological and Economic.

The factors that have brought into prominence the question of the re-organisation of the courses in general schools, particularly those for the adolescents are, in the first place,

even now through the possession of university degrees, with its assured income and social prestige. As the Hartog Committee has pointed out, "All sections of the community with different occupations, traditions and outlooks and different ambitions and attitudes, have little, if any, choice of the type of schools to which they will send their childern. In fact, the present type of High and Middle English Schools has established itself so strongly that other forms of education are opposed or distrusted and there is a marked tendency to regard the passage from the lowest primary class to the bigest class of a High School as the normal procedure for every pupil." As they point out, there is but one uniform course for all to follow, there is no question of exodus from secondary schools either into practical life or into vocational institutions. Although for some-time the schools served the purpose for which they were originally designed, the time has come when products of these schools, with all the development and ramification of the machinery of administration, have become largely unemployable. Individual demoralisation and social waste has been the inevitable result.

Attempts have been made and are being made elsewhere to establish closer relations between general education and industry and commerce. It is increasingly recognised that vocational institutions by themselves are not a sufficiently effective means of drawing away the boys from the general school, of diverting the current from sedentary and clerical work to manual occupations. What is really desired is the broadening and enrichment of the curricula of schools of general education by the inclusion of studies or occupations that would lay a solid foundation of practical interests, develop resourcefulness and practical inventiveness, cultivate equalities not only of the head and heart but also of the hand so as to create a real continuity between the pupils' general educational course and specific vocational training and practical occupations of life. The general

beginning of the present century, it was felt that there should be no "cul-de-sac" in the educational system, that no child should be limited in respect of educational advancement by the accidents of birth and environment and that no child should be denied the right to equality of educational opportunity. The principle, in Huxley's words, that there should be a ladder from the gutter to the university, came to be enthusiastically adopted. This led in many countries to an attempt at a unified and comprehensive system of education, pre-eminently in America where a unitary, rectilineal, free and secular system was evolved. It led in England to the institution of free-places and scholarships; and in Germany and some other countries, as one of the results of the post-war revolution, to the creation of common schools for all classes of society. But the result has not been quite happy; for owing to the prestige of the ages attaching to the higher grades of general schools, ambition yet urges many to press forward into the traditional secondary educational course of an academic nature, in search for black-coated jobs and sendentary occupations to the intensification of the problem of the unemployment of the educated. The truth is that not more than a small proportion of the pupils can really benefit by such courses of education. Social distinctions can be obliterated but intellectual differences will persist through the ages. All cannot reach the highest rungs of the academic ladder. Many have to fall off on the road-side. Having had no opportunities to develop aptitudes for occupations other than the academic and with a positive distaste, on the other hand, for practical pursuits, such academic failures have helped to swell the ranks of social parasites. The situation is regretted in many countries. But in India, it is nothing short of tragic, partly by reason of the inadequacy of the provision for specific vocational instruction but more largely owing to the lure of the Government service, admission to which was secured originally and is secured

more particularly at the enormous progress made by Germany, by setting in England began her attempts by setting in motion as usual with her—the machinery of a Royal Commission. In the United States of America, though the conditions requiring attention to the problem of vocational education appeared comparatively more recently, the nation re-acted quickly to the changed economic situation under the stress of international competition and, aided by her enormous natural resources, soon occupied one of the foremost places among the commercial and industrial nations of the world. And, in Asia, Japan, profiting by the experience of foreign countries established and systematised a co-ordinated system of technical education, in its general sense, even before the commencement of the present century.

The Need for the Re-orientation of General Schools towards Vocations.

Experience, however, in all countries showed that mere provision of vocational institutions did not adequately meet the increasing demands of economic life. It has been felt that unless a "liaison" is established between schools of general education and vocations, the needs of industry and commerce cannot be satisfied. Secondary schools and universities have accordingly come in for reorganisation. They were originally, in all countries. the schools for the leisured classes. At best, they were the means of recruiting administrators to carry on the work of the church and secular government. To this function, they had consciously adapted themselves—to train men for duties of public administration and leadership. With the development of the liberal professions, new demands were made to which these institutions, however, readily responded. But side by side with these schools for the classes existed those for the masses, completely independent of the former and providing a poor intellectual fare. Under the influence of the democratic sentiment, however, at the

The Place of Vocational Instruction in Secondary Schools

BY

M. SULTAN MOHIUDDEEN, M. A., LL.B. M. ED. (LEEDS).

Deputy-Director of Public Instruction, Mysore State.

We are extremely grateful to Mr. Sultan Mohiuddeen for sending us, at our request, a copy of the illuminating paper which he read at the All-Asia Educational Conferance held at Benares in December, 1930. Mr, Sultan Mohiddeen has evidently made a deep study of the subject, and his conclusions are the more valuable because they are based on practial experience of the scheme of vocational instruction in the Mysore State. We feel confident that this able contribution will be read with great interest by our readers. The question as to what place vocational instruction should occupy in secondary schools has been engaging the attention of educationists in India for a long time, and we have no doubt that Mr. Sultan Mohiuddeen's suggestions will greatly help in its solution —Editor.

OF the significant educational movements of the post-war period, one of the first-rate importance is that connected with the relation of education to vocations. It is no doubt true that systems of vocational education had been built up in many western countries even before the commencement of the present century. Germany, for instance, had started to lay the foundations of her system of technical education even after the Napoleanic wars, and at the conclusion of the France-Prussian War set out, under the inspiration of Bismark, to conquer her rivals in the field of commerce and industry as she had done in that of war. With her genius for adaptation—adaptation in this case of technical education to her industrial and commercial needs—she built up a system which excited at once the admiration and envy of the world. During the last quarter of the nineteenth century, impelled by the desire not to be outbeaten by the other nations in this field, and concerned

THE HYDERABAD TEACHER.

January—March 1931.

CONTENTS.

REGISTERED ASAFIA NO. 47.

Vol. V January—March, 1931. No. 3.

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,

Director of Public Instruction.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab.)

F. C. PHILIP, M. A.

SECUNDERABAD-DECCAN.

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1931

Annual Subscription Rs. 3.

ورزشِ جسمانی نمبر

جلد (۵) | شمارہ (۳، ۴)

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت:- سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب) مدیر مسئول
سید فخر الحسن ملا بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) مدیر
محمد عبد النور صدیقی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) شریک مدیر

مقاصد

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔
(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

قواعد

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
اندرون و بیرون ممالک محروسۂ سرکار عالی تین روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ سکہ رائجہ)
صرف اردو حصہ (عہ) سالانہ قیمت فی پرچہ اردو انگریزی (۱۲) صرف اردو (۸)
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔
(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	سے	صہ ۸ر	سے ر
نصف صفحہ	صہ ر	عہ ۱۲ر	صہ ۸ر
ربع صفحہ	عہ ۸ر	صہ ۶ر	۱۵ر
فی سطر	۱۰ر	۸ر	۶

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے شائع ہوا

جلد (۵) شمارہ (۴)

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ ماہ خورداد سنہ ۱۳۴۰ف م مئی سنہ ۱۹۳۱ء

فہرست مضامین

جس میں ہر قسم کے سامان اسپورٹس مثلاً ہاکی، کرکٹ، نٹ بال ٹینس، بیڈ منٹن، پولو، گولف اور انڈور گیمس کے علاوہ سامان ورزش جسمانی مثلاً :- ہاریزنٹل بار، والٹنگ ہارس ڈمبلز، انڈین کلبز ڈیو پیپرز وغیرہ رعایتی نرخ پر دستیاب ہوسکتا ہے۔

بوائز اسکوٹس اور گرلز گائیڈ سے متعلق مکمل سامان کثیر تعداد میں ہمارے پاس ہر وقت موجود رہتا ہے۔ خریدیں اور آزمائیں۔

تقسیم انعامات کے لئے ہر قسم کے دیسی و ولایتی سلور اور ای۔پی کیس، شیلڈ، اور میڈلز کی واجبی نرخوں پر سربراہی کی جاتی ہے۔

کم دام اور اعلیٰ قسم ہماری ترقی کا راز ہے مکمل فہرست باتصویر طلب کیجئے۔

شائقین بلیرڈ کی خدمت میں ضروری اطلاع

نہایت مسرت سے اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم مسرز جان ڈبلیو رابرٹ لمیٹیڈ میکرز آف ٹیبل کے سیول ایجنٹ ہیں۔ اگر آپ کو نیا ٹیبل خریدنا یا پرانے کو درست کرانا ہو یا دیگر سامان متعلقہ بلیرڈ کی ضرورت ہو تو ہم سے خط و کتابت کریں آزمائش شرط ہے۔

پولگا برادرس آکسفورڈ اسٹریٹ سکندرآباد
شاخ عابد بلڈنگ حیدرآباد دکن

تقریب

از جناب سید محمد ہادی صاحب ایم۔ اے (کنٹب) ڈائرکٹر بائے اسکاوٹس

یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم ورزش جسمانی اور کھیل میں گورنمنٹ اور عوام کی جانب سے کافی دلچسپی کا اظہار ہونے لگا ہے۔ اور اُن کی اہمیت سب پر روشن ہو چلی ہے حقیقت یہ ہے کہ اب تک جو تعلیم ہمارے مدارس اور کالجوں میں دی جاتی تھی وہ ادھوری ہوتی تھی کیونکہ صرف دماغی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا لیکن اب جب کہ تعلیم کے ہر دو شعبوں کو ترقی دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ ہماری تعلیمی ترقی نہ صرف تیز رفتار ہو گی بلکہ جو نتائج اس سے حاصل ہوں گے وہ دیرپا بھی ہوں گے۔

گورنمنٹ نے فزیکل ایجوکیشن کالج کی بنیاد ڈال کر اس مضمون کی اہمیت اور اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور عوام کی خواہش اور رحجان کا خیال کرتے ہوئے اس مرتبہ حیدرآباد ٹیچر کا نمبر فزیکل ایجوکیشن کے مضامین کے لیئے مختص کر دیا گیا ہے۔ جو مضامین اساتذہ و دیگر حضرات کی خدمت میں پیش کیئے جا رہے ہیں وہ نہ صرف دلچسپ بلکہ کارآمد اور سبق آموز بھی ہیں جس سے ہم اُمید کرتے ہیں کہ تعلیم ورزش جسمانی کی اہمیت استاد اور والدین دونوں کے ذہن نشین ہو جائے گی اور اس کی نسبت جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں دور ہو جائیں گی۔

ہم اُن تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے مضامین لکھ کر اس نمبر کو شاندار بنایا ہے۔

جسمانی نشوونما

از جناب سید محمد ہادی صاحب ایم۔ اے (کنٹب) ڈائرکٹر برائے اسکاوٹس و ورزش جسمانی

(گذشتہ سے پیوستہ ملاحظہ ہو جلد ۴ شمارہ ۴)

کسرت دو قسم کی ہوتی ہے۔ تفریحی و تعلیمی۔

تفریحی کسرت سے مراد وہ تمام کھیل اور اسپورٹس ہیں جو عموماً مدارس میں کھلائے جاتے ہیں جو بچوں کے جسم کو بہتر بناتے اور اُن کے اخلاق کو درست کرتے ہیں۔ ان کھیلوں کا عمدہ اثر جو نوجوانان قوم کے اخلاق پر پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

اگرچہ تفریحی کسرت نہایت مفید اور کارآمد ہے لیکن اس سے جسم نہ تو کامل طور پر ترقی پاتا ہے اور نہ وہ اس کو تندرست و توانا رکھ سکتی ہے۔ تفریحی کسرت کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان میں پھرتی پیدا کرے اور اس کو تفریح حاصل ہو۔ اس قسم کی کسرت میں ایک اہم نقص ہے۔ جب انسان کوئی کھیل کھیلتا ہے تو اُس کے جسم کا صرف ایک حصہ جس سے اُس کھیل کا تعلق ہے زیادہ کام میں لایا جاتا ہے اور وہی ترقی پاتا ہے دوسرے حصوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور وہ اپنی حالت پر رہتے ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جو فٹبال کھیلتے ہیں اُن کے جسم کا نیچے کا حصہ بہ نسبت اوپر کے حصے کے زیادہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ ٹینس بھی نیچے کے جسم کو اور اوپر کے سیدھے جانب کے حصے کو ترقی دیتا ہے اور بائیں جانب کا حصہ اپنی حالت پر قائم رہتا ہے۔ بس تفریحی کسرت سے صرف جسم کے وہی حصے ترقی پاتے ہیں جن سے کام لیا جاتا ہے اور دوسرے حصے کمزور رہ جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تفریحی کسرت اگر کافی طور پر کی جائے تو تندرستی و توانائی کو قائم رکھتی ہے لیکن یہ اُن تمام ضروریات کو پوری نہیں کرتی جو بڑھتے ہوئے بچوں کے لئے چاہئے۔ لہذا اسی سبب سے تعلیمی کسرت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

تعلیمی کسرت اس قدر مقبول عام نہیں جس طرح کہ تفریحی کسرت ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جو فوائد اول الذکر کسرت سے حاصل ہوتے ہیں اُن سے عوام پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کسرت کی بدولت صرف جسم کے پٹھے مضبوط بنتے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ انسان کا تمام جسم اُس سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور دوران خون بھی درست ہوتا ہے۔ اگر لوگ یہ جاننے لگیں کہ تعلیمی کسرت کے سبب جسم کے ساتھ دماغ بھی ترقی پاتا ہے اور انسان اپنے کاروبار کو بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہے

تو وہ ضرور اس جانب توجہ کریں گے ۔
مدارس میں اکثر طلبہ ایسے نظر آتے ہیں جن کے جسم میں کوئی نہ کوئی خامی پائی جاتی ہے جو ذرا ہی توجہ کے ساتھ خاص کسرت کرنے سے دور ہو سکتی ہے۔ مثلاً بعض طلبہ کے سینہ سامنے جھکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور بعض کے شانے ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان نقائص کے پیدا ہونے کے کئی اسباب ہوتے ہیں جن میں کالی کھانسی اور گو بری بھی ہے جو ہندوستانی بچوں کو زمانہ طفولیت میں اکثر ہوتی ہے۔ نیز کمسن بچوں کو تنگ لباس پہنانے سے بھی ان کے جسم کو نقصان پہنچتا ہے لہذا اس قسم کے نقائص کو دور کرنے اور دماغ اور جسم کو قوت پہنچانے کے لئے تربیتی کسرت کی ضرورت ہے جو بچوں کو اُن کے زمانہ تعلیم میں مدارس میں دی جانی چاہیئے کیونکہ اسی عمر میں وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اکثر صدر مدرین کا یہ خیال ہے کہ ورزش جبراً نہ کرائی جانی چاہیئے بلکہ طلبہ کی مرضی پر چھوڑنا بہتر ہے۔ اس طرح عمل کرنا غلطی ہوگی کیونکہ کمسنی کے سبب طلبہ یہ تصور نہیں کر سکتے کہ ورزش سے انہیں کس قدر فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر ایسے طلبہ ہیں جو ورزش کے نام سے بھاگتے ہیں۔ لہذا اگر ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا تو وہ کبھی ورزش نہ کریں گے اگر کوئی لڑکا بیمار ہو جائے تو کیا ہم علاج کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں؟ اگر کوئی لڑکا ایسی غذا کھاتا ہو جس سے اُس کی صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو کیا ہم اُسے منع نہیں کرتے اور اُس کی طبیعت پر چھوڑ دیتے ہیں؟ ایسا نہیں ہوتا ہے اسی لئے مدارس میں تعلیم ورزش کو لازمی بنانے کی بھی ضرورت ہے تاکہ طلبہ بچپن ہی سے اُس کی اہمیت کو جاننے لگیں۔
یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ موجودہ طریقہ تعلیم ورزش جسمانی میں "پیرالل بار وہار یزنٹل بار" کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ان آلات سے جو کسرتیں کی جاتی ہیں وہ دشوار ہوتی ہیں اور جب تک کہ خاص قواعد کے مطابق اور ایک ماہر فن کی نگرانی میں یہ کام نہ کیا جائے تو طلبہ کو بجائے فائدہ پہنچنے کے نقصان ہونے کا اندیشہ ہے کیونکہ ان ورزشوں سے جسم پر بہت زیادہ بار پڑتا ہے۔ جو طلبہ کے لئے مضر ہے۔ یوں تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچے "پیرالل بار" پر بے طور، و رکسی کی نگرانی بغیر کسرت کر کے اپنے ہاتھ پیر توڑ لیتے ہیں۔ ہڈی کا ٹوٹنا کوئی خوف کی بات نہیں کیونکہ دوبارہ جوڑ دی جا سکتی ہے لیکن پیرالل بار پر بے قاعدہ کسرت کرنے سے جو نقصان تمام جسم کو پہنچتا ہے اُس کی تلافی نہیں ہو سکتی اس لئے مناسب یہی ہے کہ اس قسم کی کسرت کی بچوں کو ترغیب بھی نہ دی جائے۔
اکثر اساتذہ کہا کرتے ہیں کہ مدارس میں اس قدر مضامین پڑھائے جاتے ہیں کہ سالانہ کورس

ختم کرنے کے لئے وقت نہیں ملتا اگر اس پر ہفتہ میں تین گھنٹے تعلیم ورزش جسمانی کے لئے مقرر کیے جائیں تو اور بھی وقت پیش آئے گی۔ ان حضرات کو جاننا چاہیئے کہ تعلیم ورزش جسمانی طلبہ کے لئے اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ دماغی تعلیم اس کے خصوصیات اور اس کی اہمیت کو تفصیل سے بتایا جاچکا ہے اگر ہفتہ میں ستائیس گھنٹے دماغی تعلیم پر صرف کئے جائیں اور تین گھنٹے جسمانی تعلیم کے لئے دینے سے انکار کیا جائے تو یہ نہایت تعجب اور افسوس کی بات ہے۔ اگر "کورس" زیادہ اور سخت رکھا جاتا ہے تو اُن حضرات کو چاہیئے کہ اس کے کم کرنے کی کوشش کریں نہ یہ کہ اس کی خاطر بچوں پر ضرورت سے زیادہ بار ڈالیں اور عمر بھر کے لئے اُن کی صحت کو برباد کردیں۔

بعض صدر مدرسین کا خیال ہے کہ کھیل کے وقت یا بجائے کھیل کے ڈرل کرائی جانی چاہیئے۔ اس پر عمل کرنا نہایت نامناسب ہوگا۔ اگر ہمارا مقصد یہ ہے کہ طلبہ ڈرل سے فائدہ حاصل کریں تو تعلیمی اوقات سے ایک گھنٹہ کم کردیا جائے اور اس کو ڈرل کے لئے مقرر کیا جائے۔ صرف اسی صورت میں بچے ڈرل میں دلچسپی لیں گے اور اس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

کھیل اور کسرت دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے کیونکہ ہر دو کے خصوصیات جدا ہیں کھیل نہ صرف تفریحی ورزش ہے بلکہ اس کی بدولت لڑکوں میں اطاعت جیسی خصلت پیدا ہوتی ہے۔ خود غرضی دور ہوتی اور انصاف کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ کھیل کے ذریعہ ایک قابل اور ذی فہم استاد بچوں کے چال چلن اور دماغ کو بھی ترقی دے سکتا ہے۔

کسرت جسم کے نشو ونما کے لئے ضروری اور اہم ہے اس کی بدولت صحت درست رہتی ہے اور بچوں میں پھرتی پیدا ہوتی ہے۔ جسمانی نقائص مثلاً کُوب یا ڈھلے ہوے شانے دور کئے جاسکتے ہیں۔

پس کسرت اور کھیل اسی قدر اہم ہے جس قدر کہ دماغی تعلیم۔ طلبہ کے والدین اور اساتذہ کو اُن کی اہمیت سے آگاہ ہونا چاہیئے اور وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے، جو بچوں کے دماغی اور جسمانی ترقی کے لئے مناسب اور لازمی ہے۔

لڑکیوں کے لئے تربیت جسمانی کی ضرورت

از جناب سید محمد رضا صاحب اسکول آف فزیکل ایجوکیشن مدراس

ہندوستانی مدارس کی لڑکیوں کی تعلیم جسمانی پر غور کرنے سے پہلے بعض اہم سوالات توجہ طلب ہیں۔

(۱) کیا ہم عام تعلیم کی خاطر اپنی زیادہ تر جدوجہد بے فائدہ ضائع نہیں کر رہے ہیں ؟ کیا وہ روپیہ جو ایک کمزور جسم کے لئے اچھی غذا فراہم کرنے میں زیادہ مفید ہوتا بطور فیس مدارس کی نذر نہیں کر رہے ہیں ؟ کیا ہم ہر سال ایسی لڑکیوں کی زیادہ تعداد کو جو جسمانی طور پر اس کی اہل نہیں ہیں شریک مدارس نہیں کرتے ہیں ؟ جب کوئی لڑکی مدارس میں داخلہ چاہتی ہے تو اس کی تعلیمی حالت کو بہت احتیاط سے جانچا جاتا ہے لیکن صحت اور جسمانی حالت کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ ہر مدرسہ یا جامعہ میں بہت سی ایسی لڑکیاں ہیں جو جسمانی حالت کے لحاظ سے ہرگز اس قابل نہیں کہ وہاں رہ سکیں تاہم ہر قسم کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی علمی قابلیت بڑھائی جائے لیکن جسمانی حالت کے سدھارنے کی جانب بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

(۲) جب ہم یہ جانتے ہیں کہ بہت سی لڑکیاں روزمرہ کی زندگی میں بالکل ناکامیاب رہتی ہیں تو کیوں تعلیمی کوشش کو ان پر ضائع کیا جائے۔ جب ہم انجن میں پٹرول ڈالتے ہیں اور وہ حرکت سے قاصر رہتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ہماری کوشش رائگاں گئی، پھر کیوں ہم ایسی لڑکیوں کو جو لگاتار دماغی محنت کو برداشت نہیں کر سکتیں تعلیم دینے کی خطرناک غلطی کا اعتراف نہیں کر لیتے بہت کم لڑکیاں اتنی خوش قسمت ہوتی ہیں جو امتحانات میں کامیابی حاصل کرتی ہیں اور صحت کے لحاظ سے بھی غنیمت ہوتی ہیں جو بعد میں مدرسہ کے معلمات کی فہرست میں شریک ہو جاتی ہیں اور اُن کو اپنی ملازمت کے جانے کا اتنا خوف ہوتا ہے کہ وہ کوئی حقیقی کام نہیں کر سکتیں یا وہ شادی کر کے کمزور بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں۔ اُن میں اکثر ایسی ہوتی ہیں جن کی زندگی کا خاتمہ چالیس برس کی عمر سے پہلے ہو جاتا ہے۔ فی الحقیقت ان تمام المناک صورتوں کا ذمہ دار مدرسہ ہے۔ اس لئے

نہیں کہ لڑکیوں کے دماغ پر زیادہ بار ڈالا جاتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اُن کے جسم سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ اگر ہم لڑکیوں کی عام قابلیت کے بڑھانے میں کئی برس گذردیں اور ان کی صحت کو قائم رکھنے کا مطلق خیال نہ کریں تو یقیناً ہم سخت بازپرس کے قابل ہیں۔

عام طور پر ہندوستانی لڑکیوں کا مستقبل شادی شدہ ہونا اور مائیں بننا ہے۔ کیا ہم اُن کو اس قابل بنانے کے لئے کسی قسم کی مدد دیتے ہیں۔ لڑکوں کو تو ہم اُن کے پیشوں مثلاً قانون۔ طب وغیرہ کے لئے نہایت احتیاط سے تیار کرتے ہیں لیکن لڑکیوں کے۔ لئے جن پر آئندہ نسل کی صحت کا دارومدار ہے مقابلتہً کچھ بھی توجہ نہیں کرتے۔ لڑکیوں کو شاعروں کی سوانح حیات یا سائنس کی تدریجی ترقی، اور ریاضی کے جدید ترین اصولوں سے کیوں واقف کرایا جائے جب ہم جانتے ہیں کہ اُن میں سے اکثر کو علم ہندسہ کے بجائے چھوٹے بچوں کے بخار کے علاج کی واقفیت کی زیادہ ضرورت ہوگی۔

کمزور اور ضعیف بچوں کی مائیں زندگی کا حقیقی لطف حاصل نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ وہ اس تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہو سکتیں جو اُن کو مدرسہ میں دی جاتی ہے۔ مدرسہ کی تعلیم لڑکیوں کی ثانوی خواہش یعنی معلمہ بننے کے شوق کو تو پورا کرتی ہے لیکن آئندہ عملی زندگی کے لئے اُن کو تیار نہیں کرتی۔ جب واقعات یہ ہیں تو کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم طریقہ تعلیم میں ترمیم کا مطالبہ کریں۔

ہمارے موجودہ طریقہ تعلیم کا ایک اور بنیادی نقص خیال کی پستی اور خوش و خرم زندگی کا فقدان ہے ہندوستان کے مدارس و جامعات میں شاذ ہی ترقی کی روح اور طالب علمانہ چہل پہل نظر آتی ہے۔ برخلاف اس کے دوسرے ممالک میں تعلیم گاہیں بے فکری، خوشی، اور جوش کا منظر پیش کرتی ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو طلبہ کو عملی زندگی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بناتی ہیں۔

طلبہ کو سرکاری امتحانات کا اتنا خوف ہوتا ہے کہ کتابیں اُن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتیں ہمارا اعتراض کام کی نوعیت پر نہیں بلکہ طلبہ کے دماغی میلان پر ہے اگر ہم ایک خوش آئند طریقہ تلاش کریں تو یقیناً لڑکیوں کا دماغی بار بڑی حد تک کم ہو جائے گا۔ تفریح کا ایک مناسب طریقہ اس کا بہترین علاج ہے۔

عوام کی اکثریت تعلیم جسمانی کو ابتک "ڈرل" ہی سمجھ رہی ہے۔ حقیقی ڈرل در اصل خوف ناک چیز ہے۔ لیکن لڑکیوں کی تعلیم میں اُس کا بہت کم حصہ ہونا چاہئے۔ لڑکیوں کو اپنے جسم کے حالات کا معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کے لئے تحتانیہ مدارس کے نصاب تعلیم میں جہاں لڑکیوں کی زیادہ تعداد تعلیم پاتی ہے انسانی جسم کے متعلق آسان اور عام فہم رسالہ کا شریک

کیا جانا بہت مفید ہوگا۔

عموماً سب کے لئے لیکن خصوصاً لڑکیوں کے لئے یہ معلوم کرنا بھی بہت اہم ہے کہ جسم کا بیرونی ماحول سے کیا تعلق ہے۔ ہندوستان میں کئی امراض ایسے ہیں جو ابتدائی اصول کی واقفیت اور معمولی توجہ سے دور ہوسکتے ہیں۔ آب نوشیدنی کی عدم نگرانی اور صفائی کے فوائد سے عوام کی ناواقفیت۔ ملیریا، ہیضہ اور پیچش وغیرہ کئی بیماریوں کا باعث ہے۔ بیماریاں کم وبیش جاری رہیں گی لیکن اگر کوشش کی جائے تو جسم بیماریوں کے مقابلہ کے قابل بن سکتا ہے۔

تعلیم کامیاب نہیں کہی جاسکتی جب تک کہ وہ لوگوں کی صحت اور عام حالت کو بہتر نہ بنائے اور یقیناً ہماری موجودہ تعلیم اس لحاظ سے قابل تعریف نہیں کہی جاسکتی کیونکہ اس میں جسمانی حالت اور ایک حد تک دماغی حالت کا مطلق خیال نہیں رکھا گیا اور کہا جاسکتا ہے کہ اس کے متعلق زیادہ محنت رائگاں جاتی ہے۔

ہندوستان میں تعلیمی اصلاحات کی رفتار بہت سست رہی ہے وجہ یہ ہے کہ یہاں مصلح اپنی ان تھک کوششوں سے تعلیمی نقائص دریافت کرتے ہیں۔ اس میں اصلاح اور ترقی کی جانب قدم اٹھاتے ہیں لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ عین وقت پر ان کی صحت اتنی خراب ہو جاتی ہے کہ وہ کوئی کام نہیں کرسکتے۔ یا ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے چل بستے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آئندہ نسلوں کو پھر انہی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے مختلف ممالک کی اوسط عمر پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ انگلستان میں اوسط عمر ۴۶ سال، ممالک متحدہ امریکہ میں ۵۶ سال، اور سویڈن میں اس سے بھی زیادہ لیکن ہندوستان میں صرف ۲۳ سال ہے گذشتہ دس سال میں امریکہ کی اوسط عمر دس سال بڑھ گئی اور یہ زیادہ تر اس میں حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی کا نتیجہ ہے۔ اگر تعلیمات کے حکام مقتدر اس کی جانب توجہ فرمائیں تو جو کچھ دوسری جگہ ہوسکا یہاں بھی ممکن ہے۔

فزیالوجی اور حفظان صحت کے متعلق ہدایات اور کھیل و تفریح کے مناسب طریقے اس کوشش میں بہت بڑی حد تک مدد دے سکتے ہیں لیکن اس کے لئے اتحاد عمل کی سخت ضرورت ہے۔ بغیر اس کے کوئی ملک پوری طرح ترقی نہیں کرسکتا۔ اتحاد عمل اور دوسروں کی جانب ہمدردانہ خیالات کھیل اور تعلیم جسمانی ہی سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ لڑکیوں کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ ان ہی پر ہندوستان کے خوش آئند مستقبل کا دارومدار ہے۔

کھیل کا فلسفہ
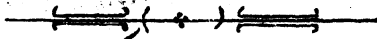
ابتدائے آفرینش سے بنی نوع انسان کے لئے "کھیل" ہمیشہ مرکز دلچسپی رہا ہے اس لئے کہ اصولاً کھیل اگر وسیع معنوں میں لیا جائے تو اُس سے مراد وہ اشغال یا افعال ہیں جو انسان کی حرکت پر عائد کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اُن میں کسی بیرونی جبر و تعدی کا مطلق دخل نہ ہو بلکہ وہ تمام تر میلانِ طبع اور ذاتی خواہش کا نتیجہ ہوں ۔ انسانی زندگی کا بہترین مطالعہ اُس وقت ہو سکتا ہے جب کہ کسی شخص یا قوم کے کھیلوں کا جائزہ لیا جائے کہ وہ اپنے فرصت کے وقت کیا مشاغل رکھتے ہیں یا کن کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں تاکہ اُن کی ذہنیت اور طبیعتوں کا اندازہ ہو سکے ۔

عامیانہ نقطۂ نگاہ سے کھیل اُس کو کہتے ہیں جب کہ انسان فارغ البال، دنیاوی فکروں سے دور اور ہر طرح سے مطمئن ہو پھر اس فرصت کے وقت میں اپنی مرضی کے مطابق دل بستگی اور تفریح کے سامان مہیا کرے جس سے اُس کو فرحت حاصل ہو۔ یہی وقت اُس کی آزمائش کا ہے۔ چونکہ اب اُس کو بہت زیادہ آزادی میسر ہوتی ہے اور وہ اپنی فرصت کا بجا یا بے جا صرف نکال سکتا ہے برخلاف اس کے دوسرے اوقات میں وہ کسی نہ کسی بندش میں رہتا ہے اس لئے اس وقت اس کو مکمل آزادی نہیں رہتی یعنے دوسرے بیرونی اثرات کے تحت وہ اپنے کام انجام دیتا ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ وہ کھیل میں اپنے اصلی رنگ میں نظر آتا ہے ۔ اور دوسرے اوقات میں اُس کی طبیعت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ کھیل میں انسان کی سیرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ چونکہ کھیل خوشی کا سودا ہوتا ہے اور اُس میں اُسے پوری آزادی حاصل رہتی ہے اس لئے اس وقت وہ جو کچھ بھی کام کرے وہ نہایت گہری دلچسپی اور مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کھیل اس کے لئے زیادہ مرغوب ہوتا ہے اور اس کا اثر اس کی فطرت اور اس کے عادات و اطوار پر بہت گہرا پڑتا ہے ۔

خواہشات کا تلاطم عہد طفولیت سے عالم ضعیفی تک ہمیشہ برپا رہتا ہے اور یہی زیادہ تر انسان کی رہبری کرتا ہے جس سے بعض اوقات نقصان بھی پہونچتا ہے یہ خواہشات روز افزوں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور یہی اُس کی ترقی کا بھی باعث ہوتی ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کھیل کی ترقی انسان کی جسمانی ترقی ہی کے لئے مفید نہیں ہوتی بلکہ اس کی ذہنی اور اخلاقی کیفیتوں پر بھی اُس کا بے حد اثر پڑتا ہے۔

یہ عام مشاہدہ ہے کہ جب کبھی آپ چھوٹے بچہ کو پکڑنے کے لئے بھاگتے ہیں وہ بھی بھاگنے کی

کوشش کرتا ہے چاہے وہ دو تین برس ہی کا کیوں نہ ہو۔ اور تھوڑی دور جا کر تھک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور پھر آپ اُس کے پیچھے دوڑئیے وہ بھی دوڑنا شروع کرتا ہے۔ اگر آپ خاموش ہو جائیں تو اُس بچہ کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ پھر ایسا کیا جائے۔ اس کے لئے بہ ظاہر کوئی معقول سبب نظر نہیں آتا کہ بچہ اس طرح کیوں دوڑے اور بے تحاشا دوڑے جب کہ اُس کا باپ ہی پکڑنے کے لئے اُس کے پیچھے بھاگے درآں حالیکہ وہ یہ جانتا ہے کہ اُس کا باپ اُس کو ایذا نہیں دے گا اور اُس کے قبل اس کو اس قسم کا تجربہ ہی نہیں تھا جو وہ اس طرح کرتا۔ یعنے بھاگنا بچوں کی جبلت میں داخل ہے دنیا کے مختلف حصوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بچہ کھیل میں چھوئے جانے سے خائف اور چھونے سے خوش ہوتے ہیں۔ یہ چیز عموماً ہر ملک کے بچوں میں پائی جاتی ہے اور یہی دو خواہشیں چھونا اور چھوئے جانے سے بچنا اس قدر زبردست ہیں کہ اُن کی توجہ انسانی قوت کو ممکنہ طور پر دوڑنے اور چکمے دینے کی طرف مائل کرتی ہے اور ان ارادوں اور خواہشات کی جھلک تمام عمر میں دکھائی دیتی ہے۔ یعنے نقصان سے بچنا خواہش کی چیزوں کی کوشش اور اس کی کامیابی کی خوشی حسیت کی بیداری اور اس میں اضافہ اکثر لوگوں میں کھیل کی بدولت ہوتا ہے آخرش یہ چیز دوسرے راستوں پر لگائی جاسکتی ہے اور اُن سے دوسرے کام لئے جاسکتے ہیں لیکن کھیل اُن کی ابتدائی صورت میں اُن کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ یہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے کھیل میں بیّن فرق ہوتا ہے۔ لڑکے مشکل اور نئے نئے کھیل سیکھتے جاتے ہیں لیکن لڑکیاں اپنی گڑیوں اور آسان کھیل میں مشغول رہتی ہیں سخت اور مشکل کھیلوں کی طرف رُخ تک نہیں کرتیں۔ یہ بات اُن کی جبلت میں داخل ہے۔ اور اسی طرح بچہ گھروندے بناتے ہیں اور کھانے اسی کی مناسبت سے پکاتے ہیں۔ اسی قسم کے کھیل بچوں کے لئے آئندہ زندگی میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی زندگی کامیابی کے ساتھ بسر کرسکتے ہیں۔

بچے کھلونے بناتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کا مالک اور ان چیزوں کو خود کا ایک جزو خیال کرتے ہیں جب وہ بستر پر جاتے ہیں وہ سب چیزوں کو اپنے ساتھ لیجاتے ہیں اور اگر اس میں کسی چیز کی کمی پاتے ہیں تو رونے لگتے ہیں۔ اور جتنی زیادہ چیزیں اُن کے پاس رہتی ہیں وہ اسی قدر خوش ہوتے اور اپنے ساتھیوں کو بتا کر فخر کرتے ہیں یہ چیز اُن کی شخصیت میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے جس بچہ کی کوئی ذاتی چیز نہیں ہوتی وہ ایک غیر ذمہ دار سا شخص ہوتا ہے۔ ذمہ داری کا احساس بچوں میں ذاتی ملکیت کی وجہ سے کھیلوں کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے جو آگے چل کر اُن کو ترقی کی راہ پر گامزن کردیتا ہے۔ بچوں میں کھیلنے کا جذبہ فطری اور بہت قوی ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جب کہ تعلیم و تربیت

سی بچوں کے حق میں ناگوار چیز کو بہت ہی خوشنما اور دلکش کر دیا گیا ہے۔ بچے برابر کھیل کی طرف مائل ہیں۔ چنانچہ متمدن ممالک میں باوجود ابتدائی تعلیم کے دلچسپ طریقہ پر رائج ہونے کے بچے برابر گلی کوچوں اور سڑک کے کناروں پر کھیلتے رہتے ہیں۔ موٹروں کی آمد و رفت کے حادثات کو روکنے کے لئے وہاں کی کوتوالی بچوں کو اس طرح کھیلنے سے روکتی اور بعض صورتوں میں سختی سے سزا بھی دیتی ہے باوجود اس کے بچے ہیں کہ انہماک سے کھیلتے جاتے ہیں اور کسی قسم کی فہمائش اور تنبیہ انہیں اس قدرتی عادت سے پورے طور پر باز نہیں رکھ سکتی۔

ظاہر ہے کہ جو چیز بالذات کتنی عمدہ اور مفید ہی کیوں نہ ہو اگر بے قاعدگی کے ساتھ برتی جائے تو اس کا فائدہ نہ صرف کم ہی ہوگا بلکہ الٹے نقصان کا اندیشہ یقینی ہے۔ یہی حال کھیل کا ہے۔ اگر نہایت عمدہ میدان تیار کر دیئے جائیں کھیلنے کا ضروری سامان فراہم کر دیا جائے اور کھیلنے والوں کو ہر طرح آزادی دے دی جائے تو باوجود ان تمام سہولتوں کے جو مفید نتائج برآمد ہونے چاہیں۔ ان کی بہت کم توقع کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ متمدن ممالک میں جہاں نہایت عمدہ گلشن اطفال اور بازی گاہیں موجود ہوتی ہیں وہاں بھی یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ جب تک ایک نگران کار مقرر کر کے ان کے کھیلنے کے طریقوں اور آپس کے برتاؤ وغیرہ کو قابو میں نہ رکھا جائے گلشن اطفال اور بازی گاہیں بیکار ہیں بلکہ کم و بیش ویسے ہی برے نتائج پیدا کر رہی ہیں جیسے کہ قدیم زمانہ کے بازاری کھیلوں میں پیدا ہوتی تھیں۔ ہمارے شہر میں بھی کھیل کو منظم کرنے کی کوششیں بحمد للہ شروع ہو چکی ہیں۔ متعدد مقامات پر گلشن اطفال بن چکے ہیں۔ نونہالان وطن ان سے پوری دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں لیکن ہمیں اس طرف خاص توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے ان کے کھیل پر نگرانی نہ ہونے سے کہیں ان میں بری خصلتیں نہ پیدا ہو جائیں جس سے نہ صرف وہ خود بد اخلاق بن جائیں بلکہ سرے سے گلشن اطفال کے وجود کو بے مصرف بنا دیں۔

سعید احمد خاں
متعلم فزیکل ایجوکیشن کالج

تعلیم جسمانی اور اُس کا مقصد

فزیکل ایجوکیشن کا موضوع اگرچہ عامیانہ نقطہ نظر سے کوئی جدید چیز نہیں ہے۔ لیکن علمی حیثیت سے اس پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ اور جو اہمیت آج اس چیز کو دی جا رہی ہے کبھی اس سے قبل نہیں دی گئی۔ کیونکہ مفہوم عام میں فزیکل ایجوکیشن کو محض ورزش جسمانی کا مترادف سمجھا جاتا رہا۔

فزیکل ایجوکیشن علمی حیثیت سے ایک وسیع بحث ہے۔ لیکن مختصراً اس کا ایک خاکہ ذیل میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

فزیکل ایجوکیشن کا مفہوم اور اُسکی وسعت

عموماً تعلیم جسمانی سے مراد اور اُس سے مفہوم قوائے جسمانی کو مضبوط بنانا اور صحت کو برقرار رکھنا لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "ہلت ایجوکیشن" اور فزیکل ایجوکیشن کو عموماً مخلوط کر دیا جاتا ہے۔ اور کوئی واضح فرق ہر دو کے درمیان قائم نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ فزیکل ایجوکیشن کی وسعت "ہلت ایجوکیشن" سے کہیں زیادہ ہے۔

ہلت ایجوکیشن انسانی زندگی کے صرف ایک شعبہ یعنے صحت سے ہے۔ اور فزیکل ایجوکیشن میں شعبہ صحت کے علاوہ مجموعی طور پر ہر شخصی ارتقا شامل ہے۔

فزیکل ایجوکیشن کا تعلق دیگر علوم کیساتھ

جس طرح طب کی بنیاد اناٹومی۔ فزیالوجی وغیرہ پر مبنی ہے بالکل اسی طرح سے فزیکل ایجوکیشن کی بنیاد بھی فطرت انسانی کے اُن حقایق پر مبنی ہے، جو علوم نفسیات۔ اناٹومی۔ فزیالوجی اور سوشیالوجی (عمرانیات) سے بطور اصول اساسی مستخرج کئے جاتے ہیں۔

فزیکل ایجوکیشن کا تخیل زمانہ قدیم وجدید میں

جس طرح ہر علم کی تاریخ کی ابتدا یونان و روما ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح فزیکل ایجوکیشن کی ابتدائی تاریخ اور اس کے تخیل کے معلوم کرنے میں بھی ہمیں یونان و روما ہی سے مدد ملتی ہے۔ یونان میں جمناسٹک اور موسیقی کو بڑا دخل حاصل تھا اور یونانی جسمانی ترقی کے لئے ان چیزوں کو ازبس ضروری خیال کرتے تھے رومی بھی جسمانی تربیت کو فوجی اغراض کے لئے مفید تصور کرتے تھے اور اُن کا مقصد اس سے اچھے فوجیوں کو پیدا کرنا تھا۔ اسپارٹا کے لوگ تو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ اپنے کمزور اور بیمار

بچوں کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر نذر اجل کر دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ جسمانی ترقی کی بجائے دماغی نشو و نما کا خیال بڑھتا گیا اور دونوں کے آپسی انحصار کی لاعلمی کی وجہ سے ایک کو نظر انداز کر کے دوسرے کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ اور جسمانی انحطاط، دماغی انحطاط کا باعث ہوا۔ بالآخر آج ہم جسمانی ترقی پر بھی اتنی ہی توجہ مبذول کرنے پر مجبور ہوئے جتنی کہ دماغی نشو و نما کے لئے۔

حقیقت یہ ہے کہ عقل کا مقام دماغ ہے اور دماغ کی ترقی نظام عصبی میں مضمر ہے۔ نظام عصبی کی کارکردگی میں اضافہ عضلات کی ترقی پر منحصر ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جسمانی ترقی ذہنی و دماغی ترقی کے مناسب نشو و نما کے مترادف ہے جس کو اسٹانلی ہال نے اس طرح بیان کیا ہے "فزیکل ایجوکیشن بجائے خود کوئی مقصود نہیں۔ اس کی غایت دماغی اور اخلاقی تربیت ہے اس سے احساسات اور دل و دماغ کی بالیدگی ہوتی ہے"۔

فزیکل ایجوکیشن کا مقصد فزیکل ایجوکیشن کے مقاصد بیان کرنے سے قبل اس کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مقصد کے تعین کی تعلیم میں کس قدر ضرورت ہے اصول تعلیم کا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی کام میں انسان کو اس وقت تک دلچسپی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس فعل کا اس کی زندگی سے کوئی تعلق اور اس کی ضرورت کا احساس نہ کرایا جائے۔ آج کل جدید اصول تعلیم میں اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور ترقی یافتہ ممالک میں تو پراجکٹ میتھڈ جیسے نئے طریقے روشناس کئے گئے ہیں۔ فزیکل ایجوکیشن کے مقاصد کو متعین کرنے میں ہمیں حسب ذیل اصول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے

۱ ۔ فزیکل ایجوکیشن کے اغراض و مقاصد۔ نفسیات۔ حیاتیات۔ عمرانیات کے مسلمہ مسائل پر مبنی ہوں۔

۲ ۔ فزیکل ایجوکیشن کے مقاصد۔ انفرادی خصوصیات اور اجتماعی ضروریات کے حامل ہوں۔

۳ ۔ اس کا مقصد نقائص کی اصلاح یا جسمانی ورزش ہی تک محدود نہ ہو۔

ان اصول کی بنا پر فزیکل ایجوکیشن کے مقاصد دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ جسمانی اور تعلیمی۔ اس لحاظ سے اس کے مقاصد ذیل کے مختلف عنوانوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔

جسم کو حرکت دے کر عضویاتی نظام کو ترقی دی جائے۔ یہاں اس کے ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ جسم کی مشنری میں نظام عصبی کی کیا اہمیت ہے۔ اور اس کے پرداخت میں غور و خوص کس قدر ضروری ہو۔ ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ عضویاتی نظام کی عمدگی خود صحت کی بنیاد ہے۔ جس سے یہ اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے کہ تعلیم جسمانی کا مقصد عین صحت ہی کی ترقی ہے لیکن

یہ خیال اسی طرح غیر درست ہے جس طرح کہ تعلیم کے متعلق یہ قرار دینا کہ اس کا مقصد صرف روزی کمانا ہے ۔ صحیح طور پر مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ فزیکل ایجوکیشن صرف صحت ہی کے لئے نہیں بلکہ ان نظامات کے ارتقا کے لئے ہے۔

تعلیم جسمانی کا دوسرا مقصد عصبی عضلاتی نظام (نیورو مسکولر سسٹم) کا ارتقا ہے ۔ بالخصوص ان نظامات کا ارتقا جس سے انفرادی خاص صلاحیتیں نشو ونما پاتی ہیں۔ اس قسم کی صلاحیتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً بعض اقسام کے ناچ اور پیراکی کی مہارت اگرچہ اس میں مہارت حاصل کرنا بظاہر غیر مفید معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے متذکرہ صدر نظام نشو ونما پاتا ہے۔

تیسرا مقصد اُن رجحانات کا ارتقاء ہے ۔ جو جسمانی فعلیتوں (Activities) کے جانب مائل ہوتے ہیں۔ اور بالخصوص کھیل کے جانب۔ کھیل صحت کے لئے یا اعصاب کی کمزوری رفع کرنے کے خاطر ہی نہیں کھیلا جاتا۔ بلکہ اس لئے کہ کھلاڑی کو اس سے ایک مسرت حاصل ہو مثال کے طور پر ٹینس کے دو کھلاڑیوں پر غور کیا جائے ۔ جن میں سے ایک تو محض اس لئے کھیلتا ہے کہ وہ اپنی غیر معمولی جسامت کو گھٹائے ۔ اور دوسرا محض کھیل کی خاطر۔ ظاہر ہے کہ آخر الذکر کو کھیل کا نسبتاً زیادہ لطف حاصل ہوگا ۔

فزیکل ایجوکیشن کا چوتھا مقصد سیرت و کردار کا ارتقا ہے ۔ اس کی نمایاں مثال کھیل کے میدان میں بہ آسانی مل سکتی ہے ۔ جہاں ایک کھلاڑی بعض قواعد کے تحت اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہمی تعاون کرنا سیکھتا ہے ۔ اور بالواسطہ اس کو ضبط نفس۔ اطاعت۔ راست بازی وغیرہ کی تعلیم حاصل ہوتی ہے ۔

اختتام فزیکل ایجوکیشن کو موجودہ زمانہ میں عام تعلیم کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے اس لئے تعلیم کی دیگر اقسام کی طرح اس کو بھی حالات زندگی کی تبدیلیوں کے مطابق ہونا چاہئے اگرچہ یہ اعلیٰ تصوری زندگی کا مقصد اعلیٰ نہیں ہوسکتا تاہم عام تعلیم کے مسلمہ اغراض کے حصول میں ممد ومعاون ہے۔ اس لحاظ سے مدرسہ کے ایک مضمون کی حیثیت سے اُس کے چند خاص رغایات ہیں۔ اولاً اُس کو ایسا ماحول مہیا کرنا چاہئے جس سے لڑکے کو ایسی جسمانی فعلیتوں میں مشغول ہونے کا موقع ملے۔ جو بجائے خود تشفی و مسرت بخش ہوں۔ ثانیاً اُس کو ایسے حالات فراہم کرنا چاہئے۔ جس سے لڑکوں کو ایسے افعال کے ذریعہ جس سے اُس کی ذات کا اظہار ہوتا ہو دماغی ترقی کا موقع ملے۔ ثالثاً فزیکل ایجوکیشن کا یہ بھی مقصد ہوگا کہ لڑکے کو ایسے مواقع بہم پہونچائے۔ جن میں وہ بحیثیت سماجی فرد (سوشل فرد) کے ترقی کرسکے۔

محمد عبدالقادر صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی۔ کالج آف فزیکل ایجوکیشن

تعلیم جسمانی

یہ تبلانا کہ تعلیم جسمانی کی ابتدا اور ضرورت کیونکر ہوئی بہت ہی دشوار ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسا مواد موجود نہیں جس کی بنا پر ہم اپنے خیالات کی بنیاد قائم کر سکیں۔ تعلیم جسمانی کے محقق کو صرف اُن ہی بیانات پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جو اُس کو ماہرین طبقات الارض اور ماہرین عمرانیات سے ملے ہیں۔ اور ان ہی بیانات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علم کی ابتدا اور ضرورت انسانی زندگی اور اُس کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ انسان اپنی ابتدائی زندگی میں اُن تمام ضروریات کو جو زندگی کے لئے ضروری ہیں جسم کی حرکت اور اعضاء کے استعمال سے پورا کرتا تھا۔ مثلاً چلنا پھرنا۔ کودنا۔ تیرنا۔ شکار وغیرہ۔ اس زمانہ میں ان حرکات کو کسی باضابطہ صورت میں ظاہر نہیں کیا گیا۔ مگر جوں جوں تہذیب کی وسعت کے ساتھ انسانی زندگی میں ترقی ہوئی جسم کی حرکت اور رگ پٹھوں کے استعمال کو بھی ایک مکمل فن سمجھا جانے لگا۔ تاریخ شاہد ہے کہ یونانیوں نے سب سے پہلے اس فن کے میدان میں قدم رکھا اور جسمانی حرکت کو ایک علم اور فن کی صورت میں ترتیب دیا۔ تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ اس علم و فن کو اتنا فروغ ہوا کہ موجودہ زمانہ میں جہاں کہیں تعلیم جسمانی کا ذکر آتا ہے یونانی مجسمے بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔ تعلیم جسمانی سے یونانیوں کا اصلی مقصد جسمانی تناسب خوبصورتی اور ذہنی ترقی تھا۔ یونانی زوال کے بعد رومی عہد میں اس علم کے بالکل ہی جداگانہ معنے لیے جانے لگے۔ اس دور میں تعلیم جسمانی فوجی تعلیم کا ایک حصہ بن گئی۔ اہل رومہ کا اصلی مقصد اس تعلیم کے ذریعہ پوری دنیا کا فتح کرنا تھا اس لئے یہ علم اُن کی مطلب برآری کا ذریعہ بن گیا۔ اس دور میں بجائے ترقی کے یہ علم منجملہ اور خرابیوں کے زوال کا باعث ہوا۔

رومی زوال کے بعد مدت تک یہ علم مغرب سے بالکل ہی غائب رہا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں جب نشاۃ جدیدہ کا دور شروع ہوا اور دیگر علوم کی ترقی شروع ہوئی تو ارباب حل وعقد نے مرد۔ عورت اور بچوں کی تندرستی اور صحت کے لئے اس علم کی ابتدا کی اور بلحاظ ضرورت اس علم کو سائنٹفک اصول پر ترتیب دیا۔ کچھ عرصہ بعد یہی اصول انگریزی' جرمانی' اور امریکی طریقوں کے نام سے موسوم ہوئے۔ جنگ عظیم کے بعد سے جرمنی۔ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں اس علم کو دیگر علوم کے مساوی سمجھا جا رہا ہے۔ اس علم کو تشریح بدن' عضویات' حیاتیات اور علم الانسان وغیرہ سے گہرا تعلق ہے۔ باوجود ان تمام تعلقات کے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ملک کی تعلیم جسمانی دوسرے ملک کی ضروریات اور ماحول کے تحت مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ مثلاً

ڈنمارک کی تعلیم جسمانی امریکہ کے عوام کو نہیں دی جاسکتی اس لئے کہ امریکہ کا ماحول اور تمدن ڈنمارک سے
بالکل جداگانہ ہے اور ضروریات مختلف ہیں۔

تعلیم جسمانی وہ تعلیم ہے جو انسان کی جسمانی اور دماغی قوت میں اضافہ کرتی اور اُس کی کارکردگی
کو بڑھاتی ہے یوں کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم جسمانی انسان کو روزمرہ کے کاموں میں دوسرے اعضاء کو نقصان
پہونچائے بغیر قوت اور راحت بخشتی ہے۔ ماہرین فن نے موجودہ تعلیم جسمانی میں ایسے مشاغل شامل کئے
ہیں جو انسان اپنی ابتدائی زندگی میں کیا کرتا تھا جس سے نہ صرف اُس کی ضروریات زندگی پوری ہوتی تھیں
بلکہ روحانی خوشی بھی حاصل ہوتی تھی۔ مثلاً چلنا پھرنا۔ کودنا۔ تیرنا۔ کشتی۔ گھوڑ بازی۔ وزن اندازی۔ شکار
وغیرہ۔ ان مشاغل میں موجودہ تعلیم کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی شغلہ ایسا نہیں ہے جس سے انسانی قامت
اور اعضاء کو نقصان پہونچے برخلاف اس کے وہ تمام جسم کو تقویت بخشتی ہے اس کے علاوہ دل اور شش
کو بھی سانس کے اندر لینے اور باہر چھوڑنے سے ورزش ہو جاتی ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا دارومدار زیادہ
تر ان دونوں کی صحت پر ہے

ایسے علوم جن کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے بتلاتے ہیں کہ انسانی جسم کسی نہ کسی ورزش کے لئے
بنایا گیا ہے اور اسی وجہ سے جسم میں مختلف قسم کے بڑے اور چھوٹے رگ و پٹھے پائے جاتے ہیں کہ ہر ایک
اپنی ضروریات کے لحاظ سے کام کرے۔ یہ ایک قدرتی قانون ہے کہ جو اعضاء کام نہیں کرتے وہ کچھ عرصے کے
بعد بالکل بیکار ہو جاتے ہیں۔ اس قانون کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور روزمرہ کی زندگی میں کسی ایک حصہ پر زور
دیا جاتا ہے اور دوسرے حصے بے کار چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اگر دماغ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو دوسرے
اعضاء بیکار رہ جاتے ہیں اور رگ و پٹھوں کا زیادہ استعمال ہوتا ہے تو دماغ سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔
ایسی حالت میں ورزش یکطرفہ رہ جاتی ہے اور اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسانی قامت اور
قدرتی قانون میں نقص پیدا ہو جائے۔

اس نظریہ کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیم جسمانی کا ایسا نصاب ہونا چاہیئے جس میں حسب ذیل امور کا خیال
رکھا جائے۔

(الف) ایسے کھیل و تماشے جس میں زیادہ تر قواعد و ضوابط نہ ہوں۔ (ب) ایسی تعلیم جس کا
ہدایات صحت عمل صحت اور انسانی کردار سے تعلق ہو۔ (ج) ڈرل اور ایسے کھیل جس میں زیادہ جسمانی
اور دماغی محنت شامل ہو۔ (د) چال چلن پھرتی تیزی تحمل اور خود داری پر زور دیا جائے۔ اس سے
زیادہ کھیل اور دوڑ وغیرہ کے مقابلوں پر زور دیا جائے۔ کیونکہ تعلیم جسمانی اُس وقت تک مکمل نہیں کہی جاسکتی

جب تک کہ اس میں کمیل کے سامان مہیا نہ ہوں جب تعلیم میں اس امر کو ملحوظ رکھا جائے ہر چھوٹے بڑے کے لئے یکساں مفید ہے۔

اب دیکھنا چاہئے کہ جو تعلیم جسمانی ہندوستانی مدارس میں دی جا رہی ہے آیا وہ اصول کے مطابق ہے یا نہیں۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن اصول پر بہت کم عمل ہو رہا ہے۔ کیونکہ مدارس میں بچوں کو اس علم کی طرف بالکل ہی کم رغبت ہے اور وہ اس کام میں بہت کم حصہ لیتے ہیں۔ موجودہ مدارس کی تعلیم جسمانی بچوں کی دلچسپی اور ترقی کا باعث نہیں ہوتی بلکہ اُن پر زبردستی عائد کی جاتی ہے۔ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں کسی خاص قسم کی تعلیم جسمانی مقرر نہیں ہے۔ اکثر مقامات میں ہندوستانی ورزش ڈنڈ بیٹھک پر مشتمل ہوتی ہے۔ بلحاظ عمر بچوں کے لئے یہ ورزش بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے اُن کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچ رہا ہے۔ جو اُستاد اس قسم کی تعلیم کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں وہ ناخواندہ ہوتے ہیں اور اُن کو بچوں کی تربیت کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ مدرسہ کے علاوہ ہندوستان میں اکھاڑے بھی اس کام میں مدد دیتے ہیں لیکن ان میں ایسے بدوضع لڑکے جمع ہوتے ہیں کہ بجائے درستگی کے بچوں کی عادت میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر جمناسٹک اور فوجی ڈرل پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اُن کا اصل مقصد بچوں کو فوجی تعلیم دے کر فوجی بنانا ہوتا ہے۔ اور بعض مقامات ابھی اسی تذبذب میں ہیں کہ ہندوستان میں کس طریقہ کی تعلیم جسمانی دی جانی چاہئے۔ آیا جرمنی۔ انگریزی۔ امریکن یا ولندیزی۔ مگر یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ ہندوستانی طلبہ کس چیز کے زیادہ تر خواہشمند ہیں اور اُن کی ضروریات کس قسم کی ہیں۔ اگر ہم مغربی ممالک کی تعلیم جسمانی یہاں رائج کریں تو ہمیں یقین ہے کہ ہندوستانی طلبہ کا میلان اُن کی طرف نسبتاً اپنی گھریلو ورزش کے کم ہوگا۔ اور اگر گھریلو ورزش اختیار کی جائے تو نقصان اور خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ ہم کو چاہئے کہ صرف اپنی گھریلو ورزش پر قانع نہ رہیں بلکہ اور مقامات سے جہاں اس تعلیم کو زیادہ ترقی دی گئی ہے کچھ فائدہ اُٹھائیں۔ اور ایک ایسی تعلیم جاری کریں جو ہماری گھریلو اور غیر مقامات کی ورزش کا مجموعہ ہو اور بچوں کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا جماعت واری نصاب مقرر ہو جس میں تدریجی ترقی ملحوظ رہے۔ اور یہ تعلیم علم الابدان، عضویات اور نفسیات پر مبنی ہو تاکہ طلبہ میں علاوہ صحت اچھی ہونے کے اطاعت، ضبط، خودداری حب الوطنی اور سچائی وغیرہ پیدا ہو۔ کیونکہ یہ عادات نہ صرف بچپن ہی میں فائدہ مند ہوتے ہیں بلکہ آئندہ زندگی میں قومی فلاح و بہبود کا باعث بھی ہوتے ہیں۔

ہندوستانی مدارس و جامعات کے اعداد شمار سے پتا چلتا ہے کہ جب طالب علم پہلے سال مدرسہ میں شریک ہوتے ہیں تو اُن میں ورزش اور کھیل کود کی طرف زیادہ رغبت ہوتی ہے اور جب وہ ترقی کرتے

اونچی جماعتوں میں پہنچتے ہیں تو یہ خواہش نسبتاً کم ہوتی جاتی ہے اور جسمانی قامت میں خرابی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ لڑکے کئی گھنٹوں تک ایک ہی حالت میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور بہت کم وقت اُن کو تفریح کے لئے ملتا ہے۔ ۹۹ فیصدی تعداد ایسی ہے جن کے قامت میں خرابی ہوتی ہے اور اُس کے دور کرنے کے لئے ڈرل* ہی ایک ذریعہ ہوسکتی ہے۔ اس ڈرل میں گردن۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ سینہ اور دیگر اعضاء پر زور پڑتا ہے اور جسمانی نقص دور ہوسکتا ہے۔ اس میں اور بھی کئی خوبیاں مضمر ہیں جن کا عام صحت پر اثر پڑتا ہے۔ اگر یہ ڈرل نہ کرائی جائے تو اکثر خرابیاں جو غلط طریق سے بیٹھنے۔ کھڑے رہنے۔ لکھنے اور پڑھنے سے پیدا ہوتی ہیں اور جس کا اثر بازوؤں کی گولائی پیٹ اور ریڑھ کی ہڈیوں کی خرابی میں ظاہر ہوتا ہے بڑھ جائنگی۔ کم از کم ایسی ڈرل بیس (۲۰) یا پچیس (۲۵) منٹ روزآنہ کرائی جانی چاہیئے۔ اس ڈرل کے بعد کم از کم ادھ گھنٹہ کھیل کی طرف متوجہ کرانا چاہیئے۔ اور تمام کھیلوں کے سامان مدارس میں مہیا ہونے چاہیئے۔ کیونکہ کھیل سے اسپورٹ مین شپ اور دیگر عمدہ عادات پیدا ہوتے ہیں۔ ماہرین نفسیات نے یہ بتلایا ہے کہ جوں جوں لڑکے اعلیٰ جماعتوں میں ترقی کرتے جائیں دماغی کام کم ہو اور کھیل اور تفریح کے سامان زیادہ۔ چنانچہ جرمنی، امریکہ اور مغربی ممالک میں اس پر بہت زور دیا جارہا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد جرمنی نے جو ڈرل اور کھیل میں ترقی کی ہے وہ قابل ذکر ہے۔ آج کل جرمنی میں گیمس، اتھلیٹک اسپورٹس، ہیراکی اور ڈرل پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ اور تمام شہروں میں بازی گاہ تماشا گاہ اور تیرنے کے حوض وغیرہ بنائے گئے ہیں جن میں لوگ بعض تماشے کی خاطر اور بعض عملی حصہ لینے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ ملک جرمنی تمام دنیا کی اقوام میں اس میدان میں سبقت لے جارہا ہے اور یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہاں کی آبادی کھیل و تفریح میں دنیا کی آبادی سے بہت آگے نکل گئی ہے۔

اب ہندوستانی طلبہ کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ زور ڈرل اور کھیل پر دیا جانا چاہیئے۔ اکثر مقامات پر ہندوستانی طلبہ کو شاید ہی کہیں کھیل کا موقع ملتا ہے کیونکہ کوئی خاص مقام اور جگہ مقرر نہیں ہے جہاں تمام لڑکے جاکر کھیل سکیں اور جہاں کم جگہ دستیاب ہوتی ہے وہاں پر ایک اور خرابی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ جو کمزور مبتدی ہوتے ہیں اور جن کو کھیل کود کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اکثر مرتبہ مایوس ہوکر تماشبین بن جاتے ہیں۔ پس تمام مدارس میں کم از کم ایک ایسا میدان ہونا چاہیئے جہاں لڑکے آسانی سے کھیل سکیں۔ اور تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ کنڈرگارٹن مدارس میں کم از کم ۱۵۰ مربع فٹ تحتانیہ مدارس میں ۲۵۰ مربع فٹ۔ وسطانیہ مدارس میں ۵۰۰ مربع فٹ۔ فوقانیہ مدارس میں ۱۰۰۰ مربع فٹ اور جامعات میں ۲۵۰۰ مربع فٹ زمین فی طالب علم ہونی چاہیئے اور کم از کم ایک گھنٹہ

* Caisthenics

خاص طور پر کھیل کے لئے مقرر کیا جانا چاہیے۔ ان تمام کھیلوں پر خاص طور پر نگرانی ہونی چاہیے ورنہ لڑائی جھگڑوں کا اندیشہ ہے۔ آج کل ہندوستان میں کھیل اور اسپورٹس اکثر مقامات پر لڑائی جھگڑوں پر ختم ہوتے ہیں کیونکہ اُن میں کوئی باضابطگی نہیں پائی جاتی اور کھیل کے اصلی مقصد پر زور نہیں دیا جاتا بجائے برادرانہ محبت اور یک جہتی کے عناد پایا جاتا ہے۔ اس لئے نگرانی کے لئے ایسے تعلیم یافتہ استاد مقرر کیئے جائیں جو فن سے واقف ہوں۔

کروچ اسٹارٹ کی ابتدا

یہی ایک آغاز ہے جس کو بین الاقوامی مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس سے پہلے بہت سے دوڑنے والوں نے اور کئی ایک ماہرین دوڑ نے بتعدد قسمیں ایجاد کیں لیکن کسی کو بھی اتنی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ آج کل (۱۰۰) سو گز سے لے کر چار سو چالیس (۴۴۰) گز کی دوڑ تک یہی آغاز مفید ثابت ہوئی ہے۔

اس کی ابتدا ۱۸۸۸ء میں چارلس۔ ایچ۔ شرل نامی ایک دوڑنے والے نے کی۔ درآں حالیکہ اس آغاز کا موجد ایک اور شخص میکل۔ سی۔ مرفی تھا۔

چارلس۔ ایچ۔ شرل۔ راکے ہنٹ کلب کی دوڑ میں شریک ہوتا ہے تماش بینوں سے لے کر مجیٹر تک کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ سب کے سب یہ سمجھتے ہیں کہ شرل آغاز سے واقف ہی نہیں۔ اس کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ مگر ان کو یہ معلوم کرایا جاتا ہے کہ شرل اسی ہیئت سے آغاز کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شرل اسی آغاز کی بدولت اس دوڑ میں اول آتا ہے۔

اس آغاز میں سامنے کا پیر خط آغاز سے کم از کم ۴ انچ اور زیادہ سے زیادہ ۱۲ انچ پیچھے رکھا جاتا ہے۔ ہر دوڑنے والے کو چاہیئے کہ ۴ سے ۱۲ انچ تک جو فاصلہ از روئے تجربہ مناسب سمجھا جائے اس پر عمل پیرا ہو۔ پچھلے پیر کا گھٹنا سامنے کے پیر کی ایڑی کے مقابل رکھے اور جسم کا بوجھ ہاتھ کی اُنگلیوں اور پیر کے پنجوں پر رہے۔

نگاہ آغاز کے وقت یا تو اُس مقام پر رہے جہاں پر کہ پہلا قدم رکھا جائے گا۔ یا خط آغاز سے تقریباً تیس فٹ (۳۰) کے فاصلہ پر رہے۔ یہ یاد رہے کہ اس دوڑ میں پہلے قدم کا فاصلہ

خط آغاز سے زائد از زائد (۱۸) انچ کا ہو۔

جسم کا پورا بوجھ ہاتھ کی انگلیوں پر اس طرح رہے کہ اگر دوڑنے والے کا ایک ہاتھ جائے قیام سے ہٹا دیا جائے تو وہ فوراً گر جائے بوقت قیام دونوں ہاتھوں کا درمیانی فاصلہ جسم کی جسامت کے لحاظ سے رکھا جائے۔ مگر عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر دونوں ہاتھوں کا درمیانی فاصلہ (۲) فٹ سے زیادہ کا ہو تو سرعت سے آغاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اور بسا اوقات ہاتھوں کا درمیانی فاصلہ زیادہ رکھنے سے دوڑنے والے کے گر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہاتھ کی انگلیاں خط آغاز کے پیچھے اس طرح جمی رہیں کہ انگوٹھا اور انگشت شہادت تقریباً ایک ہی خط مستقیم میں ہوں اور ایک ہاتھ کا انگوٹھا دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے کے ٹھیک مقابل ہو چونکہ بوقت آغاز پیر کے پنجوں اور ہاتھ کی انگلیوں پر بیٹھتے ہیں اس لئے دوڑ کی ابتدا کے قبل پیر کے مضبوط جمے رہنے کی غرض سے چھوٹے چھوٹے گڑھے بنائے جاتے ہیں۔ جن کی پچھلی دیواریں تقریباً عمودی اور مقابل کی دیواریں مائل ہونی چاہئیں۔ یہ گڑھے پنجوں کو ٹیکنے کے لئے بنائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے پیر مضبوط جمے رہتے ہیں اور پیر کے پھسلنے کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔

سو گز کی دوڑ ۔ اس دوڑ میں آغاز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں پر کہ اسپورٹس کا معیار بلند ہے۔ وہاں کی اوسط رفتار کے دوڑنے والے بھی سو (۱۰۰) گز کی دوڑ بآسانی ۱۱ یا ۱۲ ثانیوں میں ختم کر سکتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ درجہ کے دوڑنے والوں نے دس سے کم ثانیوں میں بھی اس کو طے کیا ہے۔

سو گز کی دوڑ دس (۱۰) ثانیوں میں ختم کرنے کے یہ معنی ہیں کہ دوڑنے والا دس (۱۰) گز فی ثانیہ یا بیس (۲۰) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ ماہرین دوڑ کی یہ رائے ہے کہ اگر کوئی شخص معقول طریقہ سے آغاز کرے تو امید کی جاسکتی ہے کہ ۹ ثانیوں میں سو (۱۰۰) گز طے ہو سکیں گے۔

آج تک مشاہدہ سے جو بات ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ۳۴ فٹ فی ثانیہ سے تیز تر دوڑنا محال سمجھا گیا ہے۔

دوڑ ۔ اس دوڑ میں پہلا قدم بہت بڑا ڈالنے کی کوشش کرنا خالی از اندیشہ نہیں۔ آغاز نہایت ہی سرعت کے ساتھ ہو لیکن ابتدائے دوڑ میں تیزی کے ساتھ لگاتار بڑے بڑے قدم ڈالنا قرین مصلحت نہیں ہے آغاز کی بعد رفتار میں بتدریج ترقی کی جائے۔ رفتار میں ایسی ہی ترقی چاہئے جیسی کہ ایک ریلوے انجن میں ہوتی ہے نہ کہ ایسی جیسی کہ ایک موٹر کی رفتار میں ہوتی ہے۔ آغاز کے ساتھ

ہی جسم کو دوڑ کی اصلی وضع میں نہ لانا چاہیئے۔ سامنے کی پیر کی حرکت میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ گھٹنا ہمیشہ اس قدر اونچا اٹھایا جائے کہ ران زمین سے تقریباً متوازی ہو جائے۔

دوڑ کی اصلی وضع سے مراد جسم کی وہ ہئیت ہے جس کی کہ جملہ ماہرین دوڑنے بلا استثنا سفارش کی ہے تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ حسب ذیل طریقہ سے دوڑنے میں بے حد سہولت ہے۔

دوڑتے وقت جسم کسی قدر سامنے کو جھکا رہے اور سر جسم اور پچھلے پیر کی پنڈلی کا ایک ہی خط مستقیم میں رہنا بھی ضروری ہے۔ اور اس وقت سر دھڑ اور پچھلے پیر کی پنڈلی ایک ہی۔ مائل خط مستقیم میں ہوں۔

قدم کے فاصلے مختلف قد و قامت کے اشخاص کے لئے مختلف ہوں گے۔ بہت ہی اونچے اور اعلیٰ درجے کے دوڑنے والوں کے لئے بھی ۷ فٹ ۶ انچ سے زیادہ کا ایک قدم لینا نامناسب ہوگا۔ مگر عموماً ۶ اور ۷ فٹ کا درمیانی فاصلہ قدم مفید سمجھا گیا ہے۔

پاؤ میل یا ۴۴۰ گز کی دوڑ اس دوڑ کے واسطے بھی کروچ آغاز مفید سمجھی گئی ہے اس دوڑ میں پہلے ایک سو (۱۰۰) گز کا فاصلہ تیز رفتار سے اور آخری سو (۱۰۰) گز کا فاصلہ بہت زیادہ تیز رفتار سے دوڑنا چاہیئے۔ درمیانی دو سو بیس (۲۲۰) گز کے فاصلہ میں گہری سانس لینا اور قدم میں مساوات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اس دوڑ میں قدم کا فاصلہ اتنا زیادہ نہ ہونا چاہیئے جتنا کہ سو گز یا دو سو بیس گز والی دوڑیں ضروری ہے۔ جسم کا سامنے کو جھکا رہنا اور سر اور جسم کا ایک ہی خط مستقیم میں رہنا بھی ضروری ہے۔ اوسط[1] فاصلہ کی دوڑ میں ہاتھوں کو زیادہ حرکت دینے کی ضرورت نہیں۔ ہاتھوں کی حرکت میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ ہاتھ کہنیوں سے خمیدہ او رصرف سامنے اور پیچھے حرکت کرتے رہیں۔

اس دوڑ میں پیر کی حرکت میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ سامنے کا پیر کسی قدر گھٹنے سے خمیدہ ہو اور پچھلے پیر کی پنڈلی زمین سے تقریباً متوازی رہے۔ دوران مشق میں چھوٹے[2] کیلوں کا جوتا استعمال کیا جائے اور پہلے پندرہ روز تک آہستہ آہستہ دوڑنا قرین مصلحت ہے اور پہلے ہفتہ میں صرف تین روز کی مشق کافی ہے۔ دوسرے یا تیسرے ہفتہ میں ۳/۴ حصہ فاصلہ مقررہ کا آہستہ

---

[1] اوسط فاصلہ کی دوڑ سے مراد ۴۴۰ یا ۸۸۰ گز کی دوڑ ہے۔

[2] دوڑ کے جوتے خاص طور سے تیار کئے جاتے ہیں ان کے تلے میں صرف ۶ یا ۷ کیلے ہوتے ہیں جن پر پیر کا پورا بوجھ ہوتا ہے۔

اور $\frac{۱}{۴}$ حصہ تیزی سے دوڑنا چاہیئے جوں جوں مشق بڑھتی جائے تو نصف حصہ تیز اور نصف حصہ آہستہ دوڑنا مفید ہوگا۔

ٹٹی دوڑ[۱] اس دوڑ کے لیئے بھی کروچ آغاز مفید ہے۔ گو یہ ایک "راہی کرتب[۲]" ہے لیکن اکثر لوگ اُس کو غلطی سے "میدانی کرتب[۳]" تصور کرتے ہیں۔ یہ ممالک متمدنہ کی ایک نہایت ہی دلچسپ اور پسندیدہ دوڑ ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج تک کسی نے بھی ۱۴ $\frac{۲}{۵}$ سکنڈ سے کم میں اُس کی تکمیل نہیں کی۔ اور وقت مندکرہ میں اس دوڑ کی تکمیل نہ صرف معمولی بات ہے بلکہ قابل ستائش ہے۔ اور آج تک ارل تھامسن ہی کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اُس نے اس قدر قلیل عرصہ میں اس دوڑ کی تکمیل کی یہ ایک سو بیس (۱۲۰) گز کی دوڑ ہے۔ جس میں ٹٹیاں دس دس گز کے فاصلہ سے استادہ کی جاتی ہیں۔ اور راستہ کے ہر دو جانب یعنی خط آغاز سے پہلی ٹٹی تک اور آخری ٹٹی سے خط اختتامی تک پندرہ پندرہ گز کا فاصلہ خالی ہوتا ہے۔ اس میں ہر ٹٹی کی بلندی ۳ فٹ ۶ انچ اور عرض ۴ فٹ کا ہوتا ہے۔ اس دوڑ میں عموماً لمبے قد کے اشخاص کامیاب رہے ہیں۔

ہر ایک ٹٹی دوڑنے والے کو سب سے پہلے نپے ہوئے قدم سے دوڑنے کی ضرورت ہے اس لئے زمانہ مشق میں اس پر کافی وقت صرف کیا جائے۔ کیونکہ ماہرین کی یہ رائے ہے کہ ہر دو ٹٹیوں کا درمیانی فاصلہ ۳ یا ۵ قدم میں طے کیا جائے اور ابتدائی (۱۵) گز کا فاصلہ کل (۸) قدم میں طے کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ایک ٹٹی سے دوسری ٹٹی تک کا فاصلہ ۳۰ فٹ سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ اب اگر ۸ فٹ کا فاصلہ ۳ یا ۵ قدم میں طے کر لیا جائے تو صرف (۱۲) فیٹ کا فاصلہ بیچ رہے گا۔ جس کو حسب ذیل طریقوں سے طے کرنا مفید و مناسب ہے۔

جست کرنے کا مقام کا فاصلہ باڑ سے بہ نسبت اترنے کے مقام کے فاصلہ سے زیادہ ہونا چاہیئے، یعنی دوڑنے والا اس وقت جست کرنے کا ارادہ کرے جب کہ وہ ٹٹی سے ۶ یا ۷ فٹ کے فاصلہ پر ہو اور دوسری جانب اترنے کا مقام ٹٹی سے ۴ یا ۵ فٹ کے فاصلہ پر ہو اگر یہ فاصلہ ۴ یا ۵ فٹ سے بھی کم ہو تو مناسب ہے۔

---

1. Hurdle Race.
2. Track event.
3. Field event.

ظاہر ہے کہ بعض سیدھے اور بعض بائیں پیر سے اُچکنے کے عادی ہوتے ہیں اور جس پیر سے جست کی جاتی ہے وہ پیر یقیناً پیچھے رکھا جاتا ہے اور اُس کے مقابل کا پیر سامنے ہیں ٹٹی پر سے گذرتے وقت سامنے کے پیر کو تقریباً سیدھا رکھنا مناسب ہوگا لیکن پچھلے پیر کا ہر حصہ زمین سے متوازی اور ہر جوڑ سے زاویہ قائمہ کی شکل بنانا نہایت اچھا ہے یعنی ران جسم سے اور پنڈلی ران سے اور پنجہ پنڈلی سے اس قدر جھکا رہے کہ سامنے کا پیر اور جسم کے خم سے حرف (د) کی شکل نمودار ہو۔ جو پیر کہ ٹٹی پر سے گذرتے وقت سامنے ہوگا اس کے مقابل کا ہاتھ سامنے ہوگا اگر یہ فرض کیا جائے کہ سیدھا پیر ٹٹی پر سے گذر رہا ہے تو سیدھا ہی ہاتھ پیچھے ہوگا تاکہ جسم کا جھوک سنبھلا رہے۔

اس دوڑ میں خاطر خواہ کامیابی کے لئے اس قسم کی ورزش کرنی چاہیں جس سے پیٹ کے پٹھے زیادہ قوی ہوسکیں نہ صرف یہی بلکہ ٹٹی دوڑ والوں کو کئی ایک ایسی ورزشیں کرنی پڑتی ہیں جس کی بدولت اُن کے جوڑوں میں بآسانی مڑنے کی ایک خاص قابلیت پیدا ہو جائے۔

چند گُر

(۱) ہر چھوٹے فاصلہ کی دوڑ میں کہ جس کا راستہ سیدھا بنایا جاتا ہے دوندوں کو راستے کے بیچوں بیچ سے دوڑنے کی مشق کرنی چاہیئے۔

(۲) ہر بیضوی یا مدوری راستہ کی دوڑ میں دوڑنے والے کو راستہ کے بالکل کنارے سے دوڑنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(۳) ہر سیدھے راستے کے دوڑنے والے کی نظر اختتامی ڈوری پر ہونی چاہیئے۔

(۴) ہر دوڑنے والے کو چاہیئے کہ اختتامی ڈوری کو اپنے سینہ سے مس کرے۔

(۵) ہر دوڑنے والے کو یہ ہمیشہ کوشش کرنی چاہیئے کہ دوران دوڑ میں اس کا جسم کسی قدر سامنے کو جھکا رہے۔

(۶) ہر دوڑنے والے کو دوڑتے وقت ہرگز پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہیئے کیونکہ ½ ثانیہ کا وقفہ بھی بڑی بڑی دوڑوں میں ایک کثیر نقصان پیدا کر دیتا ہے۔

(۷) ہر دوندہ کا نقطۂ نظر یہ ہونا چاہیئے کہ اس کو اختتامی خط سے کچھ فاصلہ زیادہ بھی دوڑنا ہے۔ دوران مشق میں اس بات کا ضروری لحاظ رکھا جائے۔

(۸) دوڑ کے اختتام پر طولانی جست کرنا خالی از اندیشہ نہیں۔

(۹) مدوری راستہ کے دوڑنے والوں کو موڑ پر پوری تیزی سے مڑنے سے اپنے راستہ سے دور نکل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے بدیں وجہ ایسے دوندوں کو صرف موڑ پر اپنے سیدھے پیر کے انگوٹھے کا رخ راستہ کے

خط کے اندرونی طرف رکھ کر دوڑنے کی مشق کرنی چاہئے تاکہ آسانی پوری رفتار سے مڑسکیں۔

(۱۰) دوڑیں ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ گھٹنے جانبین میں ترچھے نہ اٹھیں بلکہ سیدھے

(۱۱) اوسط اور بڑی دوڑوں کے واسطے دوران مشق کم از کم تین (۳) ماہ کا ہونا چاہئے۔

(۱۲) بڑی دوڑوں اور تیز اوسط درجہ کی دوڑوں کی مشق بعد از طبی معائنہ شروع کی جائے۔

(۱۳) بڑی دوڑوں میں عمر کا ضروری لحاظ رکھا جائے یعنی کم عمر لڑکوں کو بڑی دوڑوں میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔

کھیل

لفظ کھیل منجملہ اُن کئی الفاظ کے ہے جس کے معنی کا اظہار دو چار جملوں میں مکمل طور سے نہیں ہوسکتا ماہرین فن اس کی تعریف مختلف پہلوؤں سے کر چکے ہیں لیکن کوئی ایک تعریف ایسی نہ ہوسکی جو لفظ کے پورے معنی پر حاوی ہو سکے "کارل ایل سی شور" کی تعریف "کھیل وہ ہے جس میں انسان اپنے آپ کو حقیقی طور پر ظاہر کرے" یا اون اور میچل کی تعریف "جو کام کھیل کے معنوں کو پورا کرے کھیل ہے" بعض بہترین تعریفوں میں شمار کی جاتی ہے۔

کھیل کی ابتدا انسانی زندگی کے ساتھ ہوئی ہے۔ چلنا، دوڑنا، کودنا، چڑھنا اور پھینکنا انسان کے فطرتی حرکات ہیں اور کھیل منحصر ہے ان ہی حرکات پر۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ کھیل انسانی زندگی کا لازمی جزو ہے۔

آثار قدیمہ جس حد تک دستیاب ہوئے ہیں شاہد ہیں کہ بابل اور مصر جیسے قدیم شہروں کے باشندے کھیل کے بے حد شائق تھے ملک چین میں بھی بہت سے کھلونے نقوش اور دوسری ایسی چیزیں پائی گئی ہیں جو قدیم باشندوں کے کھیل کے مذاق کو ظاہر کرتی ہیں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ ابتداً سب چیزیں بھدی اور ناقص ہوتی ہیں۔ یہی حال کھیل کا ہے۔ ماہرین فن کا اندازہ ہے کہ بھاگنا، تعاقب کرنا، گرفتار کرنا اور رنبج نکلنا پہلے زمانہ کے عام و مقبول کھیل تھے۔ اس کے بعد ۷۷۶ ق م میں ہم یونان کے مشہور عالم "تنظیم یافتہ" "اولمپک گیمس" کا ذکر پاتے ہیں جن سے موجودہ زمانے کے اکثر ترقی یافتہ کھیلوں کو راست تعلق ہے۔ مندرجہ بالا تحریر سے مطلب یہ ہے کہ کھیل

کی تدریجی ترقی نہایت مختصر طور پر واضح کردی جائے۔

فی زمانا یہ میلان عام ہوگیا ہے کہ تعلیم کھیل کے ذریعہ دی جائے۔ ہر قسم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس بات کا ضرور خیال کیا جاتا ہے اور ایسے طریقے دریافت کئے جاتے ہیں کہ بچے تعلیم کو کھیل کے پیرایہ میں حاصل کرسکیں۔ وجہ یہ ہے کہ کھیل بچوں کے فطرت میں داخل ہے اور یہ اُن کی دلچسپی کا باعث ہے اس لئے تعلیم میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اس میں کھیل کا عنصر شامل کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ بچے وہ دماغی تکان محسوس نہ کریں۔ جو معمولی طریقہ تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ بات بھی کھیل کی ضرورت کو بہت بڑی حد تک ثابت کرتی ہے۔

مسٹر ڈین (پلاننگ افسر مدراس) اپنی ایک حالیہ تقریر کے سلسلے میں بیان کرتے ہیں کہ آج کل ہر شہر کی تنظیم میں دیگر اہم ضروریات کے ساتھ "بازی گاہوں" کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہوگیا ہے متمدن ممالک اس کام کے لئے بے دریغ روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ مدراس کی ایک نئی اسکیم کا نقشہ تبلاتے ہوئے صاحب موصوف نے ثابت کیا کہ بازی گاہیں شہر کو ہر لحاظ سے مکمل بنانے کے لئے کس قدر ضروری ہیں۔

اب اس بات پر غور کرنا کہ کھیل میں کونسی ایسی خوبیاں ہیں جس کے لئے اس کو اتنی اہمیت دی جائے نامناسب ہوگا۔

کھیل جسمانی قوت کو بڑھاتا ہے۔ آج کل شہری بچوں سے ورزش کا شوق اُٹھ گیا ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کھیل ہی ایک طریقہ ہوسکتا ہے۔ کھیل زیادہ تر اعضائے رئیسہ کو تقویت دیتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ کی قوت جسمانی قوت سے بہت زیادہ اہم ہے۔ تقریباً تمام کھیل قدیم ہیں اور جسم کو حرکت دینا اُن کا لازمی جز ہے۔ ان میں سے اکثر دوڑنے پر مشتمل ہیں جو ہاتھ پاؤں اور دل کو تقویت دیتے ہیں۔

کھیل کود دماغی نشو ونما میں بہت بڑا دخل ہے وہ بچوں کے تجربہ کو بڑھاتا اور ان کے تجسس، قوت متخیلہ اور عام ذہنی قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔

ڈاکٹر "سی شور" کا بیان ہے کہ "اعلیٰ دماغی قابلیتیں" حواس خمسہ اور عام جسمانی قوت کے استعمال کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جاتی ہیں۔ بچوں کے کھیل اُن کے اپنے اندرونی جذبات کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ کھیل کا ایک دلچسپ پہلو ہے۔ بچے بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں اور کھیل ہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی حقیقت کو آزادی سے ظاہر کرسکتے ہیں۔ اُن کے خیالات

عمل کی صورت اختیار کرتے ہیں اُن کی ذہنی قوتیں متحرک ہوتی ہیں اور ان کی توجہ فطرت اور خصوصاً دیگر انسانوں کے بنائے ہوئے نمونہ جات کی نقل میں صرف ہوتی ہے۔ اُن میں ابھی باقاعدہ عادات کا نشوونما نہیں ہوتا لیکن اُن کی حساس طبیعت اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے آزاد ہوتی ہے۔ وہ سخت جد وجہد، بے تکان محنت اور مستقل مزاجی سے کام لیتے ہیں یعنی کھیل کے ذریعے مشکلات پر غالب آتے ہیں۔"

ڈاکٹر جے۔ ایم۔ ٹیلر اس کو اور زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ اگر کسی نوعمر لڑکے کو کھیلتے ہوئے دیکھیں تو آپ اس کی حرکات کی تبدیلیوں اور دیگر امور کو دیکھ کر لطف حاصل کریں گے۔ ان میں سے اکثر اچھی ورزش کا باعث ہوتی ہیں لیکن جہاں تک کھیل کے نتیجہ کا تعلق ہے محض تضیع قوت ہیں۔ رفتہ رفتہ کھیل کی ترقی کے ساتھ وہ اُن چیزوں پر قابو پا جاتا ہے گویا قوت کے استعمال میں کفایت شعاری کو مدنظر رکھتا ہے۔ یہ اپنے آپ پر قابو رکھنے کا اولین اور بہترین سبق ہے۔ تربیت یافتہ کھلاڑی کے کھیل میں صفائی اور باقاعدگی اس کی قوت سے کچھ کم قابل تعریف نہیں۔ وہ تمام عمر قوت کی حفاظت کرتا ہے جب کہ دوسرے اُس کو بے نتیجہ جد وجہد میں ضائع کرتے ہیں۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کھیل سے حافظہ، قوت متخیلہ، قوت تمیز، اور قوت استقلال کی ترقی ہوتی ہے اور انسانی زندگی کو باقاعدہ کرتے میں اُس سے مدد ملتی ہے۔

کھیل سے معاشرتی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ سی شور کے الفاظ میں "بچوں کے کھیل معاشرتی کشمکش کا اچھا نمونہ ہیں۔ جنگ اور محبت، لڑائی اور ایثار، فرمانبرداری اور رعونت، ترقی اور تنزل، گھریلو کاروبار اور بیرونی مہم کے جوش وغیرہ میں بچے اپنی حد تک کام کرتے ہیں اور بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ان کی اصل کو سمجھتے جاتے ہیں۔ جوش اور سنجیدگی، عقلمندی اور بیداری غرض کتنی خوبیاں ہیں جو کھیل کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں اور آئندہ عملی زندگی میں فرائض اور ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے انجام دینے میں معاون ہوتی ہیں۔

کھیل اس لحاظ سے بھی کہ اُن سے مقابلے، ایثار اور مساوات کی عمدہ صفات حاصل ہوتی ہیں۔ معاشرتی فوائد کے حامل ہیں۔

یہاں تک کھیل سے جسمانی دماغی اور معاشرتی فوائد پر مختصراً بحث کی جا چکی ہے۔ اب ہم انسانی زندگی کے ایک دوسرے اہم پہلو یعنی اخلاق کو لیں گے اور دیکھیں گے کہ کھیل اس کو سنوارنے کا کہاں تک ذمہ دار ہے۔

بعض لوگوں کا زاویہ نگاہ 'اخلاق' کے معنوں کے متعلق بہت تنگ ہے وہ اس کو صرف برائی کے مقابلے میں جانچتے ہیں لیکن دلیری، لگاتار کوشش، مہربانی، تہذیب، فرمانبرداری، اتفاق اور وفاداری وغیرہ سب اس کی تعریف میں شامل ہیں۔

صحت مند جسم و دماغ اخلاق کو وسیع کرتے ہیں۔ جسمانی تناسب اور دماغی قوت خود بخود اخلاقی صفات مثلاً روشن خیالی اور خود اعتمادی کی جانب رہبری کرتی ہیں۔ کھیل کے اس پہلو کو بہت عرصہ پہلے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انگلستان امریکہ اور دیگر متمدن ممالک میں کھیل کو اس لحاظ سے خاص اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ تجربے سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مدارس کے مضامین میں کوئی مضمون ایسا نہیں جو کھیل سے بڑھ کر لڑکوں کے اخلاق کو سنوارے۔

مرزا یوسف علی بیگ
اسکول آف فزیکل ایجوکیشن
مدراس

ورزش جسمانی

اگر کوئی طالب علم تعلیم میں اعلیٰ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو ہمیشہ صحت برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔ جب تک کامل طور پر صحت قایم نہ رہے گی اس وقت تک دماغی ترقی غیر ممکن ہے۔ دنیا میں انسان کے لئے صحت سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں انسان کی زندگی کا دارومدار صحت ہی پر ہے اگر صحت نہ ہو تو دنیا کی تمام نعمتیں بے کار اور زندگی تلخ ہو گی۔ صحت سے مراد یہ ہے کہ ہر عضو جسمانی اپنے منصب کو جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے پوری طور پر ادا کرے۔ یعنی جب جملہ قویٰ اور جذبات انسانی مل کر ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے ہیں تو اس حالت کو صحت کہتے ہیں بالفاظ دیگر صحت نام ہے اس حالت کا جس میں بدن کو کوئی دکھ درد نہ ہو اور نہ دل کو کوئی فکر رہے۔ صحت، خوبصورتی اور مستعدی۔ پاکیزگی اور تقدس، خوشی اور ترقی کا سرچشمہ ہے تندرست شخص وہ ہے جو مندرجہ ذیل خصوصیات سے متصف ہو:۔

اعضا میں بدرجہ اتم تناسب ہو۔ بدن میں چستی اور کام میں دلی شوق اور مستعدی ہو۔ شیریں مزاجی اس کی طبیعت کا خاصہ ہو اور وہ دوسروں کی سود و بہبود میں ساعی رہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ تمام قویٰ کے افعال باقاعدہ اور منظم ہوں یہی وہ حالت ہے جس کی ہر ایک کو تمنا کرنی چاہئے اور اس کے

حصول کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ قیام صحت کے لئے انسان کو کیا تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے اس کا مختصر جواب ورزش ہے بقول شخصے کہ ؎

دوا کوئی ورزش سے بہتر نہیں
یہ نسخہ ہے کم خرچ بالا نشیں

ورزش جسمانی تمام اعصاب کو طاقت بخشتی ہے اسی وجہ سے اعضا میں چستی اور مستعدی پیدا ہو جاتی ہے اور بدن کے ناقص اجزا فنا ہوتے ہیں اعصاب، قلب اور شرائین کو مجبور کرتے ہیں کہ جلد جلد خون تمام اعضا میں پہونچائیں اور فنا شدہ اجزا کے بجائے نئے اجزا پیدا کریں جس سے بدن میں خون صالح پیدا ہوتا ہے، بھوک بڑھ جاتی ہے ہاضمہ قوی ہوتا ہے۔ چونکہ خون تیزی کے ساتھ پھیپھڑوں میں جاتا ہے اور جلد جلد دم لینا پڑتا ہے اس لئے سینہ خوب پھیلتا ہے۔ پھیپھڑے بخوبی بڑھتے اور دماغ میں کثرت کے ساتھ خون پہونچاتے ہیں۔ دماغ اور اعضاء جسمانی کا تعلق مسلمہ ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ٹیلیفون ایکسچینج اسی طرح خون بھی دل و دماغ سے ہو کر تمام اعضاء جسمانی میں پہونچتا ہے جب ہر عضو جسمانی کا تعلق دماغ سے گہرا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ جسمانی ترقی کے ساتھ جسمانی ترقی نہ ہو اسی لئے ہماری فیاض گورنمنٹ نے طلبہ کے لئے ترقی تعلیم کے ساتھ ساتھ ورزش جسمانی کا انتظام بھی اعلیٰ پیمانہ پر کیا ہے۔ اب میں اُن ورزشوں کا ذکر کروں گا جو جسم و دماغ کو ترقی دیتی ہیں۔ ایسی چار جنرل ورزشیں ہیں۔

(۱) بازوؤں کی ورزش (۲) ٹانگ کی ورزش (۳) گردن کی ورزش (۴) دھڑ کی ورزش۔

(۱) بازوؤں کی ورزش اُن پٹھوں کو بڑھاتی ہے جن سے بدن کے اُٹھانے اور دھکا دینے کا کام ہوتا ہے کندھوں کے جوڑ طاقتور ہوتے ہیں اور ریڑھ اور پیٹ کے پٹھوں پر زیادہ قابو رکھنا آتا ہے۔ کندھوں اور کہنیوں کے جوڑ کی لچک بڑھتی ہے جسم کا اوپری حصہ سیدھا اور ٹھیک ہوتا ہے اور بازوؤں کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔

(۲) ٹانگوں کی ورزش سے پنڈلی اور پیر کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں اور چپٹے نہیں ہونے پاتے گھٹنوں کے جوڑوں میں لچک پیدا ہوتی ہے وہ پٹھے جو ران کے جوڑوں کو جھکاتے ہیں طاقتور ہوتے ہیں اور اُن پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ اس سے دماغ میں روانی پیدا ہوتی ہے اور جیٹ پٹ سوچنے اور کام کرنے کی طاقت بڑھتی ہے۔ طبیعت میں ایک قسم کا جوش پیدا ہوتا ہے۔

(۳) گردن کی ورزش سے سر اور ریڑھ کا اوپری حصہ سیدھا اور ٹھیک ہوتا ہے اور اس کا بڑا اثر پسلی اور سینہ پر پڑتا ہے۔ حلق اور کھوپری کی بیٹھک کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں گردن کی

ریڑھ کی لچک بڑھتی ہے اور پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔

(۴) دھڑ کی ورزش دھڑ کے اگلے پچھلے اور بغل کے پٹھوں کو ٹھیک طرح سے بڑھاتی ہے۔ وہ پٹھے جو ریڑھ کو گھماتے ہیں مضبوط ہوتے ہیں اور اس سے ہضم کرنے والے نلوں کو بھی فائدہ پہونچتا ہے۔ کمر کی ریڑھ کا حصہ لچک دار ہوتا ہے اور ان کے پچھلے حصے کے پٹھے پھیلتے ہیں۔ ریڑھ سیدھی ہوتی ہے۔ پسلیوں کے اٹھنے سے سینہ ابھرتا ہے اور پھیپھڑوں میں زیادہ سانس رکتی ہے۔

مندرجہ بالا ورزشوں سے یہ فوائد اس وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ ورزش اعتدال سے متجاوز نہ ہو۔ ورزش کرنے میں باقاعدگی برتی جائے اور مقام ورزش ہوا دار ہو۔

عموماً لڑکے بہت بری طرح سانس لیتے ہیں جس سے پھیپھڑوں کو کافی غذا میسر نہیں آتی اور وہ کمزور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ہوا اُن کے لئے بمنزلہ غذا کے ہے اس لئے ہر ایک طالب علم کو کم از کم (۱۵) منٹ سانس کی ورزش سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یہ ورزش سانس لینے والے عضلات کو مضبوط کرنے کے لئے بے حد مفید ہے اس سے سینہ بخوبی پھیلتا ہے۔ پھیپھڑے ہوا سے پُر ہوتے ہیں اور اُن میں حیرت انگیز قوت آتی ہے اس سے کئی ایک بیماریاں خود بخود دفع ہو جاتی ہیں۔

ورزش جسمانی کے بغیر بھی بعض ایسے ذرائع ہیں جن سے ہم اپنی صحت کو قایم رکھ سکتے ہیں مثلاً غذا اور پانی میں احتیاط، سویرے اٹھنا، غسل کرنا، جسم کی صفائی، چہل قدمی و تفریح، ترکت سوسائٹی۔ نیک خیالی وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں جس سے صحت پر خاص اثر مترتب ہوتا ہے۔

ڈرل ماسٹروں کا تعلق زیادہ تر طلبہ کی ورزش اور اُن کے جسمانی و دماغی نشو و نما سے ہے اس لئے انہیں چاہئے کہ طلبہ کو اصول ورزش اور اُس کے فوائد ذہن نشین کراتے جائیں۔ ان کا طرز بیان ایسا دلچسپ ہو کہ طلبہ میں خود بخود اُن اصولوں پر کاربند رہنے کا دلی شوق پیدا ہو نیز ورزش میں جہاں تک ہو سکے دلچسپ کھیلوں کا عنصر بھی ضرور شامل رہے تاکہ طلبہ خوشی سے ورزش کے گھنٹے کا انتظار کریں

ورزش اور کھیل بچوں کی عمر اُن کی طاقت اور ضروریات کے لحاظ سے مناسب و موزوں ہوں۔ جن طلبہ کے اعضا کمزور ہوں اُن کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہئے۔ اور اُن سے اس قسم کی ورزش لی جائے جو ان کی تقویت کا باعث ہو۔ تاکہ مدرسہ کی ورزشوں کا اثر ہر طالب علم کی آیندہ زندگی میں عرصہ دراز تک باقی رہے ورزش اور جسمانی تفریح کی عادت جو مدرسہ کی چار دیواری میں سیکھی جائے وہ آیندہ زندگی کا بنیادی پتھر ثابت ہو۔

اگر ڈرل ماسٹروں کے علاوہ معلمین و صدر معلمین اس میں دلچسپی لے کر طلبہ کے آتش شوق کو تیز کر دیں اور ڈرل ماسٹروں کا ہاتھ بٹائیں تو یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ورزش جسمانی کا مقصد پوری طور پر حاصل ہو سکتا ہے۔ بہرحال سب کچھ طریقہ تعلیم اور عمل پر موقوف ہے۔ بغیر اس کے ورزشوں کا کوئی نصاب خواہ وہ کیسا ہی قیمتی اور اعلےٰ درجہ کا کیوں نہ ہو، پوری طرح کامیابی حاصل نہیں کر سکتا اگر تربیت جسمانی کے صحیح طریقے ٹھیک طور پر برتے جائیں تو اس تربیت سے نئی قسم کے طالب علم پیدا ہوں گے جو زیادہ چست و چالاک زیادہ سمجھ دار اور زیادہ ذہین ہوں گے۔

مرزا یوسف علی بیگ

ڈرل ماسٹر مدرسہ وسطانیہ چیتاپور

کھیل اسپورٹس نشانات و حدود

مجلس انتظامی اسپورٹس کو بازی گاہ کے انتخاب میں امور ذیل کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے شرطیں جو انہیں کرنی ہیں اس کے لئے کس قدر جگہ درکار ہے۔ عوام اور شرکائے اسپورٹس کو کس مقام پر زیادہ سہولت پہنچ سکتی ہے۔

یہ بات مشاہدہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ عوام عموماً بہ نسبت دور دراز مقامات کے قریب ترین مقامات پر تماشہ بینی کے لئے زیادہ شوق و اشتیاق سے جاتے ہیں لہذا ضرورت ہے کہ شرطیں بشرط امکان آبادی کے کسی درمیانی میدان میں ہوں۔ عوام کا زیادہ اجتماع مستقبل کی شاندار شرطوں کا پیش خیمہ ہے۔ لہذا بازی گاہ میں عوام کے ہر طبقہ کو آرام و سہولت پہونچانے کا کافی بند و بست کیا جائے۔

منتظمین اسپورٹس و پیمائش کنندگان کو بازی گاہ میں شرطوں کے لئے نشانات و حدود اندازی کرنے میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

مدعو ناظرین کی نشست کے لئے ایک ایسی جگہ مختص کی جائے جہاں سے وہ تمام شرطیں آسانی دیکھ سکیں اور تمام شرطوں کی ابتدا اور اختتام انہی کے روبرو ہو۔

ایسی شرطیں جن میں ضرر کا احتمال ہو انہیں عوام و دیگر مقابلہ کنندگان کی پہونچ سے دور لیکن مدعو ناظرین کی نظر میں رکھنا چاہئے۔ مثلاً ہتوڑا (Hammer) قرص (Discus)

برچھی (Hammer) وغیرہ مدعو ناظرین کی موٹروں۔ بگیوں۔ اور سیکلوں کے ٹھیرانے کی علحدہ جگہ مقرر ہو۔

شرطیں ایسے موسم میں نہ مقرر کی جائیں جب کہ ہوا کثرت سے چلتی ہو کیونکہ زیادہ ہوا مقابلہ کنندگان کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے۔ ہوا دوڑنے والے کے مخالف رخ چل رہی ہے تو مقابلہ کنندہ زیادہ وقت میں اختتام پر پہونچے گا۔ اگر موافق ہو تو جلد۔ لہذا صحیح وقت کا تعین نہیں ہو سکتا۔ دوسرے موسموں میں بھی اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کبھی ہوا مقابلہ کنندہ کے مخالف یا موافق نہ چلے اگر بازووں سے چلے تو مضایقہ نہیں۔

نشان اندازی میں خیال رکھیں کہ سورج شرکا اسپورٹس کے دوران کرتب میں مقابل نہ ہو۔ دوڑ اور رسہ کشی کے لئے زمین زیادہ نرم ہو نہ بہت زیادہ سخت بلکہ اوسط ہو۔ اوسط زمین نہ ہونے کی صورت میں سخت زمین کو نرم زمین پر ترجیح دی جائے۔

مقابلہ کنندگان کے لئے ایک جگہ ایسی مقرر ہونی چاہیے جہاں وہ اپنی ضروریات سے بھی فارغ ہو سکیں

مقابلہ کنندگان کے لئے مدعو ناظرین کی نظروں سے دور یعنی اُن کی نشست گاہ کے پیچھے ایک ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں وہ اپنی شرط میں شریک ہونے سے قبل مشق کریں تاکہ اکڑے ہوئے رگ و پٹھے کھل جائیں۔

وقت اور پروگرام کی پابندی کے لئے ایک ایسی گھڑیال کی ضرورت ہے جس سے تمام کو وقت معلوم ہو سکے۔

شرط کے اختتام پر عوام کے معلومات کے لئے ہر شرط کے نتیجہ کا اعلان کرنا ضروری ہے۔

شمار کنندہ یا وقائع نگار (Scorers) کا خیمہ گھڑیال گھر کے قریب ہو۔ اور اسی گھڑیال کے قریب تختہ نتائج ہو۔

اونچی جست، دراز جست اور چوب چھلانگ وغیرہ کے لئے اٹھارہ یا بارہ انچ گہرے گڑھے میں باریک ریت اور لکڑی کا بورا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ ریت کافی نرم ہو اور کودنے والے کو ریت میں ضرر کا احتمال نہ ہو اور وہ آزادی سے جست لینے کی کوشش کرے۔

نشان سفید ہوں اور دو انچ کی چوڑائی سے زاید نہ ہوں۔

سیدھی دوڑ میں مقابلہ کنندہ کے لئے چار فٹ کی گلی از ابتدا تا اختتام قائم کر دی جائے۔

محمد امجد علی خاں
معلم گورنمنٹ فزیکل کالج

عہدہ داران اسپورٹس اور ان کے فرائض

متمدن اقوام کا ہمیشہ یہ مطمحِ نظر رہا ہے کہ انہوں نے دل و دماغ کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ جسمانی نشو ونما کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھا۔ چنانچہ کسی متمدن قوم کو لیجئے اور اُس کی حالت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دماغی و ذہنی ترقی کے دوش بدوش جسمانی ترقی بھی اپنے منازل طے کر رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ قوم دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے اور زمانہ کا تجربہ بہ بانگ دہل یہ کہہ رہا ہے کہ ایسی اقوام جنہوں نے دماغی و جسمانی ترقی کو ایک دوسرے کا لازم و ملزوم نہ گردانا وہ کبھی اپنے عروج کے نصف النہار تک نہ پہنچ سکیں۔ یونانیوں کا مقولہ "صحیح جسم کے ساتھ ساتھ صحیح ذہن ہوتا ہے" بالکل صحیح اور درست ہے۔ جس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ تندرست شخص کا دماغ بھی اچھا رہ سکتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اعضا جسمانی کا ایک دوسرے سے اس قدر مضبوط رشتہ اور ایسا گہرا تعلق ہے کہ ایک دوسرے کے ضعف و قوت کا اثر ایک دوسرے پر پڑے بغیر نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں اگر ہماری جسمانی حالت ناقص اور کمزور رہے تو ہمارا دماغ کسی طرح بھی کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکتا۔

اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ہاں دماغی و ذہنی ترقی کی داغ بیل پڑ چکی ہے اور بہت سے نوجوان جن پر ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں لیکن جسمانی حالت کے مدنظر وہ اس قابل نہیں ہیں کہ میدان عمل میں آکر ایسا کام کریں جو ملک اور قوم کی اصلاح میں اکسیر ثابت ہو۔ اسی نقص کو دور کرنے اور نونہالان ملک کی جسمانی حالت سنوارنے اور انہیں ملک اور قوم کے لئے مفید اور موثر بنانے کے لئے حال ہی میں فزیکل ایجوکیشن کی تحریک کامیاب ہوئی اور کالج آف فزیکل ایجوکیشن قائم کیا گیا جس کا مقصد اعظم طلبہ کی جسمانی ترقی ہے۔ اس کالج کے اور بھی بہت سے مقاصد ہیں جن کا اظہار اس موقع پر طول عمل ہوگا۔ نفس مضمون کے متعلق کچھ عرض کیا جائے۔

کھیل کے جلسے:۔ جہاں کہیں بھی اور جس قدر اس قسم کے جمگھٹے ہوتے ہیں اور جہاں تک ہمارا مشاہدہ ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن میں بہت کچھ نقائص پائے جاتے ہیں جن کی اصلاح

کی فی زمانہ سخت ضرورت ہے ۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان نقائص کا باعث اصلی مجلس انتظامی اور اسپورٹس کے دیگر عہدہ داروں کی اپنے اپنے فرائض منصبی سے بے خبری اور لاعلمی ہے اور یہی ایسی چیزیں ہیں جو کسی صورت میں بھی کسی جلسہ کو کامیاب نہیں بنا سکتیں اور واقعہ بھی ہے ۔ جب مشین کے کل پُرزے ہی کام نہ دیں تو مشین کا چلنا معلوم ۔ بعینہٖ یہی حالت ہماری اسپورٹس کے جلسوں اور اُن کے عہدہ داروں کی ہے ۔

بنا بریں مناسب یہ سمجھا گیا کہ عہدہ داران اسپورٹس اور اُن کے فرائض سپرد قلم کئے جائیں جو مندرجہ نقص کے دور کرنے میں ایک حد تک محدود معاون ہو سکیں ہمارے مضمون کا ماخذ مسٹر تیج ۔ سی ۔ بک ۔ یم ۔ پی ۔ ٹی کی کتاب ہے   اس بات کی حتی الوسع کوشش کی گئی کہ انگریزی اصطلاحات اُردو میں ڈھالے جائیں لیکن بصد افسوس اظہار کرنا پڑتا ہے کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی ۔ اس لئے ہم اس اہم مسئلہ کو اُن حضرات پر رکھ چھوڑتے ہیں جن کو وضع اصطلاحات میں خاصہ ملکہ حاصل ہے ۔

اسپورٹس کے جلسوں کو کامیاب بنانے اور کامیابی کے ساتھ انجام دینے کے لئے مختلف عہدہ داروں کی ضرورت ہوتی ہے جن کے تفویض مختلف خدمات کی جاتی ہیں ۔ البتہ معمولی جلسوں میں چند عہدہ داروں ہی سے کام چل جاتا ہے ۔ بڑے بڑے جلسوں کا مندرجہ ذیل عہدہ داروں کے بغیر کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہونچنا ایک دشوار امر ہے ۔

۱۔ مجلس انتظامی اسپورٹس — [illegible]
۲۔ رفری یا حکم — Referee
۳۔ اختتامی جج یا نگراں کار — [illegible]
۴۔ میدان نگران کار — Field judge
۵۔ راہ نگران کار — Track judge
۶۔ ناظر — Inspector
۷۔ گھڑیالی — Timer
۸۔ چال نگران کار — [illegible]
۹۔ رہبر — [illegible]
۱۰۔ وقائع نگار — Scorer
۱۱۔ مجیز — [illegible]
۱۲۔ پیمائش کنندہ — [illegible]
۱۳۔ مُعلن — [illegible]
۱۴۔ ڈاکٹر — Doctor
۱۵۔ نامہ نگار — Press Steward

مجلس انتظامی اور اُس کے فرائض :— ہر اسپورٹس میٹنگ کے لئے مجلس انتظامی کی سخت ضرورت

ہے۔ اس میں ایک میر مجلس اور حسب ضرورت اراکین مقرر کئے جاتے ہیں۔ اس مجلس کے فرائض حسب ذیل ہیں۔

(الف) بازی گاہ کا انتخاب (ب) بازی گاہ میں انتظام نشان اندازی (ج) دستور العمل کی تیاری اسپورٹس کے لوازمات کی فراہمی اور بازی گاہ کی آرائش۔ (د) عہدہ داروں کا انتخاب (ط) اسپورٹس کی ترتیب (ی) ٹیموں کی شرکت و عدم شرکت (ک) مقابلوں کی تنظیم (ح) ایسے امور کا تصفیہ جن کے متعلق اسپورٹس کے قواعد خاموش ہیں۔

مُنصری یا حکم۔ یہ شخص تمام عہدہ داران اسپورٹس کا صدر ہوتا ہے۔ اس کے فرائض میں امور ذیل داخل ہیں۔

الف۔ ان تمام اعتراضات کا جو قواعد سے متعلق ہیں یا جن کا قواعد میں ذکر نہیں تصفیہ کرنا۔ اس کا تصفیہ قطعی اور ناطق ہوگا۔

ب۔ اسپورٹس کی نگرانی۔ اس سے یہ مراد ہے کہ آیا تمام اسپورٹس اپنے اپنے اوقات معینہ پر ہو رہے ہیں یا نہیں۔

ج۔ عہدہ داروں کی نگرانی

د۔ تمام نشانات کی جانچ پڑتال یعنی جس قدر نشانات بازی گاہ میں پیمائش کے بعد لگائے گئے ہیں وہ صحیح اور درست ہیں یا نہیں۔

اختتامی نگران کار۔ ان کو راہ نگرانکار بھی کہتے ہیں۔ نگران کار کے علاوہ اور مددگار ہوتے ہیں جن کی تعداد چھ یا چھ سے زائد ہوتی ہے۔ اُن کے اختیارات و فرائض دوڑ کی شرطوں تک ہی محدود ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ خط اختتام کی سیدھ میں دس میٹر کے فاصلہ پر کھڑے رہیں اور دوڑ میں اول دوم اور سوم آنے والوں کا تصفیہ کریں۔ بصورت اختلاف آپس کی کثرت رائے سے تصفیہ کریں۔ ان کا فیصلہ اٹل ہوگا۔

میدان نگران کار۔ نگران کار کے علاوہ مددگاروں کی تعداد تین یا تین سے زاید ہوتی ہے۔ ان کا تعلق اُن تمام شرطوں سے ہوتا ہے جن کا شمار دوڑ کی شرطوں میں نہیں ہوتا مثلاً۔ وزن اندازی چھلانگ، پھلانگ اور چوبی اُڑان وغیرہ وغیرہ نگران کار کا فرض ہے کہ وہ مقامات متعلقہ کی آرائش و ترتیب اور شرائط کے متعلق ضروری اشیاء کا اچھی طرح معائنہ کرے کہ آیا وہ تمام چیزیں حسب قواعد اسپورٹس مرتب اور مہیا کی گئی ہیں یا نہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی خیال رکھے کہ

تمام شرائط بخوبی اور اوقات مقررہ پر انجام پا رہے ہیں یا نہیں۔

مددگاروں کا فرض ہے کہ وہ ہر شریک ہونے والے کی جست کا فاصلہ اور بلندی ناپے اور اسی طرح دیگر متعلقہ شرائط کا بھی ریکارڈ رکھے۔ امور بالا کے متعلق اُن کا فاصلہ قطعی اور ناطق ہوگا۔

اسی طرح راہ نگران کار کے فرائض بھی وہی ہوں گے جو اختتامی نگران کار کے ہیں۔

ناظر:۔ ان کا فرض ہے کہ صدر نگران کار کے نشان دادہ مقام سے دوڑ میں حصہ لینے والوں کی کافی نگرانی اثنار دوڑ میں کریں۔ اگر شرکا میں سے کسی سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی ہو جو قواعد کے خلاف ہے تو اس کی اطلاع صدر نگران کار کو دیں۔ اُن کو کسی قسم کے فیصلہ کا اختیار نہیں۔ ان کی تعداد کم از کم چار ہوتی ہے۔

گھڑیالی:۔ ہر دوڑ کی شرط کے لئے تین گھڑیالیوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کا فرض ہے کہ ہر دوڑ کا وقت رکھیں۔

الف۔ ایسی صورت میں جب کہ دو گھڑیاں متفق الوقت ہوں اور تیسری گھڑی اُن سے مطابقت نہ کرے تو پہلی دو گھڑیوں کا وقت مستند تسلیم کیا جائے۔

ب۔ اگر تینوں گھڑیاں مختلف الوقت ہوں تو درمیانی وقت مستند ہو گا۔

ج۔ اگر ایک گھڑی رُک جائے اور دو گھڑیوں میں اختلاف ہو تو طویل وقت لیا جائے گا۔

اُن کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ شرط کا آغاز پستول کی آواز پر کریں۔

چال نگران کار:۔ ان کو اختیارات کلّی حاصل ہیں کہ شرکا شرط کی رفتار کے متعلق تصفیہ کریں بصورت قواعد شکنی پہلی مرتبہ خاطی کو تنبیہ کریں اگر دوسری بار بھی کوئی بات خلاف قواعد پائی جائے تو اُس کو اس شرط سے خارج کر دیں۔ آخری چار سو میٹر (۴۰۰ گز) کے فاصلہ میں اگر کسی شریک شرط سے کوئی بات خلاف قواعد (خواہ وہ پہلی مرتبہ کیوں نہ ہو) عمل میں آئی ہے تو اُسے فوراً شرط سے خارج کر دیا جا سکتا ہے۔ اُن کا فیصلہ اٹل ہوگا۔

رہبر:۔ اس کا کام ہے کہ وہ تمام شرکا کی اسم داری فہرست اپنے پاس رکھے اور اُن سب کو تاکید کر دے کہ ہر دوڑ کے آغاز سے (۵) منٹ قبل خط آغاز پر پہونچ جایا کریں۔ اس کا یہ بھی کام ہے کہ وہ شرکا کو اُن کے نشان یا نمبر کے مطابق کھڑا کرے۔

وقائع نگار:۔ اس کا فرض ہے کہ شرکا کی کامیابی کے سلسلہ نشانات کو با تفصیل مع فاصلہ، بلندی، اور وقت کے درج رجسٹر کیا کرے۔ حسب ضرورت مددگار بھی رکھ سکتا ہے۔

مجیسٹر:۔ تمام شرائط متعلقہ دوڑ اور ٹیم دوڑ کا آغاز اسی شخص کے تفویض ہوتا ہے۔ ہر دوڑ کے

آغاز سے قبل تمام شرکا، بالکلیہ اسی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ اس کا فرض ہے کہ اختتامی نگران کار
کی اطلاع پر تمام متعلقہ شرکاء کو اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہو جانے کے لئے کہے اور اُن سے
متعلق باتیں اُنھیں بخوبی سمجھا دے۔ آغاز شرط کے الفاظ ذیل استعمال کرے "On your mark"
جس کے یہ معنی ہیں کہ اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہو جاؤ، تھوڑے وقفہ کے بعد "Ready"
کہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ دوڑ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور اس کے دو سکنڈ بعد پستول چلائے۔

آغاز کے متعلق جملہ امور کے تصفیہ کا حق اُسی کو حاصل ہے اس کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

پیمائش کنندہ:۔ اس شخص کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ آغاز سے قبل تمام نشانات کی تنقیح کرے
اور اُن کے صحت اور عدم صحت کی اطلاع مجلس انتظامی یا صدر نگران کار کو دے۔

مُعلن:۔ اس کا کام ہے کہ شرط کے ختم ہوتے ہی اول، دوم، سوم آنے والوں کے نام اور شروع
ہونے والی شرط کا اعلان کرے۔ اس کی آواز پختہ، صاف اور بلند ہونی چاہئے۔

ڈاکٹر:۔ اس کا یہ کام ہے کہ ایسی چند ضروری ادویہ اپنے ہمراہ لے آئے جن کی ایسے مقامات
پر ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اثنائے دوڑ یا شرط میں کسی کے چوٹ آجائے یا کوئی ناگوار حادثہ پیش
آجائے تو فوراً اس کا علاج کرے تاکہ کوئی نقصان دہ بات پیدا نہ ہو جائے۔

نامہ نگار:۔ اس کا کام ہے کہ تمام شرکار کے نام اور کامیابی کے نتائج عہدہ داران متعلقہ
سے بالتفصیل حاصل کر کے محفوظ رکھے اور مطبع کو جلسہ کی جملہ کاروائیوں سے پوری طرح
باخبر رکھے۔

منتظم بازی گاہ:۔ منتظم کی خدمت گویا پولیس کی خدمت ہوتی ہے اس کا کام ہے کہ اپنے
مددگاروں کے ذریعہ بجز عہدہ داران اسپورٹس اور شرکار کے کسی کو احاطۂ بازی گاہ میں
داخل نہ ہونے دے اور اس کا بھی خیال رکھے کہ تماشائیوں میں کسی قسم کی بدنظمی پیدا نہ ہونے پائے۔

عبداللہ بن محمد
متعلم کالج آف فزیکل ایجوکیشن (حیدرآباد)

چند دلچسپ شرطیں

رسّا کشی

زمانہ قدیم سے انسان اپنی قوت کا مظاہرہ رسّے کے توسط سے کئی کاموں میں کرتا رہا ہے۔ آج کل رسّا کشی منجملہ اور تفریحی کرتب کے ہے۔

قواعد ہر ایک جماعت میں رسا کشوں کی تعداد مساوی لازمی ہے۔ رسّے کا قطر کم ازکم چار انچ ہو اور اُس کی لمبائی اس قدر ہو کہ دونوں جماعتوں کے درمیان ۲۴ فٹ اور دونوں سروں پر بارہ بارہ فٹ اور ہر دو رسّا کشوں کے درمیان ۴ فٹ کا فاصلہ ہو۔ مثلاً ۸ رسّا کشوں کے جماعت کے لئے کم ازکم ۱۰۴ فٹ لمبے رسّے کی ضرورت ہے۔ رسّے کے درمیانی نقطہ سے ہر دو جانب ۶ فٹ کے فاصلہ پر فیتہ باندھا جائے اور زمین پر بھی اسی طرح نشان لگائیں۔ اور رسّا کشی کے شروع سے پیشتر یہ تینوں نشانات رسّے کے فیتوں سے مطابق ہوں۔ رسّا کشی کی کامیابی ۱۲ فٹ کی کھینچائی یا پہلے آدمی کے پیر کا کوئی حصہ زمین کے درمیانی خط کو مس کرنے یا عبور کرنے پر تصور کی جاتی ہے۔ اور جو جماعت اس سے کم فاصلہ کھینچے تو کامیاب نہیں تصور کی جاتی بلکہ ایسی صورت میں دوبارہ رسا کھینچنا پڑتا ہے۔

رساکش دستانے یا اور کوئی ایسی چیز جو اُس کے گرفت میں مدد دے استعمال نہیں کرسکتا۔ رساکش سوائے اپنے قدموں کے اور کوئی حصہ اپنے جسم کا عمداً دوران رساکشی زمین سے نہیں لگاسکتا۔ اُس کی خلاف ورزی کرنے والے کو نگران کار رسّا کشی سے علیحدہ کردیتا ہے۔ رساکش اپنے جوتوں کے تلوں اور ایڑیوں میں کسی قسم کی اُبھری ہوئی چیز نہیں لگاسکتا۔ اور نہ اپنے لئے زمین میں رساکشی کے ابتدا سے پہلے کوئی سوراخ بناسکتا ہے۔ لنگر انداز رسے کے ایک حصہ کو دوسرے پر نہیں ڈال سکتا۔

طریقہ رساکشی اس سے پہلے کہ طریقہ عمل پر روشنی ڈالی جائے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ جس طرح ہاکی فٹ بال وغیرہ میں تمام افراد کا مجموعی کام کھیل کے حسن قبیح کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح رساکشی

میں بھی جو کچھ کام کیا جائے مجموعی طور سے ایک ساتھ ضروری ہے۔

رسے کی گرفت تجربہ کار رساکشوں نے صرف دو گرفتوں پر زور دیا ہے۔ پہلا طریقہ تین گرفتوں کا مجموعہ ہے یعنے دونوں ہاتھ اور بغل کی گرفت۔ دوسرا طریقہ دونوں ہاتھوں کے گرفت کے علاوہ ہے گو کلائی اور کہنی کے درمیانی حصے کے نیچے لے کر کمر کے ساتھ دبا رکھیں۔ آخر الذکر گرفت بہتر نہیں تصور کی جاتی ہے مگر اس کے لئے بے حد مشق کی ضرورت ہے۔ ہر دو طریقوں میں رساکش کا تمام وزن رسے پر پڑنا ضروری ہے۔

پیر و جسم و سر کی وضع قدموں کو تقریباً ۶ انچ سے ۸ انچ تک ایک دوسرے سے دور رکھو۔ پیر گھٹنوں سے اور اوپر کا دھڑ کمر سے خمیدہ نہ ہو۔ جسم کا پورا وزن رسی پر ہو اور جب کھینچنے کا اشارہ ہو تو اس وقت سر کو پیچھے کی طرف لٹکا دو۔ اس وقت مجموعی طور رسے رسّا اور رساکش میں تقریباً ۴۵° کا زاویہ ہو اگر سر کمر اور گھٹنے مذکورہ بالا طریقہ سے نہ رکھے جائیں تو رساکش کا ایک حد تک رسے پر سے وزن کم ہو جائے گا۔

لنگر انداز کی وضع لنگر انداز رسے کا ایک حصہ اپنے کولھے پر سے لے اور بقیہ حصہ اسی کا بغل میں سے لے کر کندھے پر ڈالے۔ لنگر انداز کا تمام وزن کولھے کی جانب ہو۔

ہدایات جب کوئی جماعت دوسری جماعت کو کھینچ رہی ہو تو ہرگز بڑے بڑے قدم پیچھے کی جانب نہ ڈالے بلکہ چھوٹے چھوٹے قدم ہوں۔ بڑے قدم پیچھے لینے سے رساکش کے گرنے کا احتمال ہے۔ اس کا ضروری خیال رہے کہ دوران رساکشی رسے کی وضع مستقیم ہو بالفاظ دیگر رسے میں کجی نہ ہو۔ بعض اوقات رساکشوں کی جماعت ضابط (Break) یا چینج (Change) یا جھٹکے (Heave) دیتی ہے ان تمام چیزوں کے لئے جماعتی کام (Team work) کی ضرورت ہے۔ ان تینوں چیزوں کے لئے ضروری ہے کہ مخالف جماعت اس وقت کا انتظار کرے جب کہ دوسری جماعت اپنی گرفت اور وزن کو رسے پر سے ہٹاتی ہے۔ یعنی اس وقت مخالف جماعت اپنا مجموعی زور لگائے (زور صرف سر کے وزن کو رسے پر جھٹکے کے ساتھ ڈالنے سے پڑ سکتا ہے) تو ضروری ہے کہ دوسری جماعت ایک دو قدم کھینچ جائے۔ بہر حال رساکشی کے تمام گر کسی تفصیلی مضمون میں شائع کئے جائیں گے۔ مذکورہ بالا طریقہ ہر ایک رساکشی کے داؤ کے مدافعت کے لئے کافی و وافی ہے۔

پیہ دوڑ یہ دوڑ حقیقت میں ڈاک دوڑ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ جو بطور نمائش اور تفریح کے آج کل مروج ہے۔

ٹیپہ جماعت (Relay team) کم از کم چار دوڑنے والوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ دوڑ دو طرح سے دوڑی جاتی ہے۔ ایک میں ہر ایک دوڑنے والا مساوی فاصلہ مدوری راستہ پر دوڑتا ہے۔ دوسرے میں ہر ایک دوڑنے والا ایک خاص فاصلہ دوڑتا ہے جس کو متوسط "ٹیپہ دوڑ" کہتے ہیں۔ مثلاً ایک میل کی "ٹیپہ" دوڑ ہو تو اگر پہلا دوڑنے والا ۴۴۰ گز دوڑے تو دوسرا ۲۲۰ گز تیسرا ۸۸۰ گز اور چوتھا ۲۲۰ گز یہ چیز قابل غور ہے کہ ٹیپہ دوڑ مدوری راستہ پر دوڑی جاتی ہے۔

قواعد اس دوڑ میں جماعت کا ہر ایک دوڑنے والا دوسرے کو ایک لکڑی کا بیلن جس کی لمبائی ۱۱،۸۱ انچ اور وزن ۱۰،۷۶ اونس ہوتا ہے۔ ایک مستطیل احاطہ میں سے جس کی لمبائی ۲۰ میٹر (۶۵،۶۱ فٹ) ہوتی ہے دست بدست دیتا ہے۔ بیلن کا تبادلہ صرف اسی احاطہ کے اندر واقع ہونا ضروری ہے۔ اور کوئی طریقہ بجز مذکورہ بالا کے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

ترتیب دوندگان اس دوڑ میں دوڑنے والوں کی ترتیب دو طرح سے ماہر فن دینے کا مشورہ دیتے ہیں

(۱) دوڑ سست رفتار سے شروع کی جائے اور تیز رفتار پر ختم ہو۔

(۲) سب سے پہلے دوم درجے کے دوڑنے والے سے دوڑ شروع کرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد متوسط دوڑنے والے رکھے جاتے ہیں۔ اور آخر میں تیز رفتار کو رکھا جاتا ہے۔

بیلن کے سپردگی کا طریقہ ہر دوڑنے والا بیلن اپنے حسب دلخواہ دوسرے کے حوالے کرسکتا ہے مگر ایسا طریقہ جس میں کم وقت لگے اور دوڑنے میں تسلسل رہے ذیل کے طریقہ سے ہوسکتا ہے۔

پہلی دوڑ والے کو چاہئے کہ وہ بیلن بائیں[۱] ہاتھ میں رکھ کے دوڑے جب وہ دوسرے دوڑنے والے کے قریب آنے لگے تو موخرالذکر کو چاہئے کہ اپنا سیدھا ہاتھ پشت کی جانب ہتیلی کھلی رکھ کر دراز کرے اور اس طرح دوڑے کہ بیلن لانے والا اس کو بیلن مستطیلی احاطہ کے اختتام تک حوالہ کرسکے۔

بیلن لینے والے کا فریضہ ہے کہ وہ بیلن کو بہ حفاظت تمام لانے والے سے حاصل کرے کیوں کہ بیلن لانے والا تھکا ہوا ہوتا ہے۔ بیلن حاصل کرنے کے بعد یہ شخص اپنے سیدھے ہاتھ کا بیلن بائیں ہاتھ میں تقریباً ۵ گز کے اندر ہی منتقل کرے کیونکہ اس کو بھی وہی طریقہ عمل اختیار کرنا ہے جس طرح کہ پہلے بیلن لانے والے نے کیا۔

---

[۱] چونکہ دوڑنے والے کے بائیں جانب مدوری شکل ہوتی ہے یعنے جس شکل کے اطراف اُس کو دوڑنا پڑتا ہے اس لئے بائیں ہاتھ میں بیلن رکھ کر بلا کمی رفتار دوسرے کے ہاتھ میں بیلن دے سکتا ہے۔

شٹل پٹہ دوڑ :- اور پٹہ دوڑ میں صرف اس قدر فرق ہے کہ پٹہ دوڑ میں مدوری راستہ ہوتا ہے اور شٹل میں مستقیمی۔ ہر ایک دوڑنے والے کے لئے ایک راستہ مختص کر دیا جاتا ہے۔ جس کے باہر وہ نہیں ہو سکتا مثلاً ایک دوڑنے والا ایک مسافت طے کر کے دوسرے کو بیلن دیتا ہے یا صرف چھو دیتا ہے۔ جوں ہی دوسرا دوڑنے والا بیلن حاصل کرتا ہے وہ اپنے مختص راستہ پر دوڑ کر تیسرے کو بیلن پہونچاتا ہے۔ پھر اُسی طرح طریقہ عمل جاری رہتا ہے۔

میر اسد علی

گولا اندازی، قرص اندازی و نیزہ بازی

گولا اندازی :- گولا اندازی کی ابتدا اسکاٹ لینڈ سے ہوتی ہے۔ اسکاٹ لینڈ کی تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے گولا اندازی پتھر پھینکنے سے تعبیر کی جاتی تھی۔ گولے کی بناوٹ یہ ہے کہ پیتل کے خول میں شیش بھری ہو یا صاف لوہے کا بنا ہوا ہو۔ اس کا وزن ۸ - ۱۲ - ۱۶ پونڈ تک ہونا چاہیئے (۸) پونڈ کا گولا مڈل اسکول کے لئے، ۱۲ پونڈ کا ہائی اسکول اور (۱۶) پونڈ کا کالج کے لئے ہوتا ہے۔ گولا اندازی کے دائرے کا قطر ۷ فٹ کا ہوتا ہے۔ اس کا قدم روک ۴ فٹ لانبا ۴½ انچ چوڑا ۴ انچ اونچا ہوتا ہے۔ جو سفید رنگ کیا ہوا قوس کی شکل میں دائرہ کے محیط پر جس رُخ گولا پھینکا جاتا ہے نصب کر دیا جاتا ہے۔

ہر گولا انداز کو تین موقعے دئے جاتے ہیں اور چھ منتخب گولا انداز کو تین اور موقعے دیئے جاتے ہیں۔ گولا اندازی کے فاصلہ کا لحاظ کرتے ہوئے اول، دوم اور سوم قرار دیئے جاتے ہیں۔ گولا ہاتھ میں رہنے پر گولا انداز کے جسم کا کوئی حصہ خط یا بیرون محیط زمین کو نہ چھونا چاہیئے اگر گولا چھوٹ کر بیرون دائرہ گر جائے تو ناقص پھینک تصور کی جائے گی۔ پیمائش تختہ کے اندرونی کنارے سے گولے کے ابتدائی نشان تک جو گرنے سے بنتا ہے ہوگی۔ اس کے پھینکنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ سے گردن اور کندھے کے قریب سے پھینکا جائے گا۔

گولا انگلیوں کے درمیانی جوڑوں میں پکڑا جائے اور اُس ہاتھ سے نہ اُٹھایا جائے جس سے پھینکا جاتا ہے۔ گولا شمال کی جانب پھینکا جا رہا ہو تو گولا انداز کا رُخ مشرق کی سمت ہونا چاہیئے۔

یعنے جس سمت میں پھینکا جا رہا ہو۔ گولا انداز کو چاہیئے کہ وہ قدم روک کے مخالف سمت میں دائرہ کے محیط کے اندر کھڑا ہو بایاں پیر سامنے اور پیچھے ہلائے اور تمام جسم کا وزن دہنے پیر پر دے کر بایاں پیر ایک جھٹکے سے سامنے کی طرف لے جائے اور فوراً دائرہ کے اندر دہنے پیر سے پھاند کر دونوں پیر دائرے میں لے آئے جوں ہی پیر زمین کو مس کریں بائیں پنجے پر پھیرتے ہوئے گولے کو بازو کی قوت کے ذریعہ ڈھکیلا جائے۔ اور دہنا پیر قدم روک کے بازو اس طرح رکھے کہ گولا انداز کا رُخ مغرب کی سمت میں ہو۔

قرص اندازی: ۔ اس فن کی ابتدا یونان سے ہوئی ہے۔ یہ ۱۸۹۶ء میں امریکہ کے اسپورٹس میں شریک کیا گیا۔ اس کا وزن ۴ پونڈ ۶ء ۴ اونس ہوتا ہے اور دائرہ کا قطر ۸ فٹ ۲ ½ انچ ہوتا ہے۔

ہر قرص انداز کو تین موقعے اور چھ منتخب قرص اندازوں کو تین اور موقعے دئے جائیں گے۔ پھینک کے فاصلہ کا لحاظ کرتے ہوئے اول و دوم قرار دیے جائیں گے۔ اس کے قواعد بھی وہی ہیں جو گولا اندازی کے ہیں۔

قرص انگلیوں کے آخری جوڑوں میں اس طرح پکڑی جائے کہ انگوٹھا انگلیوں سے زاویہ قائمہ بنائے۔ قرص انداز کا رُخ قرص پھینکنے کی سمت ہو اور وہ قرص کو اوپر نیچے لے جائے اور گھٹنوں میں خم رکھ کے بایاں پیر آگے کی جانب بڑھا کر اسی پنجہ پر پھر جائے۔ جوں ہی دہنا پیر زمین سے مس کرے اسی پر پھیرتے ہوئے قرص ہاتھ سے چھوڑے اور پھر بائیں پیر کو زمین پر رکھتے ہی دہنا پیر آگے کی طرف بڑھائے۔ اس صورت میں قرص انداز کا رُخ جدھر قرص پھینکی جائے اُسی طرف ہو اور ہر پنجہ کی پھیرت ۱۸۰ درجہ کی ہو۔

نیزہ بازی: ۔ یہ فن بہت قدیم ہے ۱۹۰۶ء میں امریکہ کے اولمپین گیمس میں شامل کیا گیا۔ اس کی لمبائی ۵ و ۸ فٹ ہو۔ وزن ۶ء ۱ پونڈ اور گرفت ۳ء ۶ انچ۔ تختہ علامت کی لمبائی ۱۲ فٹ؛ چوڑائی ۲ ¾ انچ زمین سے ہو جو سطح رکھا جائے۔

ہر پھینک تختہ کے پیچھے سے ہوگی۔ نیزہ کی نوک قبل اس کے کہ نیزہ کا کوئی دوسرا حصہ زمین کو چھوئے نشان بنانا چاہیئے۔ نیزہ کی گرفت مضبوط نہ ہو۔ دوڑ ۵۰ سے ۶۰ فٹ تک ہوتی ہے۔ دوڑتے ہوئے۔ دہنے پیر سے جست کریں اور بایاں پیر دہنے پیر کے مقابل میں رکھیں۔ اور پھر دہنا پیر بڑھاتے ہوئے نیزہ کو پھینکے۔ نیزہ انداز کے جسم کا وزن پھینکنے سے پہلے دہنے پیر اور پھینکتے وقت بائیں پیر پر اور پھینکنے کے بعد دونوں پیر پر ہونا چاہیئے۔ ورنہ پھینک بے قاعدگی کی وجہ سے

زیادہ دور نہیں جائے گی۔ ہر ٹیبینک میں خواہ وہ گولا اندازی کی ہو یا قرص وینزہ کی پیروں کی پھرتی ازبس ضروری ہے۔

شریف حسن

شذرات
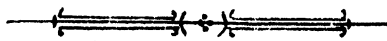
جلسہ تقسیم اسناد مدرسہ وسطانیہ لنگسگور خواجہ حسین صاحب معتمد انجمن اساتذہ مدرسہ مذکور اطلاع دیتے ہیں کہ بتاریخ ۲۳ ؍ اسفندار ۱۳۴۰ ف عالی جناب مولوی سید حسین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر مہتمم تعلیمات صوبہ گلبرگہ شریف نے مدرسہ کا معائنہ فرمایا۔ دوسرے دن بورڈنگ کے پر فضا میدان میں اعلیٰ اہتمام کے ساتھ جلسہ تقسیم انعامات منعقد ہوا۔ مقامی عہدہ دار، وکلا، معززین اور اولیائے طلبہ مدعو کئے گئے تھے۔ صدر مہتمم صاحب کی تشریف آوری پر طلبہ نے باقاعدہ سلامی دی۔ جلسہ کا آغاز قرأت سے ہوا اس کے بعد مولوی عبد الرحیم خاں صاحب بی۔ اے صدر مدرس نے تحریک صدارت پیش کی اور صدر مہتمم صاحب کے کرسی صدارت پر متمکن ہونے کے بعد صدر مدرس صاحب نے مدرسہ کی سالانہ مختصر و جامع رپورٹ سنائی جس میں مدرسہ کی ترقی کا ذکر فرماتے ہوئے قیام میٹرک کی ضرورت بتائی۔ اس کے بعد مولوی جمال احمد صاحب منصف نے ایک دلچسپ تقریر فرمائی۔ صدر جلسہ نے اپنے دست مبارک سے طلبائے مدرسہ کو انعامات تقسیم فرمائے۔ ختم تقسیم پر ممدوح نے ایک عالمانہ اور پرجوش تقریر کی اور مدرسہ کی ترقی پر اظہار خوشنودی فرماتے ہوئے، طلبہ کو راست بازی اور بلند حوصلگی کی نصیحت فرمائی جس کا طلبہ اور سامعین پر گہرا اثر پڑا۔ معزز صدر نے حضرت سلطان العلوم کی بوح سرائی فرماتے ہوئے کہا کہ دنیا کی کوئی گورنمنٹ ہماری ریاست کے برابر تعلیم پر روپیہ صرف نہیں کر رہی ہے۔ آپ نے پبلک کو گہری دلچسپی لینے کے لئے خاص توجہ دلائی۔ ختم تقریر پر جناب صدر مدرس صاحب نے صدر جلسہ اور معزز حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ جس کے بعد جلسہ نہایت ہی کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا۔

مدرسہ تحتانیہ مہاگاؤں مولوی محمد عبد الکریم صاحب صدر مدرس مدرسہ مہاگاؤں اطلاع دیتے ہیں کہ مدرسہ ہذا کا تعلیمی جلسہ بتاریخ ۱۶ اسفندار ۱۳۴۰ ف زیر صدارت مولوی سید معین الدین صاحب مہتمم تعلیمات ضلع گلبرگہ شریف منعقد ہوا۔ شرکا کی تعداد ایکہزار سے زیادہ تھی۔ تقریباً دو گھنٹے

مختلف عنوانوں پر تقریریں ہوئیں جس کے بعد صدر مدرسہ نے پور فنڈ کی تحریک پیش کی۔ صدر جلسہ نے انعامات تقسیم کئے اور رعایا کی ہمدردی کا ذکر مسرت کے ساتھ کرتے ہوئے برکات عثمانی کا ذکر کیا۔ اور شاہ جم جاہ کے عمر و اقبال کی دعا فرمائی۔ جلسہ کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا۔ شب میں طلبہ نے دو ڈرامے بھی کئے۔

مدرسہ تحتانیہ پٹن مدرسہ تحتانیہ پٹن تعلقہ و ضلع گلبرگہ شریف کا تعلیمی جلسہ زیر صدارت مولوی سید معین الدین صاحب مہتمم تعلیمات ضلع گلبرگہ شریف منعقد ہوا۔ تاریخ پٹن میں اس نوعیت کا یہ پہلا جلسہ ہے۔ مدرسہ تحتانیہ کرگنجی و ساولگی و مدرسہ بلکندہ کے اساتذہ صاحبان و طلبہ بھی شریک جلسہ تھے مدرسہ ہذا کے طلبہ اور دیگر مدارس کے طلبہ میں اسپورٹس ہوئے جس کے بعد صدر محترم نے اپنے دست مبارک سے انعامات تقسیم فرمائے۔

شب میں ۹ سے ۱۲ بجے تک طلبہ نے اُردو مکالمہ و دلچسپ ڈرامہ کیا ختم ڈرامہ پر مولوی سید امین الدین صاحب صدر مدرس نے رپورٹ مدرسہ سناتے ہوئے تعلیم کی ضرورت پر موثر تقریر فرمائی اس کے بعد صدر نشین صاحب نے تعلیم کے فوائد پر بلیغ تقریر کی جس کا اثر حاضرین پر اچھا پڑا۔

دنیا کے مشہور کتب خانے اور کتابوں کے اعداد

برٹش میوزیم لندن	۳۰	لاکھ سے اوپر کتابیں ہیں۔
کانگرس لائبریری واشنگٹن	۳۲ ½	” ” ”
نیشنل لائبریری پیرس	۴۰	” ” ”

جرمنی میں کتب خانوں کا نظام سب سے اچھا ہے پورے ملک میں کتب خانوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ۱۶۰۰ پبلک کتب خانے ہیں اور کتابوں کی تعداد ۳ کرور ہے۔ فرانس میں ۱۱۱ کتب خانے اور کتابیں دو کرور ہیں۔ برطانیہ کے حدود میں ۱۰۱ کتب خانے اور کل کتابیں ۱ کرور ۸۰ لاکھ ہیں۔

دنیا میں نئی کتابیں ہر سال تقریباً ۲ لاکھ ۸۳ ہزار کی تعداد میں چھپتی رہتی ہیں :-

نفسیات تعلیمی :- یہ کتاب محمد عثمان صاحب۔ بی۔ اے۔ ٹی۔ ڈی (لندن) کی تازہ تصنیف ہے۔ جو چودہ باب پر مشتمل ہے اخیر کا باب جدید العصری تحریکات اور ترقیوں کے لئے مختص کیا گیا ہے جس میں ذہنی پیمائش، قدیم اور جدید مقاصد امتحان اور نفس لاشعوری سے بحث کی گئی ہے۔

یوں تو خالص نفسیات اور نفسیات تعلیمی پر کئی کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ مگر تعلیمی نفسیات پر اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ فاضل مصنف نے مستند علمائے نفسیات کی تصانیف سے پوری طرح استفادہ کر کے جدید معلومات اور تحریکات کا اضافہ کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف لگاتار کوشش اور عرق ریزی کے بعد اس کتاب کو عام فہم اور سلیس زبان میں ملک کے سامنے پیش کر سکے۔

جن حضرات کو نفسیات یا نفسیات تعلیمی پر کسی کتاب کے ترجمہ کرنے کا موقع ملا ہو وہ محمد عثمان صاحب کی اَن تھک کوشش، عزم و استقلال کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ زیر تنقید کتاب مستند اور جامع ہونے کے علاوہ ملک کی شدید ضرورت کو پورا کر رہی ہے، جو نو پیشہ مدرسین اور مدرسین زیر ٹریننگ کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ اکثر مصنف کے وضع کردہ اصطلاحات سے ہمیں اختلاف ہے۔ مگر یہ کام اکیلے ایک شخص کے بس کا بھی نہ تھا۔ جس کا اعتراف تمہید میں خود مصنف نے کیا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ہے۔ قیمت فی جلد سے ر روپیہ سکہ عثمانیہ شائقین مصنف، یا مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ سے طلب فرمائیں۔

انگریزی افسانے ۔ دنیا کے شاہکار افسانوں کا سلسلہ زیر ادارت مولوی عبد القادر صاحب سروری ایم۔اے، ایل ایل۔بی شائع ہو رہا ہے ”انگریزی افسانے“ اس طویل سلسلہ کی تیسری کتاب ہے جو ملک کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ باقی حصے زیر طبع ہیں یا زیر ترجمہ۔

سروری صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ آپ کا شمار اُن افراد میں ہے، جو اردو کی خدمت گزاری میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

یورپ میں مختصر افسانہ نگاری کا بڑا رواج ہے۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ معاشی مصروفیتوں اور مشاغل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے قصے لکھنا علمی ذوق کے برقرار رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں سب سے زیادہ اس کا رواج ہے اردو ادب میں اس قسم کے افسانوں کی سخت کمی تھی، جسے پورا کرنے کا بیڑہ سروری صاحب نے اُٹھایا ہے۔

زیر تنقید کتاب انگلستان کے مشہور اور چوٹی کے انشا پردازوں کے مختصر افسانوں پر مشتمل ہے۔ قصوں کے انتخاب پر نظر ڈالنے سے ذوق سلیم کا پتا چلتا ہے۔ اکثر قصے دلچسپ، سنسنی خیز اور سبق آموز ہیں۔ مگر کاتب صاحب کی عنایت سے اس قدر غلطیاں موجود ہیں کہ سارا لطف کرکرا ہو گیا۔

لکھائی چھپائی متوسط اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

کے ڈی عبدالغفور اینڈ سنس

حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں بہترین سامان اسپورٹس اور ورزش کی سب سے قدیم اور مشہور دوکان جس میں ٹینس، بیڈمنٹن، فٹ بال، ہاکی، پولو، گولف، اور انڈور گیمس پنگ پانگ، فنگر بلیرڈ، بورڈ جمناسٹک اور ورزش کے پیرلیل بار، ہاری زنٹل بار، والٹنگ ہارس، ہیرز کے سامان مثلاً رسٹ گریپ، چسٹ اکسپانڈر، ڈمبلس وغیرہ وغیرہ کا

تازہ اسٹاک

کثیر تعداد میں موجود ہے جو دوسروں کے مقابلے میں نہایت ارزاں اور مضبوط ہونے کی حیثیت سے گیارنٹی پر مل سکتا ہے، خاص کر ٹینس، بیڈمنٹن، بیٹ کی ریگٹنگ نہایت خوش اسلوبی سے کی جاتی ہے۔ مکمل تفصیل کے لئے فہرست کارخانہ طلب فرمائیے۔

کے ڈی عبدالغفور اینڈ سنس جمس اسٹریٹ

سکندرآباد

شاخ
متصل سینٹ جارجز گرامر اسکول حیدرآباد دکن

انجمن امداد باہمی

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

امداد باہمی (Cooperateon) کے اصول پر دکن میں

اُردو مطبوعات کا پہلا وسیع اور قابل اعتماد

ہر حصہ (۱۰۰) حالی جو بیس ماہ میں فی قسط ۵ کے حساب سے ادا شدنی ہے منافع بعد ادائی زکوٰۃ دس فیصدی تقسیم ہو رہا ہے

تھوڑے حصے باقی رہ گئے ہیں

خریدار جلدی کریں

۱۔ **فروخت کتب** ۔ اردو زبان کی تمام کتابیں ملسکتی ہیں کمیشن پر فروخت کی جاتی ہیں۔
۲۔ **مطبع** ۔ بہترین ماہر فن لیتھوگرافر کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ ہر قسم کی طباعت بہترین۔
۳۔ **دارالاشاعت** ۔ مولفین کی بیس سے زیادہ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

day problems, that of Correct Posture, in the schools of Hyderabad State and yet, to a very great extent on the successful solving of which depends the health and well-being of our school-going youth, the future citizens of our premier State. A short article on "Posture" precedes several sets of rhymes, "An Ode to Posture" by L. Drew, "Posture Precepts" and "Posture Exercises" by the technical editor. The latter is intended to serve the practical purpose of getting teachers and students started doing Posture exercises. Following this is a Posture Development Chart which should prove useful in showing the various effects of each of these exercises.

In closing this page, our sincere gratitude is here expressed to all who have, kindly and ably, contributed in any way to bring this issue to light.

F. Weber.

of Play and games in their various educational aspects, I asked these students to write on some self-chosen aspect of this great field of educational influence. It may be acknowledged here that these students were permitted to incorporate ideas and materials from outside sources. Some of them have very freely availed themselves of this allowed freedom, but occasionally without quoting their authorities. However, I am allowing these articles to go into this issue as they are, because I am satisfied that the matter as here presented will prove of immense practical value to our teachers of Hyderabad State, who would, otherwise, not have been brought into contact with these borrowed ideas and materials at all.

The Table of Contagious Diseases common in School Children in India presented by Dr. Hai, L. M. & S., a member of the College teaching staff, will it is expected, be of definite practical value to the class-room teacher in detecting such diseases as are shown in the table with their accompanying symptoms and serve to guide the teacher in his action towards having the affected child properly isolated and cared for and in adequately protecting the rest of the children in his class-room and school. It is suggested that this table should be hung up in the class-room or some other conspicuous place in the school and to be consulted by the teachers as a ready reference.

An article entitled, "A Brief History of Physical Education" is in outline form and is contributed by Mr. Kishandas J. Kadve, B. A., a member of the present Senior student group in the Government College of Physical Education. The technical editor of the present issue has contributed two articles, the leading article is an effort at showing first, what should be the guiding posts along the educational road and second, that Physical Education is true education—a method of education—and does not consist merely in the movement of muscles and end there. His second article deals with one of the most neglected present-

the Company of the second brother of H. E. H. the Nizam, very kindly served as the Editor of the Urdu Section.

Eight of the articles in the Urdu Section were contributed by the same number of students of the Government College of Physical Education. Five of these articles treat of various phases of Track and Field Sports, one of Tug of War, one of the Philosophy of Play, and one of the Aims of Physical Education. In addition to these eight articles, two others are contributed by as many students while undergoing the course of training in the National Y. M. C. A. School of Physical Education at Madras. Mr. Hadi has contributed a Foreword and an article on "The Growth of the Body." Notes and Reviews appear as usual from the Editorial Staff. The articles and their authors are listed below as follows :—

Foreword	(By Mr. S. M. Hadi, M. A., Director of Boy Scouts and Physical Education in Schools.
The growth of the Body	(By do do)
How to run Sprint races and Hurdle races	(By Mr. Sanaullah Khan, F. A.)
Long Jump, High Jump and Pole Vault.	(By Mr. Yousufuddin Ahmed B. A.)
Shot Putt, Discuss Throw, Javelin Throw.	(By Mr. Shareef Hussain, F. A.)
The Duties of Track and Field Officials	(By Mr. Abdulla Bin Mohammad, B. A.)
How to Organise a Track and Field Sports Meeting	(By Mr. Amjad Ali Khan, F. A.)
Coaching a Tug of War Team	(By Mr Mir Asad Ali, B. A.)
Physical Education and Its Aims.	(By Mr. Abdul Kader, B. A., B. T.)
Philosophy of Play.	(By Mr. Mirza Yousuf Ali Baig, F. A.)
The Need of Physical Education for Girls	By Mr. Syed Mohammad Raza. B. A.)
The Exercises of the Body	(By Mr. Mirza Yousuf Ali Baig, F. A.)

Of the articles in the English section, six were contributed by former students of ours who were members of one of our voluntary classes in Physical Education. As they were, at the time these articles were written, studying the subject

Editorials.

The idea of a complete Physical Education number of the "Hyderabad Teacher" originated in the mind of Mr. Ali Akbar, the resourceful Editor-in-Chief of this Journal. If putting this idea into actuality merits any credit, he richly deserves it. For whatever faults the issue may contain, however, we are to be held responsible. We wish to record our appreciation to the Editor for this opportunity of utilising a full number for Physical Education.

It is most regretted on our part that the number comes off the press so late. But this is due to a combination of circumstances, not the least of which is that of the Editor-in-Chief being called upon to accompany H. E. H. the Nizam's brother on a tour of Europe just at the time when he would have been taking the articles for this issue in hand as the logical intermediary link between ourselves and the printing establishment. In the absence of the Editor-in-Chief the work of seeing the issue through the press fell to the hands of the Associate Editor, Mr. Philip. But he, too, left the country for a period of several months The work then devolved on Mr Syed Zahur Ali, acting Editor-in-Chief in view of the absence from India of both the permanent Editors of the Journal. Fortunately for us that such an able and experienced person as Mr. Syed Zahur Ali appeared to fill the double breach, for inspite of his numerous and time-absorbing duties in the capacity of Acting Chief Inspector of Schools he has proved to be an invaluable aid in the form and composition of the articles as well as a directing force.

Both sections, *i. e.* the English and the Urdu, of the present number consist entirely of articles on Physical Education. Mr. S. M. Hadi, before leaving for Europe in

Posture Development Chart.

Name of Exercise.	Muscular Effects.	Bodily Effects.	Organic Effects.
Position.	Develops muscles of shoulders, upper back, chest.	Corrects round and uneven shoulder and chest.	Improves air and blood circulation by aiding heart and lung action.
Organs.	Strengthens muscles of abdomen and lower back.	Reduces fat of abdomen.	Vitalises abdomenal organs. Relieves dyspepsia and constipation.
Sides.	Strengthens muscles of side of trunk.	Reduces fat of trunk, especially of sides.	Corrects torpid liver. Relieves billiousness.
Thorax.	Develops muscles of thorax and diaphragm.	Gives elasticity and depth to chest.	Relieves chest pressure on heart and lungs.
Upright.	Strengthens muscles of foot arch, calf, thigh, trunk.	Improves carriage through development of erecter muscles of the trunk.	Gives much needed freedom to all vital organs for proper functioning.
Respiration.	Increases muscular co-ordination.	Tones up the whole body.	Increases lung capacity and stimulates blood circulation.
Elongation.	Develops stretching quality in the muscles of trunk.	Develops bodily litheness.	Salubrious effect on spine and nervous system.

(By F. W.)

The School Teacher's share in the Prevention of the spread of some of the Diseases common in Schools.

By **M. A. HAI, L. M. & S.,** *Lecturer, Govt. College of Physical Education.*

The school is a source for the spread of infection, not only among the school children but also among the members of their families. As medical aid is not always available it is essential that the teachers should be acquainted with the main outlines of the more important diseases common in schools. This knowledge will not only help the children affected to be taken care of immediately, but will also help the authorities concerned (health officer if any) to take the necessary steps to protect other children and their families. Teachers should immediately notify the health officer of any infection as below; otherwise isolate the child from other children to prevent its spread and bring due notice of the affected children to their parents.

No.	Name of Disease.	Early symptoms.	Order of appearance of Rash or Eruption.	Character of Rash or Eruption.	Period of isolation of the infected child.	Period of isolation of children of same house.
1.	Small pox	Sudden onset of fever, shivering frontal headache, pains in the back, vomiting & temperature.	Red papules which are like small round shots to the touch.	Back of the wrist then on the trunk, arms & lastly on the legs.	For 4 weeks. after appearance of disease.	Two weeks.
2.	Chicken pox	Slight fever, general malaise & furred tongue.	Consist of rosy spots which soon grow & fill with a turbid fluid.	First on neck & chest then quickly spreads all over.	Until scales completely fall off.	Two weeks.
3.	Measles	Smart fever, sneezing, running at the nose, watering and redness of the eyes and cough.	Faintly raised, dark-red pimples; coalescing into patches and give a velvety feeling to touch.	First at the root of hair, on face, next on neck, trunk and limbs.	Four weeks from the onset.	Three weeks.
4.	Scarlet fever	High fever, soreness of the throat, Vomiting, pains in the back, limbs and headache.	Appears like uniform scarlet blush, but consists of small red spots.	No definite appearance, but the skin round mouth escapes.	Six weeks.	Four weeks.
5.	Diptheria	General malaise, slight fever, stiffness of the neck, swelling of glands at the angle of the jaw.	No rash but formation of a white membrane in the throat and on the uvula.		For at least 3 weeks after the throat has cleared.	Two weeks.
6.	Mumps	Pain below one ear, soreness of of neck & jaw. Fever and finally a swelling appears below ear and spreads round neck.	No rash but swelling of the glands round the neck.	Swelling starting on one side and of the neck and finally extends from one end to another.	Three weeks.	Three weeks. only those who have not had the disease.
	Whooping cough	To begin with it resembles ordinary cough, but after about 7 to 10 days a series of short coughs or expiratory puffs with no intervening inspiration followed by a deep crowing inspiration—the whoop.			6 weeks. or in some cases as long as the cough persists.	Two weeks. only for those who have had not the disease.

Posture Exercises.

7 LETTERS SPELL OUT POSTURE,
EXERCISES EACH DAY.
MINUTES APPLICATION,
WILL DRIVE THAT SLOUCH AWAY.

Name of Exercise.	The Exercise.	Time.	Pinagrams.
P-OSITION.	Arms straight sideward, palms up On level with your head, Make hands circle twelve inches, Ten back then ten ahead.	1 min.	
O-RGANS.	Place hands on back of neck With fingers end to end, Press head and elbows back Trunk forward downward bend.	1 ,,	
S-IDES.	Left arm straight up, right down Bend trunk well to right side; Change the arms positions, And bend trunk to left side.	1 ,,	
T-HORAX.	Arms fling straight out sideward, Then thumbs upon your chest; Arms again as line one Only with greater zest.	1 ,,	
U-PRIGHT.	Arms straight front, rise on toes And bend knees front and deep; Straighten knees and body And steady balance keep.	1 ,,	
R-ESPIRATION.	Arms front, inhale through nose, Arms sides, and still inhale, Arms overhead, breathe lungs full; Arms down and now exhale.	1 ,,	
E-LONGATION.	Lock fingers high overhead, Stretch to full height, after Nearly touching the sky. Bend slowly left then right.	1 ,,	
		Total 7 minutes.	

(By F.W.)

Posture Precepts.

PREAMBLE.

Look! Posture precepts have
Their place with girls and boys;
And to obey them strict
Adds on to life new joys.

ONE

" Head up chin in give one "
Form dignity and grace;
And just as important,
A bright and happy face.

TWO

" Chest high, abdomen flat,"
The organs keep in place,
Increase lung pow'r too,
To keep one in the race.

THREE

" The shoulders back and down "
Relations right in bone;
Enhance one's app'arance
And give muscular tone.

FOUR

" The back straight and toes front, "
Increase the strength of spine;
And buoyancy of stride,
To keep one up in line.

FIVE

" Stand tall "—the last of all
To wind up the whole show;
It makes your form erect,
And gives to life more " go."

(By F.W.)

Ode to Posture.

Good Posture is an asset
Which very few possess ;
Sad to relate, the favoured ones
Seem to be growing less.

We see the folks around us
All slumped down in a heap,
And the way that people navigate
Is enough to make you weep.

Some elevate their shoulders,
Some hollow in their back,
Some stiffen up their muscles,
And some just plain relax.

The one who walks with grace and poise
Is a spectacle so rare,
That anywhere such one is seen
The people turn and stare.

If you would cut a figure
In business, sport or school,
Just mind the Posture precepts,
Obey the Posture rule.

Don't thrust your head out turtlewise ;
Don't hunch your shoulders so ;
Don't sag, and drag yourself around ;
No style to that, you know.

Get uplift in your bearing,
And strength and spring and vim ;
No matter what your worries
To slouch won't alter them.

Just square your shoulders to the world,
You are not the sort to quit,
" It isn't the load that breaks us down,
It's the way we carry it."

(By L.D.)

habits largely brought about through ignorance of the harm that is being done to one's health and, in the case of school rooms in particular, to the ignorance on the part of the teacher as to the nature and extent of the harmful habits being established by his pupils. It is also true that most chairs and seats in schools, homes and public places are faulty and ill adapted to the human form. Chairs should be low enough to allow the feet to rest easily on the floor or ground, shallow enough so that the base of the spine may be held firmly against the back of the chair, and so constructed as to give a slightly rounded support to fit the normal, slight hollow in the lower portion of the back.

Rigidity of muscles and body stiffness must be entirely got rid of. When standing and walking, besides keeping the feet in a parallel position to each other, the abdomen should be held somewhat inward through the control of the abdominal muscles, the shoulders should be back and down and the head balanced or poised without strain. The fulfilment of these conditions should result in an erect, easy posture. Such a posture allows the chest to expand in a normal, healthful manner; it minimises muscular effort and strain on the back; and eliminates that devastating condition so commonly observed of the relaxed or distended abdomen which is so very often associated with serious nervous maladies. Besides, the condition of constipation—that bugbear of older students and teachers—will be found to be considerably less troublesome if not entirely eradicated.

These few suggestions outline the principle requirements of proper posture. Such posture promotes deep respiration, improves blood circulation, diminishes fatigue, and very materially results in the improvement of health. Such posture also adds poise and grace as well, as it emphasises the beauty of the human body and without the shadow of a doubt, acts most favourably upon the mind of the individual.

Stand straight, sit straight, and keep the toes straight to the front.

considerable time. Our other animal friends, especially the heavy ones, stand and move on all fours and waive formalities to lie down and rest when tired wherever they are. The erect posture is at its best fatiguing; at its worst, it becomes not only fatiguing but, as we have stated above, conducive to serious nervous maladies and other forms of ill health.

Posture involves the position of the feet, of the trunk and of the head—the feet particularly in standing and walking; the trunk and head in sitting.

In spite of tradition and military practice the world over, the toes, as has been ably shown by some of the leading biologists and physiologists and accepted by progressive medical science and Physical Education, should *not* be turned outward, either in standing or in walking. But on the contrary, the feet should be parallel to each other, the heels separated from each other as widely as the toes, whether the feet are close together or wide apart. The parallel position of the feet, as here described, has become the accepted foundation of correct posture with the advanced thinkers of Physical Education everywhere. Another point of considerable significance is that the weight of the body should be borne on the outer sides of the feet. The outer is the stronger side of the foot, the inner which perforce must bear the major portion of the body weight when the wide apart toe position (the 'soldier' position), is taken is the weak side of the foot. This fact is conclusively proven; and where this latter position has been long practised among school boys in numerous cases serious defects to the feet and to the health have been the results.

In sitting, an adult as well as a child should sit on the back of the thighs and on the bones of the pelvis which are intended to support the weight of the body. The slumping and slipping down which characterise so many people, especially children in school rooms who are kept for long periods in the sitting position, are the result of careless

must come from the children if their play is to be really natural. When there is too much of direction the essential character of the activity may be changed for the children, and what in form is play may become work. When this happens, the value of both work and play is diminished. The very fact that the supervisor or teacher is an adult, and that the players are children, makes educative supervision very difficult. Adults must efface themselves more, they must play the role of observers more effectively, the doctrine of "hands off, must be applied more often in dealing with children both in their work and in their play if they are to reap the full benefit of their activity.

POSTURE

BY

F. WEBER, M. A., B. P. E.,

Director of Physical Education for Colleges for H. E. H. the Nizam's Dominions.

POSTURE AND ITS RELATION TO HEALTH.

Rounded shoulders and a relaxed abdomen are often associated with serious nervous maladies. Prolapse or 'falling' of the stomach, abdominal organs, or pelvic organs, and constipation also accompany faulty posture. The normal relations of the organs are disturbed and the proper circulation of the blood is prevented by faulty habits of walking, standing and sitting.

The importance of a correct posture in developing and maintaining health is so obvious that it should be unnecessary to emphasise the fact. But unfortunately it is forgotten or disregarded to an alarming extent.

Man is the only animal that is called upon to stand and walk upright and to habitually sit still for periods of

factors must be provided if we are to make full use of all that nature has supplied to us.

Supervision : Wise and Unwise :—

Supervision and direction of play offer another opportunity, although of a different character. Not only must there be nothing to inhibit the development of an inborn tendency, but often such a tendency needs stimulating. The wise guidance and suggestion of an adult will often furnish opportunities which the children, if left to themselves, would never have discovered. Such supervision will also conserve the nature of individual children, in some cases protecting them from themselves, in others encouraging them to fresh endeavours. The social, moral, and intellectual elements are more likely to be stressed and encouraged if there is supervision than otherwise. The children are not allowed to play on a lower level of development when they are ready for a higher. Wise supervision does not force but only suggests and encourages.

Valuable as supervision is, not all play should be supervised. Complete freedom is handicapped by the presence of an adult. When play is supervised there are some serious dangers which must be avoided if it is to be a truly educational factor. All these dangers grow out of the fact that adults do not in the first place fully understand the nature and value of play, or in the second place do not study closely enough the stage of development of the children they are supervising. It is often the case that the supervisior introduces plays for which the children are not ready, or sometimes pushes the complex, organised games before the children are ready for them. Simple games, without many rules, quickly played and easily changed, must come first. Perhaps the greatest danger of all in supervised play is that the initiative comes from the adult instead of from the child. When this is true, even though children seek the direction and guidance, one of the greatest values of play is gone. The initiative, the motive force

so much in the corporation of new elements as in the charge of emphasis on those already present.

The educational value of the free play of children increases as these changes take place. In their play children learn to observe quickly, to judge, to weigh values, to pick out essentials, to give close attention; they learn the value of cooperation, to recognise the rights of others as well as insist on their own being recognized; they learn the meaning of freedom through Law; they learn the value and function of work and the joy of accomplishment. A child who does not play not only misses much of the joy of childhood, but he can never be a fully developed adult. He will lack in many of the most worth while qualities because many of the avenues of growth were unused and neglected during the most plastic period of his life.

DIRECTED PLAY :— Provision of Space.—

It is because today educators are more alive than ever to the need of play that movements for playgrounds in the cities and for supervised play everywhere are so widespread. Games that are largely physical need space, as also those which involve numbers, which necessitate group work and team work. Owing to lack of place for such games, the characters and mental alertness of children suffer. The opportunities for the development of honesty, of generosity, of cooperation, of sacrificing individual pleasure for the good of the majority are lessened. These and many more of the characteristics most worth while in adults are poorly developed simply because the children did not get a place to play. Opportunities in the way of playgrounds, more or less well equipped, are absolutely necessary for the rich development of childhood. It is also equally important that youth should learn the proper use of the school buildings, club rooms, etc. Play does not cease with childhood though the character of it changes. Opportunities for the development in the playful spirit of the higher intellectual and emotional

reinforced by wider information, shown in guessing games, wider reading, and the interest in language. Abilities are developed by rivalry in ball play, swimming, construction work, jumping the rope, doll-dressmaking, the use of words and the like, while there is an added love of more passive movements, such as swinging. The rise of the gang spirit, inciting to greater possibilities of adventure, is one of the most important tendencies of this pubescent age. *In the Teens,* doll play, chasing, imitative and make-belive games decline, whereas rivalry, team-work, games of chance, rythmic movements, athletics of all sorts are in favour. This is the time of highly organized activity and of the elimination of many earlier forms of imaginative play. *Adolescent* boys are fonder of running games than girls, specialize in fewer games, organize better, play intellectual games, and indulge in games of chance less.

This description is clearly inadequate as an analysis of the tendencies which show themselves in the playful activities of any period. This inadequacy is unavoidable from the very nature of the case. The fact that the tendencies themslves are complex, that they do not act independently, that the action of each one affects all the others that they vary as the elements and conditions in the situations vary, and that the environment affects so materially the action of all tendencies,—all these conditions make a clear-cut, simple analysis of the games of various ages impossible.

All that a student of children can do is to point out the general line of progress of activities that are playful due to the gradual development of the innate tendencies from those that are primarily sensory, physical, individual, purposeless, and unorganized, to those that are primarily intellectual or emotional, and social, and in which purpose and organization play a much greater part. The change from one level to another is a very gradual one, and the difference is not

larger role. The instinctive basis of the games of children under five is very evident, but that is not true of the older children. The form that the activities take and the particular kinds of play or games used, depend on the particular environment. Tradition and custom determine the games of a locality. The elements due to original nature are only with difficulty discernible in the mass of elements that have been added through imitation. And yet it is interesting to note that the games of children of about the same age, in widely different parts of the world, are alike in the essential characteristics due to the part played by original nature. Another change which takes place is the complexity of the activity. The early games are comparatively simple, but as the child grows older, and the number of inborn tendencies increases, overlaps, and merges, the games are correspondingly complex. This change results in greater organizations, and they become *Organised Games*, with rules which must be observed and carried out by the participants. The increasing complexity and organization of the games necissitate the introduction of elements of work within the activity as means to an end.

Roughly, the kinds of play enjoyed at different ages are as follows:— *During Infancy.* sensory and perceptual play predominates, with the developing tendencies to general physical activity, locomotion, manipulation, and vocalization. The responses are crude and, at first, seem almost the the result of random movements. *Before Seven*, children engage in play rather than play games proper ; it is pre-eminently the toy stage, with imagination and imitation as new developing factors. *From Seven to Ten* play is decreasingly solitary. increasingly competitive, involving much physical exercise such as running, jumping, throwing, hitting, climbing, also quieter manipulation, more sustained group dramatization, collection and hoarding. *From Ten to Thirteen* the greatest variety of games is played ; for to the tendencies already functioning, is added a more general mental activity

In our estimate of play we have been prone to think of the earliest manifestations of it in the field of physical activity principally, and thereby have neglected the more important features. Again, the error has been committed of taking the first immature manifestations to be earnest for all. Think how much of time and energy a ten-year-old boy spends on his play: how his resources of ingenuity, imitation, tact, judgement, perseverance, are all taxed. And think too of the results he gets; the ends he attains!

If the field of adult activity be examined, we shall see that most of the results worth while to the world, whether in the field of industry, invention, science, art, music, philosophy, or social administration have been reached by persons working in the play spirit. Great results can never be obtained when the individual with divided attention, with the initiative coming from another, is striving primarly for the remote ends of an activity. Far reaching results are possible only when the activity grips him, when in it he sees value, when it satisfies a need of his nature. The great philosophers, teachers, artists, poets, inventors, etc, geniuses in any field of human endeavour,—have all done their work in the play spirit. This is the ideal of the school, and of all education: so to arrange things that the child, the youth, the adult may be able to do his daily work in the play spirit.

AGE DIFFERENCES IN "PLAY" INTERESTS:—

As the games of children depend upon their developing instincts and powers, changes in the games must occur as these inborn tendencies wax and wane. The order of this development is different from mere physical and sensory activity and leans towards that involving more of the intellectual factors; gravitates from the individualistic instincts towards the social and competitive ones. Besides these changes in the forms used in play, there are other changes of equal importance. Imitation plays a larger and

the sharp distinction between play, work, and drudgery here suggested; but it is true that at the extremes we find these characteristics. Fully to enjoy some play entails work: to realize one's purpose in either work or play may involve some drudgery. Of immense value is the fact that children in their free, social play learn the necessity of work and sometimes put in a good deal of attentive, persevering effort to achieve the desired end. An artist requiring a particular type of head for his picture may spend weeks in search of it; but the joy of his art is such that much of the drudgery connected with the quest is lost in the satisfaction of the end to be gained.

SIGNIFICANCE of the PLAY SPIRIT :—

It is because of this vital relationship between work and play that play has been called one of the greatest factors in education It is the aim of educators today to take more of this play spirit into the class room, so arrange the school work that much of it could be done in the play spirit which would be a tremendous gain. So long as the school organization is as it is, and so long as civilzed ideals hold sway, work and even drudgery must have place in the education of every child. But whenever possible the play spirit must be encouraged and be planned for, if results worth while educationally are to be obtained.

The play spirit is not synonymous with the free physical activities of the child. It is much broader. It is not confined to any type of activity nor to any age. It is characteristic of the intellectual responses just as truly as of the physical ones. Imagination, observation, judgement, and reasoning are used in play. The constructive and æsthetic arts with their fusion of the physical, intellectual and emotinal factors are often characterized by the same spirit. Any activity engaged in, primarily for its one sake, which is in itself satisfying, is characterized by the play spirit. Play does not mean being amused, and it is not synonymous with aimlessness and lack of results.

begun with zest becomes drudgery before it is completed because of the fatigue occasioned. Lack of particular ability may be the cause of the lack of adaptation. Music, or art, or handwork, or athletics may always be work for certain children simply because they lack ability along these lines. Sometimes the lack of adaptation is due to the fact that the activity has been planned by an adult who has not taken into proper consideration the stage of the development of the child. When this occurs, the activity being beyond his stage of development, calling for powers and tendencies not yet ripe, or left behind, the process satisfies no need on the part of the child. The only motive he can have is to satisfy the adult from whom the initiative has come. Under these conditions it is impossible for the child to throw himself wholly into the task. His attention is divided between the process and the end, and divided attention is always accompanied by strain. Were the activity suited to the child, if it called out some developing instinct or power, the process and end would not be desparate but a logical whole, and the attention of a unified, concentrated type. To sum up, the attitude rather than occupation determines whether a person is at play, work, or drudgery. *PLAY* means a feeling of freedom, presence or absence of a conscious purpose, enjoyment of the procedure for its own sake, a varied and rather wide range of activity, adaptation to ability and stage of development immediate attention. *WORK* means action directed by one's self or others, a conscious purpose in the result whether there is enjoyment of procedure or not, a fairly narrow range and variety of activity, possible lack of complete adaptation to the individual, and probably derived attention. *DRUDGERY* connotes that the work is imposed by another, that the purpose is forgotten or is so remote as not to motivate—in any case the purpose is not within the present procedure—there is much repetition of a narrow range of activity, no adaptation to the individual, most likely forced attention.

Of course, it is true that in life situations, there is not

type of play, together with the developing sense organs of the nervous system and the brain. Sensations coming through the sheen of light, the shake of the rattle, the throwing of the ball, are his mental toys and his delight. Later, when stronger muscles cooperate in stronger and more complex movements, and when further brain development makes perception and apperception possible, activity of the whole body is the somatic type, while mentally imagination, volition, and imitation, become his toys........Is it not sinificant that whatever the type of play may be, it just keeps pace with the somatic type of growth? And does not the impulse to exercise these growing parts furnish all the explanation that is needed for the existence of the play activity?"

The last theory seems to account for the facts better than any one of the others. The instinctive tendencies to action to feeling, and to thought are dependent on the development of certain connections in the nervous system. This development always follows the same general order. The readiness of the nervous system to act depends not only on its development, but also upon the environment, the condition of the individual as to fatigue, comfort, etc., and the experience immediately preceding. In actual life, many responses might be ready at the same time. The situations calling out the responses are not simply one-to-one affairs, but extremely complex, often overlapping each other, so that at one minute one instinct might be the response, and at the next, another.

When is an activity called Play?

Play resolves itself into the functioning of gradually ripening instincts. These instincts must be evoked by situations not stamped with the economic need which would lead us to call the activity *work*. In many instances, because of the protection and care of the parents, because of the difference between primitive and civilised society,

and well-marked changes due to the stage of culture through which it has passed. Practically, it is difficult to prove, on this theory, why boys like to go swimming and to live in caves at the same age, or why it is that children enjoy playing with toys before they want a bow and arrow, or why the favourite toy of most girls under nine is the doll. There can be no doubt that there are common elements to be found in the games of all children civilized or primitive.

4. Professor McDougall in his "Social Psychology." suggests that the essence of playful activity is found in the *motive of rivalry and emulation.* He says, "A motive that may cooperate with" others in almost all games, and which among ourselves is seldom altogether lacking, is the desire to get the better of others, to emulate, to excel. This motive plays an important part, not only in games, but in many of the most serious activities of life, to which it gives an additional zest....... But wherever it enters in, it is recognised that it imparts something of a playful character to the activity." But rivalry does not enter into many of the plays of children. Some plays, the make-believe plays, the doll plays, and the play of an infant are noticeably lacking in such an element. Moreover, the fighting for the upper hand by no means changes their activity into a playful one. If carried out fully, this suggestion would involve a differentiation of each instinct into two :—one the serious form, and the other the playful form which is ever accompanied by the spirit of rivalry, and this does not seem to be true. It seems impossible, then, to take this theory as a full explanation of the play impulse, although it has some truth in it.

5. Miss Appleton advances a *biological theory* of play. She thinks that play is dependent on the structure of the body, and that the activity is of such a character that it will satisfy the needs of the growing body. "With the infant, the head or arm muscles being strongest, control the somatic

2. The Theory advanced by Professor Groos is that Play is a *preparation for the business of life.* He thinks that in the various games children practise the forms of activity that they later need and upon which their struggle for existence depends; that such practice is necessary for the future perfection of various activities; and that development of the individual depends upon it. No doubt in some instances, specially if one considers primitive man, there is some such correspondence. But in most cases the preparatory effect of the various games is hard to trace. For instance, it might seem valuable to children of uncivilised races to indulge in running and catching games, because the adult savage depends much on his agility and strength for his existence; but for what do these plays prepare a civilized child? For catching a running Train or getting out of the way of an automobile? The preparation, if there is one, may be taken in a very general sense, for no close analogy can be found. Even if it does exist, as the theory suggests, it only indicates something further to be explained, for, "Why does the child in his ignorance of adult needs react in just those ways which thus train him?" (Appleton.)

3. Stanley Hall holds strongly to the *atavistic theory*, which appears to be only a special application of the Recapitulation theory. He says, "I regard play as the motor habits and spirit of the past of the race, persisting in the present, as rudimentary functions sometimes of and always akin to rudimentary organs. The best index and guide to the stated activities of adults in past ages is found in the instinctive, untaught and non-imitative plays of children which are the most spontaneous and exact expression of their motor needs........Thus we rehearse the activities of our ancestors, back we know not how far, and repeat their life work in summative and adumbrated ways." (Hall. Youth. p. 74). The same criticisms of the recapitulation theory will apply to this also. Theoretically, scientists do not believe that human nature has undergone such definite

The Philosophy Of Play

BY

MASUD-UL-HASAN, B. A.

One of the most obvious characteristics of children upon which every one agrees is their fondness for play. Childhood is the playtime of life. Children seem quite willing to devote all their waking time and energy in playing, provided this tendency has not been inhibited by some environmental condition. To play is as much a part of their original nature as to eat, or to sleep. What is just the source in original nature has been discussed for years. Why do children play, and why do they play in just the way they do? Several theories have been advanced, each containing something of value and importance.

THEORIES of Play :—

1. Schiller and Spencer in their theories claim that the *excess energy* of brain-centers discharges into play activities. A child plays because he has superabundance of energy which must have an outlet. A well, healthy, and rested child plays better than a sick, frail, and tired one. But we know that children and animals both play when they are ill, and play till they are exhausted. What then constitutes *excess* of energy? This theory does not account for the particular forms taken by play. There must be some reason for the fact that children between 7 and 8, enjoy "make-believe" games, and that between 9 and 11 running games are so very popular; and that the puzzle is fascinating at about 12, and games of skill are of extraordinary interest in the teens. There must be some reason for the fact that the play activities of children follow a certain order irrespective of environment. The Spencerian theory does not give this explanation.

Stage Co-operative and Team play, with group competitions, and track and field sports, should from the chief activities.

7. Up to the age of 12 or 13 years boys and girls play practically the same games. In the later period sex differences become prominent. After this period boys and girls must be separated in their play. Girls play Basketball, Hockey, Tennis, and engage themselves in Swimming, Hiking, and games; while boys play Football, Baseball, Basketball, Volleyball, and take part in athletic Sports. Competition interests girls less than boys, but both prefer outdoor recreation rather than strenuous competitive sports. Play of adults differs from the play of children. To the child Play is the Winning of life, and for the adult it is Relaxation, the renewing of life.

8. Leadership :—An ideal leader should bring to his task the ability to develop leadership in others and the art of leading rather than directing. To be a good leader of play a person, besides satisfying other requirements, must understand three things, viz, what the child is trying to do; what he is really doing; and how to help him to the best advantage

also an appropriate activity. Constructive play and hand-work form a speedily developing activity in the recreation programme. Music or rhythm has a tremendous force in gaining a greater degree of joy and self-expression.

6. The type of activity is determined by the stages of development which the growing child has reached. It is essential to make a brief study of the child, the growth and development of both brain and body, in order to know the types of play to be organised at different periods of the child's life.

(*a*) In the first Three Years, the period of babyhood, creative impulse begins to manifest itself.

(*b*) From Three to Six Years *i. e.* during Early Childhood, great physical activity is very marked. At this stage the use of play rooms is very effective. Free active plays are Rolling, Jumping, etc. Imitative and dramatic plays and a few formal games should from a part of the play programme.

(*c*) Six to Eleven Years:— Later Childhood it is dominated by the fighting and chasing instinct. It a transition stage. The play and games must develop motor activity of infinite variety but with definite purpose and interest in the outcome. *e. g.* Simple Competitive games, games of chance, and constructive and dramatic play.

(*d*) Eleven to Fourteen:— BOYHOOD—This is an Age of loyalty when gangs flourish, a period of greatest physical activities. The programme should include outdoor Gymnasium, running track and jumps, football, Swimming and constructive play.

(*e*) Fourteen to Twenty-one:— Puberty—At this

Hence recreational, social, educational, civic, and art activities all have their place in the leisure time programme.

4. The following are group activities which are interrelated:—

(A) *Team games*:—Football, Volleyball, Cricket, Hockey, Basket Ball, Base Ball.

(B) *Miscellaneous*:—Circus, Hiking, Story-telling, Concerts, Band, Carnivals etc.

(C) *Sports*:— Track and Field, Tennis, Swimming, Boxing, Boating, Cycling, Wrestling, Tug-of-war.

(D) *Gymnasium*:— Marching, Calisthenics, Apparatus work, Gymnasium Dancing, Tumbling, Pyramids, Relays etc.

(E) *Clubs*:— Boy Scouts and Girl Guides, Social Clubs, Dramatic Club, Debating Club, etc.

(F) *Hand Craft*:— Wax work, Bead work, Basketry, Weaving, Toy-making, Clay-modelling, Model-making, Paper-flowers, Paper folding and cutting, Drawing and Painting etc.

5. Not only do Track and Field Sports and highly organised games like Football etc., give recreation but also develop muscles, improve health, train for leadership, good sportsmanship and ultimately Citizenship. The amateur must play for the love of the game. It is only through leadership that the moral virtues of athletics are stamped on the player's life. Group athletics are most valuable as they involve group players' combining efforts for the common end. A feeling of joy in life is one of the chief sources of good health. Health habits may be introduced through play and dramatics etc. First Aid instruction is

The Universal Impulse to play is a Divinely ordered thing; if God gives the instinct, man ought to provide the Playground.

—JOSIAH STRONG.

The Normal Course in Play.

BY

T. N. SIVAN, F. A.

---

1. " Play is what we do when we are free to do what we will." It involves every activity. It is nature's method of Education.

2. Worries and strains can be thrown off by complete absorption in a game. The fact that play is enjoyed is one of the main reasons why it is conducive to health. Through play circulation of blood is increased; a greater respiratory activity, better elimination of waste and improved digestion are brought about; and muscles are developed. Thus play prevents diseases, promotes nervous stability, and has great therapeutic value. It tends to help and unify the mind, fosters mental alertness, and develops memory. Courtesy, self-discipline through obedience to law, loyalty, team-work, courage, justice, unselfishness, generosity, honesty, perseverance, and tolerance are all developed through play. Play is an antidote to delinquency and crime. It prevents much mischief and vice by giving occupation to the body as well as the mind. It turns the rowdy gang spirit into channels of innocent pleasurable action.

3. In play there must be opportunity for forms of activities which aim at mental and spiritual refreshment and growth as well as physical exercise and development.

nowhere is there a better opportunity for putting them into practice than on the play-fields through team games. The greatest function of modern physical education is to produce not huge muscular giants but a type of men endowed with a tough and enduring nervous system supplying fine neuro-muscular coordination and able to stand nervous strain. Team games furnish the greatest opportunity for developing emotional balance in boys and young men.

Conclusion

It may not be out of place here to consider, in the light of the value of team play just narrated, how far schools here have taken advantage of this in moulding the character of the boys and building up the *morale* and personality of an institution. It must be stated at the outset, very few here have yet realised the immense potentialities of team play in developing good citizens. Although team games are played in almost all the schools much attention has not been directed towards the building up of the team spirit, team honour, team *morale.* Very rarely do we see boys remembering with pride their having played for their school or for their team. The use of school colours, team badges, team warcries, employment of trained and exemplary full time coaches, and other similar means for instilling the team spirit, have not been utilised to advantage. There is too much of playing to win rather than playing for the sake of play. Very often, teams appear building up all their hopes of winning on one or two individual stars rather than on the general efficiency and co-operation of all the members of the team.

Value.

Modern educational psychology has won for play ways and play methods an important place in educational methods. Of these, team play is the most powerful agency for social, ethical and character training. The team play is as old as the race itself. Though at first fighting as an individual with club and stone was good, yet man soon realised that much more could be accomplished together in groups and so came the social sense, which preserved from annihilation not only the individual but the whole race itself and raised man to the greatest fighting organism on the Earth. Fighting with success and in groups stimulated those fundamental emotions of anger, courage, fear, spirit of competition etc., associated also with the activities of jumping, running, climbing, throwing etc. Our team games of modern days are the modern expression of the old fighting spirit and hence are particularly appealing to the child. It is to these team games like football, that we must turn for the stimulation of those fundamental emotions and for the play of muscle activity.

If there can be any healthy outlet for the exuberance of the fighting spirit, it is team games. These alone can be the most effective substitutes for War. They develop strong and healthy young men who are essential for the security and healthy productivity of the race. They engender in the members that team spirit, loyalty, co-operation, unity etc., which build up the tradition and *morale* of an institution. It is well known that institutuions are what their teams make them. It is team games that have become the rallying point for the expression of the institutions and personalities. Cheerful obedience to rules, self sacrifice, self control and other social virtues are developed by team games. Nothing exerts such a chastenning influence on individuals as team opinion. The principles of Ethics may be taught in a class room, but to become effective in life they must be put into action and

to go outside the bounds of nature and try to educate a child who is not there. But within these limits there is, though not an unbounded, yet an infinite, variety of choice, and in this choice mementous issues are involved.

The value of Team-games.

By

K. S. RAGHVAN, B. A., B. T.

Its place.

The functions of a modern school have extended so far beyond the traditional three *R's* as to include some of those hitherto discharged by the home and the Church. In these days of keen struggle for existence and competition, the home is no longer capable of contributing its share to the growth of the child. Religion has become so controversial and confused with the advance of science and materialism that it does not exercise as much wholesome influence as in the past. Thus, the school has become almost entirely responsible for solving the problem of the child. The modern school aims at producing not merely intellectual prodigies but good citizens, sound in mind, healthy in body and ethically and emotionally well controlled and well regulated. It is doubtful if there is any subject of study that has requisitioned the services of so many sciences and researches as the study of the school problem of producing good citizens of good physique, character and gracefulness. Educationists have realized recently that one of the most psychologically efficacious means of developing the typical citizen in the play-way and of all various kinds of plays and games, the team games offer the best scope.

Small boys instinctively worship bigger boys, receiving instruction from them. As they grow older the College athelete becomes their demi-god, whose manner, walk and speech they imitate. They learn very largely by example, and owing to their soft and pliant nature are moulded into Shape by the living example before them and the hereditary instincts of the race to which they belong. They select their future career in the light of the traditions of their race. By the time they are grown up, they are—not by intention alone but by acquired bent—hunters, fighters, musicians, artists, or mechanics, according to existing customs of the times and the prevailing habits of the people. Their social, inheritance like their physical one has been salted away in their spinal marrow and is now a part and parcel of them. Learning from their elders is as natural to children as chasing, wrestling or playing with dolls. To cut them off from the opportunity to learn, whether at home, in the school or on the play ground, would be to deprive them not only of a necessary part of education but of an essential element in play. The lonely, untaught child is a crudely artificial product. To leave a child alone in order that he may have a full chance to be himself is like essaying to give a fish real liberty by taking it from the obstructing medium of the water. Social inheritance through teaching is as definitely provided for, instinctive play, as is physical inheritance, through bodily structure.

The child cannot be, it is true, wholly moulded according to the whims or prejudices of his elders. There are boundaries set, both in his physical structure and inherited reflexes, beyond, or aside from, which he cannot be extended. I believe that man can improve upon Nature if he only works upon right principles and instinctive methods. But he cannot ignore what Nature has decreed; he can supplement her law but cannot supersede it. He can bring a change in the nature of the boy it he has studied him in the class room and on the play ground. It is of no use

he is to secure a place in the world's competition, are given in his leading instincts; and these instincts take hold of him in plastic infancy and mould his habits and future life.

This process may be seen as clearly as the process of cause and effect in Nature can ever be seen by any one who will watch a child at play. There you see Man, the Maker taking shape before your very eyes through building with blocks and making mud pies and palaces; Man, the Poet born in chanting and dancing games; Man, the Nurturer growing through play with dolls and pets and plants and younger children; Man the Scientist evolved in plays of imitation, of exploring, collecting and classifying; and Man, the Citizen in the great team games.

Play and Work.

The new and the old fulfilments of the play instincts—play and work respectively—are often identical in form. We think of the little girl playing with her doll, the small boy with his toy bow, and we say that real motherhood and real hunting are something very different. But the little girl plays also with her baby brother, and the acme of her satisfaction comes when her mother goes out and leaves him wholly to her care. Play is now in her case performing its 'serious' biological function. The little boy for his part shoots not only with blunt, but also with sharp, arrows or with a gun; and when he is allowed to go on a real hunt with his father it is the fulfilment of his dreams. What is the full play of the hunting instinct if it is not hunting?

Play and Teaching,

The child learns ideal characteristics on the field of play and not in the class room. Even though he finds himself quite free in the open field yet he would not go beyond the rules and regulations of the game. There the game-master and play-mates teach him consciously and even more unconsciously the character which benefits him through-out his life.

Let us consider the child now in its various aspects independently and look at the bearing of all these sides on the child nature.

Self-Confidence

Self-Confidence is one of the most essential traits in a child to assert itself. The question is not of accumulating knowledge by learning nor of acquiring power by playing games and by doing physical exercises, but of building character. The soul, like the muscles, grows by action ; it creates itself by self-assertion, by putting itself forth in overt deeds and in concrete forms. It is only that into which you wholly throw yourself that will give you a greater self in return. This characteristic of true educational experience is possessed by play to the full extent, and by play alone. It is only in its play that the child's whole power is called forth, that it gets itself completely absorbed in what it does.

Growth.

Growth through play is simply an example of the general law of growth through action, as the physiologists say "The function makes the organ." The very bones depend on exercise for full development and are even partly shaped by the use to which we put them. So it is necessary to select such games as give right posture and help in removing defects if there are any. It is Nature's prescribed course without which the child will not grow at all.

It is very useful as it also helps in the growth of the brain and removes the poison collected therein. A healthy atmosphere both of the vast Nature around and of the jolly, open society stimulated by keen competition and healthy rivalry makes both body and mind healthy, strong and sturdy.

Play Trains for Life.

Man's cardinal qualities, the activities through which

Play in Education.

BY

A. MAJID, F. A.

IN this paper an attempt will be made to show what an important place 'Play' holds in the 'Education' of the child.

The aim is to present a true picture of the playful child. 'Play' to grown up people, signifies some thing of secondary importance: it is the word for those activities that must come after serious pursuits. 'Child's play' specially means what ever is ridiculously easy. To the child, on the other hand, play is the most important thing there is; it comes first in interest and represents real life. It is the only way by which you can find out the real spirit and inclination of the child and mould him for future life.

The boy without a play ground is like a man without a job. Because a man without a job might earn as well as a child might play without a play ground; but just as a job creates permanent interest in a man to systematise his work connected with it, so a child also gets systematically trained in its natural inclinations on a play ground for the whole of its life-time. Play is to the boy what work is to the man. The man's work sustains life and the child's play creates it.

Misunderstanding of the words 'Play' and 'Work' constitutes an almost impassable barrier between the world of childhood and that of the grown-ups. But we cannot help using the same word for the child for two reasons: first, because there is no other word, and secondly, because we are using this word to designate our children's most important interest by the help of which we understand our own children and use it in the development of their consciousness.

structive type and of great natural interest to boys. They should also combine amusement, and their accomplishment should develop the heart and lungs, and give a robust physique and afford good exercise and social training. All should be made to acquire skill of the hands during the plastic period of youth. It is also a good plan to have periods of low activity followed by others that are vigorous, so that no one may overdo it, and there should be plenty of variety and elasticity. A wise director should watch the mood of the boys and organise the games which they wish to play at that time. Periodical exhibitions of special items of public interest are the best advertisements the playgrounds have and a source of real joy to all those who want to show them off.

My closing note is upon a subject that goes to forming ideals and habits. Whatever a director does must be based on strict 'discipline'. A playground that is undisciplined, where the bully and the loafer set the pattern for others to follow, is the worst place possible for the gathering of children. A certain standard of conduct must be insisted upon. A popular director rarely fails to get his orders executed. The method of "pupil government" has worked well in many places. A strong disciplinarian must be able not only to make up his mind easily and definitely, but must be able to do it quickly so as to check disorder before it really arises and control situations at the very beginning. No favouritism should be shown, but in each case the director must persue the course that will produce the best effects in dealing with the individual. To keep all busy is a fine method of checking bad discipline.

in the playground. Formerly the question of fencing did not draw much attention, but experience has shown its utility and the modern play-grounds invariably possess this.

The sanitation of the play-ground is a very impoıtant subject and worthy of careful study by the organiser. A place that is completely dedicated to the promotion of health and physique must as far as possible be the cleanest spot. The authorities should keep themselves in touch with the Health Department to maintain the cleanliness of the play-ground in particular and the surrounding space in general. A little touch with the nearest police station will also greatly help the cause. The pupils themselves should be taught the value of sanitation ; and the use of a latrine, and no other place, for all personal purposes at all times must be strictly enforced.

A watchful eye should be kept to prevent small children using the gymnastic apparatus meant for the grown-ups. They often mis-use it and serious accidents result. Some times accidents will happen to even beginners of advanced age for want of good supervisors. Rules must be laid down that no advanced exercises in gymnastics should be attempted without a competent supervisor. First-aid things like iodine, zambuk, embrocation, bandages, lint, splints and a stretcher should be kept in readiness to meet emergencies, and the organiser and his assistants should be well-versed in the principles of ambulance work. The gymnastic apparatus should be tested, cleaned and oiled to avoid accidents.

A good director's care should be to make the day's programme highly enjoyable. Such a programme should be devoid of restrictions and formalities and must be adaptable to the time, place and occasion. Freedom is the essence of the day's scheme. Any activity that is not free may be worth while but it is not play. Activities should of a con-

The spirit of play is the spirit of childhood, and vivacity, the joy of life. It is these things that make much of the personal charm and effectiveness of the individual in social circles. The organiser should become the hero of his pupils. He should be an expert himself and an authority on all those activities under his charge. His success in his work could be measured by the proficiency of his pupils. He must be a fair judge for all, must be able to see the good side of others and to show respect for it. He should avoid snobbishness, a sense of superiority and prejudice, and should be unbiassed, fair-minded, balanced in views and perfect in comradeship. These are some of the fundamental things that are absolutely necessary in a good leader and organiser. If he practises these he is sure to create the spirit of friendliness and secure the co-operation of all.

Opinions differ on the question of teachers being put in charge of games. Some do not object to it, but others say that a teacher who has been in a class-room for long hours ought to be entirely relieved of strain after school and that the taking on of a new activity is likely to cause a breakdown. Apart from this point my personal view is that a teacher can take part in games voluntarily, but to promote all the qualities that have been enumerated above, he should not be put in entire charge of the field, but that a special person should be made to do the work with the assistance of students who very willingly do the needful for the mere asking. Apart from the co-operation of others that the director gets, such a position of trust does a lot for the boys themselves since they develop manliness, powers of leadership, dependability and reliability while still young.

It is a desirable thing that playgrounds should be fenced, to avoid their becoming the gossip-places for idlers, the by-ways for travellers, and the meeting places and trial grounds for mischief makers, undesirable characters, loafers, bullies, and to protect both the persons and the things

those who are interested in the work are coming out in scores and hundreds to help those persons or institutions which are anxious to get the most out of it. The cause of all these seems to be the increasing congestion in cities, the new psychology, the new sense of social responsibility to strengthen the race, to divert the children from temptations and give them an opportunity to spend the extra energy that is always trying to find an outlet.

The best site for a playground is within the school premises not for off from it, and with as little public hindrance as possible. The ground should be suitable for the club's main activity like cricket, foot-ball, base-ball, volley-ball, hockey, tennis etc. It is a well known fact that a well equipped gymnasium is the very best place in which to develop the various muscles of the body, make them hard, and build stamina and a good all-round physique. So provision should be made for equipping play-grounds with rings, trapez, ladders, bars, vaulting horses, climbing ropes, hammock swings, balancing masts, slides, see-saws, merry-go-rounds etc., to suit the requirements of the various ages and both sexes. Should baths be available for use after work, the benefit from a physical and hygienic standpoint would be greater still.

Before launching on such things, I should like to impress the importance of the right kind of organiser who is the life and blood of the whole scheme, and on whose merits or defects depends the whole fate of the new scheme. The organiser should be the centre of attraction from every view point. He must possess a fund of cheer, mirth, powers of leadership, organisation and initiation. His personality is responsible for getting the largest attendance on the field, and men should voluntarily come in for training courses. If he has to issue instructions he should make play the medium and then success is ensured. He should have the spirit of playing ingrained in his veins and he himself should be a good sportsman to impress his ideals upon those under him.

by means of sleep and nourishment, but in recreation and play, strength is needed to gain strength.

Here in this view again, play and economics or the future good of the Fatherland are closely connected. Play makes a man patriotic and further makes him fit to fight the battles both physical and mental for the political as well as the economic independence of his nation. In America, when the need for fighting men was felt, direct military training proved impracticable but when the same training was imparted to the student population through popular play centres, the whole nation was prepared to face any warfare.

Conclusion.

Thus play and economics, though, to a superficial observer, they might appear to be as far assunder as poles, are only two different phases of the actual aim of every man in his life, the aim of leading the best sort of life with the least amount of pain or waste. In fact, play, in all its aspects—physiological, psychological, sociological, pedagogical, educational or biological—does, and ought to, serve the ultimate end of life—that of economic wealth and welfare.

The Practical Conduct Of Play.

BY

M. G. GHATALA. B. A.

THE call of the world has been for physical activities irrespective of age and sex. Time-worn ideas are giving place to modern ones, as a result of which

necessities by diverting labour from them towards unproductive channels

Then again, play has a very great share in neutralising the pessimistic and the optimistic nature of a human being. The extreme pessimist is unenterprising, over-cautious and when bargaining is inclined to pay very low prices because he does not make a high estimate of the pleasure to be derived from his purchases On the other hand, the optimist is a greater bane to society because he is generally over sanguine and rash, plunging into any enterprise with expectant pleasure at the success he expects and seems to be incapable of anticipating any painful results. Such a temperament, combined with ability, results in waste of capital and pain to many innocent persons. Men, with well balanced temperaments, are the main-stay of a nation's progress, which balance can alone be attained and retained throughout a man's life by playing healthy out-door games which might be both health-giving and recreative.

Physiological Importance.

From the physiological point of view again, games play a great part in the economic condition of a society. From this stand-point there are three theories put forward as regards play.

(1). Necessity for some discharge of superabundant vigour.

(2). Relaxation and recreation of exhausted powers,

and (3). Teleological significance of play, as a preparation for the tasks of life—as in Germany—for the future good of the Fatherland. Besides this, the other view that prevails in Germany is that play is essential for recreation, which means renovating oneself i. e., creating anew and restoring lost powers, both physical and mental. Such recreation may be had partially

Amongst the Greeks and specially amongst the Spartans the point of economic wealth and welfare of a nation due to its physical fitness was stressed so far that they actually began to throw their weak children on the top of Mount Parnasus.

Character formation.

Play again has the highest importance in economics from the point of view of character building. Play affects in a direct and forcible way the character of a man, making him cool, trust-worthy, temperate, considerate, frugal, tolerant, hardworking, and consciencious, all of which qualities play a great part in the economic phase of his life. Play makes a man handle the serious economic problems not only ably and most considerately but very cheerfully. This cheer and joy, in adverse circumstances, is an invaluable asset to any nation, in as much as it not only makes the society tide over its troublous times but it effectively checks degeneration, crime and misery which, hindering all progress, take their victims deep down to the depths of complete destruction. It is a common experience of sportsmen—one and all—that the friends they acquired on the field are not only many more but are more sincere and sympathetic than those acquired in class rooms. Play amongst the rich also has a great effect upon the economic wealth of a nation. The sporting rich are always tolerant, sympathetic, frugal and benevolent and thus they never think of spending their superfluous wealth in their wasteful luxuries or base immoralities. The rich, once they begin to amass wealth or even if they begin to indulge in their luxurious habits, deprive the nation of its necessities to that extent. They, in indulging in their luxuries, might appear to be providing openings for labour, thus contributing perhaps towards the higher level of wages, but yet, in-as-much as the goods produced are not capable of further production they have not only made all this labour futile but they have at the same time increased the prices of the

games and sports as would be conducive to the betterment of his physical and economic conditions.

Play ceases to be play if it becomes an imitation, as it might on account of the surroundings, when a child grows to boyhood—and it then, instead of attaining its serious aim in future life only adds to the list of unnecessary, luxurious habits in the form of expensive dress and play material. Not only does it add to his expenses but it makes his nature also far from desirable.

Games of the right sort, available for all, at any time and affordable by the poorest are the essential need of every nation and especially of a nation which enjoys the prestige of foreign protection because such a nation apart from the need that it might feel towards the discharge of super-abundant vigour, finds enough time and opportunity to engage itself in this harmless recreation.

Play as against education is a thing of a greater past. In fact education is only a phase of serious play which brings into exertion the mental powers when the physical powers are attained. The first savage had to solve the problem of food which he did only learning how to do it by play. It was his own personal effort at hunting, shooting, fishing and planting that procured for him his means of subsistence.

Then when he passed beyond this stage and created society for himself, either in his own village or in his country or nation, he had to face not only the individual problems but the problems of the whole group or society. For this purpose he created a patriarch whose duty it was to see that all had their proper share both in work and in profits. As society grew, it naturally happened that some began to count upon others labours and thus there was every danger of the individual capacity of earnings being brought down too low. To remedy this evil, group games were started specially among the Greeks and the Romans.

childhood, the man has shown a marked inclination towards playing decent fair games, without taking undue advantage of his opponents, but playing them boldly, open-mindedly persistently, he should undoubtedly turn out to be a great asset to his society. The very care which a child bestows upon the decent preservation of its dolls and play-things makes it keep its books of study in boyhood with the greatest neatness and care; and this same child when it grows to be an adult involuntarily saves its economic goods, utilizing them towards the most advantageous purposes, making as much capital as possible, thus greatly contributing towards the happiness of the poor and the increase of national wealth. Play is a thing, as subjective but yet as essential to every man as economics itself. Just as you can lead a horse to water but cannot make it drink, so you can neither make a child play if it is not inclined that way, nor can you make a man frugal and economic by any amount of preaching and lectures. If it were possible to preach economics, there would either never have been any need of temperance socities or they would have long attained their aim without the least disappointment.

Child, Father of man.

A man learns to be extravagant or frugal, virtuous or vicious, industrious or lazy, fair or foul not so much in educational centres as in dealing with his dolls and play things and later on, on his play fields. This is because play is often not imitation but rather a premonition of the serious occupations of individuals. The experimenting of little children and young animals as of civilized and uncivilized nations is never an imitative repetition but rather a preparatory effort, an apt illustration of which will surely be found if a big gallery were opened of all the various things that the children of the various nations play with. Play is an inheritance of the race and as such the child nation plays only as the economic nation requires; not only the child but even a sturdy boy ought to play only such

The most progressive educators agree with the idea that physical and health education should occupy a leading position in the curriculum of the elementary and secondary schools. Spacious playgrounds, athletic fields and baths, should be provided for every school building. Sports and games not merely increase social intercourse and reciprocal goodwill among the several athletes but have also educational advantages. It is through Physical Education and properly directed athletic sports and games that the child and youth most readily acquire habits of obedience, self-sacrifice, co-operation, friendliness, loyalty, capacity for leadership, ability to lose without sulking and win without boasting, a spirit of fair play and all that is implied in the word 'sportsmanship.' Besides, personal development in health, strength and endurance there are other traits such as self-confidence, self-control, mental and moral poise, perseverance, courage, resourcefulness, which are of vital importance to a nation.

Play and Economics.

BY

BHASKAR NARAYAN, B. A.

Relation

THE connecting link between play and economics is the psychology of man. Just as it is psychology that makes a boy play various sorts of games, so during his manhood it makes him apply the various principles of Economics consciously or unconsciously—towards his income and expenditure—either for the betterment of his financial condition or otherwise. If from his

the Y. M. C. A. commenced. In 1880 and onwards a marked change was perceptable. The Y. M. C. A. established a normal school for physical educators. The Y. W. C. A. introduced practice of physical education. Dr. Sargent at Heminway Gymnasium of Harward University incorporated his theories. An Association for the advancement of Physical Education was founded and did excellent work. The Delsarte system attracted the attention of the public but soon died out. The nineties of the last century were a period of solid progress. There was widespread physical education, numerous normal schools were opened, summer courses for teachers were given and atheletic and playground movements increased. From 1910-30 emphasis was laid on Health Education, active interest was taken in recreation activities and Scouting; compulsory physical education laws were passed; athletic programmes are the order of the day.

11. Recent trends in Physical Education.

Each decade brings new researches and new angles of vision. There is a different objective now, a "natural" movement in Physical Education in America. There is also the 'Fundamental Danish Gymnastics' and 'Expressive Gymnastics of Germany' under experiment. But the most powerful is the Playground movement. There has been a revival of the Olympic Games, which proposes all sports for all, in the literal sense of the word. While Track and Field sports are the nucleii of the sport-plexus, they are not the whole of it. All kinds of out-door exercises and games are also included and represented by nearly all the nations of the world.

Japan, China and recently India, are all taking interest in Physical Education and Track and Field sports. They are sending teams and athletes to the Olympic games. Still for India much remains to be done. It is time now for her to make Physical Education compulsory in schools and colleges in order to keep pace with the progress of the world.

Educational Institute gave an impetus to the cause of Physical Education through his famous works 'Gymnastics for the young, 1793 and 'Games' 1796. Outside Berlin Ludevig Jahn, and Adolf Spiess-fathers of Physical Education gave boys and men exercises and formed gymnasia and playgrounds. In Copenhagen, the famous gymnast Nachtegall opened a private gymnasium in 1799 where nothing but physical education was imparted. Denmark and Sweden followed the lead. Per Henrik Ling, founder of the Swedish system, opened a general Institute of Gymnastics in 1814 in Stockholm. His son Hjalmar Ling developed his father's scheme and introduced the Swedish system in schools. Amoros and Clias did excellent work in Paris and England. Pestolozzi organised his famous school and developed his theories in Switzerland, while Dalcroze devised his system of eurythmics. So all the nations of Europe fostered and widened the growth of physical education. It is a science, its shores are ever widening. With the development of Physiology, Hygiene and Medicine, new theories have sprung up and brought physical education on a level with mental and moral education. Almost all the countries of Europe have adopted in schools, medical inspection, study of sanitation, ventilation and hygiene.

10. Physical Education in America.

America has passed through many stages from 1830 to 1930. In 1830, Captain, Alden Patridge and his academics were introduced, followed by Jahn gymnastics under the German refugees Beck, Foll and Lieber. Catherine Beecher introduced into "female seminaries" her calisthenics. Manual labour also found place in the College curriculam. From 1860, a new deviation followed. Dr. Dio Lewis' theories about dumbbells and music found expression among the public. Dr. Winship gave delightful lectures to the public. A chair of physical education and hygiene was established at Amherst college. The physical programme of

athletic sports in the curriculum of modern college is that they tend to prevent just the things that happened in the medieval universities.

8. *Physical Education in the Age of Chivalry.*

Due partly to the Crusades and partly to Feudalism, the militant attitude came into force and gave birth to what is called chivalry or the body of law and custom relating to knighthood. Some exercises such as jumping, running, wrestling, swimming were taught with shooting, horsemanship and the use of lance and shield. This kind of education was more individualistic and had neither the lofty ideal of the Greeks nor the fervent patriotism of the Romans.

9. *Physical Education during Renaissance.*

The Middle Ages contributed much to the intellectual development of Europe, but it is not till we come to the 15th and 16th centuries—a period of Renaissance and Reformation,—that we find men totally diverted from the ancient impregnable ideas and dogmas of the world and flesh. Among the chief factors of the transitional period, the, Revival of Learning, a Study of Greek and Latin Classics, was one. Many writers such as Da Feltre, Pietro Vergerio, Sir Thomas Elyot, Roger Asham etc., began to advocate the importance of Physical Education. Locke and Rousseau, the giant reformers of the 17th and 18th centuries, through "Some thoughts on Education" and "Emile" respectively transformed to a great extent the national ideal of education. Both urged for vigour of body, virtue in soul and knowledge.

But it was left to Basedow, a Denmark teacher, to open a school called Philanthropium where students without distinction of class or creed learnt bodily exercises. This was the first school of its kind in Europe. Then Guttsmuths with his fifty years' (1786-1835) service in Salzaman's

6. Physical Education among the Romans.

Among the Romans the aim of Physical Education was for the military. Their aim was rather practical and was in contra-distinction to the Greek passion for beauty and music. They cared for robust health to become capable soldiers. Their games too, lost the sacred character and the contestants were tempted by prizes and were professional athletes. The public baths, otherwise called the 'Thermae' were present in the Roman cities but had little gymnastic facilities and more luxury. So there was a marked difference between the Grecian and the Roman types of physical education.

7. The Tutonic invaders of Rome, Ascetecism.

After the fall of the Roman Empire, the early Christians abhorred the prevailing luxury existing among the Romans and declared Ascetecism. They organized self-restraint so far that they denied themselves even the common comforts of life. Stress was laid upon the reward of eternal happiness and all achievements of bodily pleasure and social position were disregarded. They were concerned about soul and not body. This theory was diametrically opposite to the Greek one where body and soul were blended harmoniously. This preaching had a degrading effect upon the individual physique in particular and low vitality among the populace at large. But the doctrine continued to exist till the middle ages, when the monastic teachings and cathedral schools were considered inefficient to cope with the widened scope of human interest. A demand in the 12th century was felt everywhere for a type of education more advanced and more deviated from the ecclesiastical methods of instruction. Thus sprang up the medieval universities. There was no provision for the physical education in the University rules and regulations. The boys in their leisure hours indulged in drinking, gambling and carousals. One of the arguments given in favour of the introduction of

pictures depict swimmers, hunters, ball-players and dancers. Yet their achievemants were nothing when compared with those of Greece or even Persia. At the time of King Cyrus of Persia in 558 B. C. every boy was taught to rise early, to run, to swim, to shoot, to hunt and to bear heat and cold. This training produced finest physique and efficient military service. They did not care for intellectual and industrial training. So they were defeated by Alexander the Great and lost a mighty empire.

5. *Physical Education in Greece :—*

The Greeks have contributed the highest degree of civilization to the world. Physical Education attained its perfection in their time. In the 5th and 4th centuries B. C there were two important leading States of Sparta and Athens, which had a system of education in type contrary to the other in aim and method. The Spartan type consisted of rigid discipline, while the Athenian type sought individual development. The Spartans were patriotic and warlike. Subordination of self and exaltation of sacrifice for the country were the key notes of their education.

The Athenians valued more individual progress and to that end each citizen learned gymnastics and music. The first subject made the body perfect and the second developed the intellect and the emotions. Thus body and mind were educated together and in the end the individual attained perfection and harmony of parts. Boys learned gymnastic exercises in palestrae and grown up men took their exercises in various gymnasia. Those exercises consisted of wrestling, jumping, boxing, running, throwing the discus and the javelin and swimming. Practically at the close of the 4th century B. C. every Greek town had at least one palestra and gymnasium. There were often national festivals such as one at Olympia (in 776 B. C.) where competitive athletic contests were held. These celebrations continued to exist until the Roman Emperor Theodosius abolished them in 394 A. D.

process of the growth and developments of its present forms and would enable us to start where others have left off "profiting by their success and avoiding their mistakes."

2. Its meaning and scope.

By physical education is meant "instruction and participation in those activities that serve as a means of attaining and maintaining physical welfare." It aims at not only healthful expression but also mental and spiritual expression. The subject has grown so extensive that it includes besides the practice of gymnastics and athletic sports, playground activities, medical examination, health and hygiene instruction, nutrition classes, and school clinics.

3. Physical Education among primitive societies.

The modern tribesmen just resemble our ancestors in the remote past. We see that they are strong and well-built. Their superiotity in bodies is due to physical labour, the search for food, the dancing and the wild games. They work all day long, live an out-door life, wear scanty clothing, jump, swim and wander from place to place, which renders them physically strong, while the modern inventions have taken much of our labour and made us indolent and luxurious. Our bodies have deteriorated and hence the necessity for conscious purposive physical education.

4. Physical Education in Ancient Oriental Nations:—

India and China had the oldest civilizations. Indians were concerned more with spiritual life and considered flesh as an impediment in the passage of soul from this world to the next. So athletic sports and systems of physical education did not find place in the general education of the people. As regards the Chinese their lives were more or less unchangable and stagnent. Their education repressed individuality and fostered ancestor worship. But Egyptians, Assyrians, Babylonions and Hebrews were un-affected by philosophy and meditation. Their stone

Physical Education more effectively than through any other method that teachers have at their disposal.

Skills in the sphere of muscular activity are to be compared with information in the sphere of mental activity. Teachers should therefore encourage every pupil to become "cultured" physically as well as mentally and socially. It need not be urged that physical educators, i. e. the specialists, should be broadly educated to take up their legitmate task, for to fall short here is to allow the house of Physical Education to crumble to the ground. But in addition to the training for the specialists, every class-room teacher should have some training, however brief the period, in Physical Education.

A Brief Survey of the History of Physical Education.

BY

KISHANDAS. J. KADVE. B. A.,

Student of the Government College of Physical Education, Hyderabad-Deccan.

1. *Its Importance.*

It has been man's earliest endeavour to perfect the body, to discipline the mind and to mould the character of the youth by the help of some form of physical activity. To study these activities is of utmost importance to us because of the influence of the past over the present. Moreover it constitutes a record of experiments and achievements on which one may draw for valuable information and inspiration. We can understand through history the long

more readily than does any other subject in the school or college curriculum. Of this fact the leading educators the world over are becoming increasingly aware. Physical Education is *education* and Physical Educators are *teachers*, not circus performers, weight lifters or drill masters. The physical educator's duties involve the three sides of the triangle of life—health, useful habits for life, and character. His responsibility is to train his pupils for healthful living, useful body skills and social habits, and high character.

Every teacher ought to be a Physical Educator.

Not only are the world's leading educators aware of the tremendous latent force which lies in Physical Education as an educative factor, but teachers and educational administrators are grasping the significance of muscular activity as a fundamental method of self-expression and development of the pupils. The most efficient teaching is that which is acted out, by the teacher, through the muscles. In like manner the most efficient learning, by the pupil, is that which is acted out through the muscles. The large measure of success attendant upon the educational innovation known as the Project Method is to a great degree attributable to the large amount of physical activity involved. The same may be said of the Kindergarten method for the Kindergarten teacher is almost exclusively a physical educator. Such simple matters as arithmetic lessons written on the blackboard and turning the pages of a dictionary involve muscular activity and thereby serve to fix the information more securely in the mind. Thus the co-ordinations of the neuro-muscular (nerve-muscle) and the so-called purely mental responses which occur during the activities above enumerated are effective in improving both the physical health and the rentention of whatever is studied. The truth is that the most successful teachers through the ages have, even though unconsciously or intuitively, utilised the 'physical' method of imparting education to their pupils. Thinking, idealising, and doing may be conjoined through

teaching process is to emphasise this fact. When the pupil acts, he learns, and if he acquires more health, courage, or self-control through exercise, he grows. When the child is most interested he is apt to be most active and when he is most active he grows fastest and farthest.

These facts, of recent discovery, constitute a very significant contribution to the modern method of educational theory. Their overwhelming importance has not yet been fully realised and acted upon by teachers.

As to the forms of activity it is important at this point to observe that child activity is of three types—physical, mental and social. Obviously it is impossible to separate these, confining mental activity to the class room and physical activity to the playground. That teacher is most efficient as well as most wise who secures a commingling of all three types of activity everywhere, emphasising each in its proper place but avoiding the error of excluding anywhere it appears or ought to appear naturally.

Definition of Physical Education.

The process of tracing through educational aims and objectives brings us to a definition of Physical Education and a realisation of its tremendous power as an educative force, aside from the purely health aspect. Physical Education is actually a fundamental method of education, a method which proceeds by means of or through predominently physical activities.

Thus it is put up that Physical Education has much broader claim than of being simply a programme to improve health. It is fundamentally a technique which improves besides health, the qualities of courage, initiative, perserverance, self-control, courtesy, justice, co-operation, loyalty, sympathy and understanding—qualities all of which are essential to the full development of character. The programme of Physical Education undeniably develops the qualities above enumerated, besides the quality of health,

In like manner, the aim *Social Efficiency* is broken up into its component parts. The pupil requires to have courage, initiative, perserverance and self-control to bring him through his individual and social problems and difficulties and, as well, sympathy, courtesy, honesty, justice, the spirit of co-operation and loyalty to enable him to meet all the social obligations required of him and which he will be increasingly called upon to discharge.

Economic Efficiency breaks itself up into the various objectives which include those accomplishments by which one earns his living. These objectives relate themselves to both the individual and the social groups to which he belongs (family, state, country).

The aim *Culture* breaks itself up into the objectives which would be taken to mean one's stock of "appreciations" which he acquires through various channels but principally those appreciations which he earns through the acquisition of information and knowledge sympathetically received by his intelligence and worked into his own "inner" experience.

Physical Education.

Physical Education is concerned with all four of the aforementioned educational aims but more specifically with the first one, Health. It is universally accepted that health is the first requisite for growth of the individual or society. Sickness, brings on a worse state than stagnation ; it brings on a retrogression. Health is a matter of the present and future and the educational programme should be concerned with both.

Since Physical Education concerns itself first of all with the health of the pupils it naturally looks to those factors which affect their physical well-being most, such as exercise, rest, food, cleanliness. But of these factors, exercise comes into the greatest prominence.

It is stating the obvious to say that the child is developed only by his own activities, and the nature of the

activity." By best activity we mean, activity of the highest quality knowable and practicable for the individual or society. This obviously excludes mere repetition as such because mere repetition is looked upon as a low form of behaviour. The most important thing about activity from an educational point of view is not its quantity but its quality. The most abundant life comes when a new experience is involved in each successive moment of existence. The aim of education therefore is to guide children in such ways that will enable them constantly to engage in further activities that will enrich understanding, develop new appreciations and lead them to new and wider experiences. The fulfilment of these conditions is summed up in the word growth.

Educational aims.

Educational aims must be compatible with educational philosophy. Educators who accept "growth" as the guiding star will naturally set up aims that will satisfy the conditions of growth. Where Happiness, Satisfaction, Service and Progress are present, growth is assured. To ensure a working basis on which to move, it is necessary to state definite educational aims. Briefly put, they are *Health*, *Social Efficiency*, *Economic Efficiency*, *and Culture.*

Educational Objectives.

An educational aim is broken up into its component parts. These parts we shall call educational objectives. The educational aim health, we observe, that *Health* consists of a number of component parts such as, organic vigour (harmonious functioning of the various physiological systems, such as the circulatory, respiratory, digestive, nervous, excretory ones) proper posture, hygienic habits and habits of exercise and physical skills which enable the individual to control the body in various activities, especially "life-preservation" activities, as swimming, running, jumping. Skill in these makes for economy of effort in manipulation and locomotion in general.

The Justification of an Educational Programme is its Relation to life Purposes.

BY

F. WEBER, ESQUIRE, M. A., B. P. E.,

Director of Physical Education for Colleges, H. E. H. the Nizam's Dominions.

Educational Philosophy.

The purposes of an educational programme should be to prepare the individual to live a more enjoyable and useful life to himself and to society. If any programme does not agree with these purposes that programme has no justification for its existence. Educators generally accept the position that public education should develop character to the end that individuals and groups will achieve one or more of the following conditions viz. greater *happiness*, more and deeper *satisfactions*, more and better *service* or, more *progress*.

We owe to modern educational philosophers the discovery that "process" rather than "consequence" is the fundamental thing in learning. That is, it is from the doing itself that we learn rather than from the consequence of the doing. The learning comes while the act is being performed whether the act is of a physical, mental or social kind. Thus *activity* is the true means by which learning comes and therefore should be sought as the medium of education.

Activity leading to further activity or more advanced activity is growth. The idea of activity provides a useful standard of ethical conduct. The best activity leads both the individual and society to further activity of an improved kind. "Any activity is good which leads to more activity, while any behaviour is bad which brings a cessation of

THE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS.

REGISTERED ASAFIA NO. 47.

VOL. V APRIL—JUNE, 1931. No. 4.

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan Esq., M. A.,
Director of Public Instruction.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

S. ALI AKBAR, M. A. (Canta
SYED ZAHUR ALI, B. A., B.
F. WEBER, M. A., B. P. E.

SECUNDERABAD-DECCAN.
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1931.

Annual Subscription Rs. 3.